افکار
44
SAEED

مال اور جان کی
سلامتی
حفاظت
اطمینان
نہایت ضروری ہے
سینٹرل
انشورنس کمپنی لمیٹڈ
سینٹرل لائف
ایشورنس کمپنی لمیٹڈ
ہیڈ آفس
نیشنل اینڈ گرنیڈ لیز بنک بلڈنگ میکلوڈ روڈ کراچی
اور شاخیں پاکستان میں ہر جگہ
یکے از داؤد گروپ انٹرپرائز

ا
ب
ت

لپٹن
کے معنی
عمدہ چائے

میرے
خوابوں
کی
سرزمین مشرقی پاکستان
صہبا لکھنوی

افکار

united

منظور شدہ محکمۂ تعلیمات کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ

جاری شدہ: ۱۹۴۵ء ★ ٹیلی فون: ۷۳۹۹۳

نئی تخلیق نمبر

سال: ۲۰ ○ شمارہ: ۱۵۹-۱۶۰

ادارہ

صہبا لکھنوی

کشش صدیقی

زرِ سالانہ	بیرونی ملکوں سے		قیمت
۱۲ روپے	۴۰ شلنگ	۱۰ ڈالر	دو روپے

مکتبۂ افکار

رابسن روڈ کراچی

لندن آفس

۱۸- ایکل روڈ- لندن- این- ڈبلیو-۶- انگلینڈ

ایک ناولٹ

۱۴ - غزل

۵ - شخصیات

(خاکے۔ جائزہ۔ خودنوشت)

۴ - دیس دیس کا ادب

محفل

نومبر، دسمبر ۱۹۶۴ء

مدیر و ناشر: صہبا لکھنوی ٥ مشہور آفسٹ لیتھو پریس، کراچی ٥ دفتر: بسین روڈ، کراچی

اشاریہ

گذشتہ دنوں ہمارے ملک میں پہلی بار عام انتخابات ہوئے ، اور زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق افراد نے ان میں عملاً حصہ لیا چنانچہ ادارہ افکار کے ناظم کتابت و اشاعت منیر احمد بھی انتخاب کی لپیٹ میں آگئے۔ وہ دو ہفتہ سے زائد اس میں مصروف رہے ، اور جب اس مرحلے سے فرصت پاکر دفتر آئے تو افکار کی تواریخ اشاعت گذر چکی تھیں۔ چنانچہ فی الفور ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ نومبر کے شمارے کو تاخیر سے شائع کرنے کی بجائے افکار دوستوں ، رفیقوں اور ہمدردوں کو نومبر اور دسمبر ۷۰ء کی مشترکہ اشاعت "نئی تخلیق نمبر" کی صورت میں پیش کرکے جبری اور ناگزیر تاخیر کی تلافی کردیں۔

سو یہ ہے "نئی تخلیق نمبر" کی شانِ نزول !

اسے ہم نے بغیر اعلان کے اور کم سے کم وقت میں مرتب کیا ہے اور آپ دیکھیں گے کہ اتنے کم وقت میں ہم نے جو تخلیقات فراہم کی ہیں وہ کسی بھی باقاعدہ اعلان کردہ نمبر سے کسی طرح کم نہیں بلکہ کچھ امتیازی شان ہی رکھتی ہیں۔

ہمیں نہیں علم کہ افکار سے پہلے کسی معاصر نے "نئی تخلیق نمبر" کے عنوان سے کوئی خاص اشاعت کبھی پیش کی ہو۔ بہرحال اس میں تمام تر تازہ و غیر مطبوعہ مضامین نظم و نثر کے علاوہ شخصیات پر جو چند مضامین انٹرویو اور خود نوشت حالات کی صورت میں ہم پیش کر رہے ہیں وہ یقین ہے کہ اپنی منفرد خصوصیات کی بنا پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جائیں۔

اور یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہو سکا کہ افکار کے دیرینہ اور نئے لکھنے والوں نے ہمیشہ کی طرح اس نمبر کے لئے بھی اپنی تخلیقات سے نوازا جس کے لئے ہم اُن کے شکر گذار ہیں۔
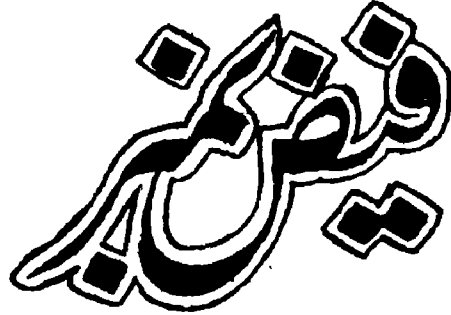
کوثر انصاری

رفتارِ علم

(اداروں کی تعلیمی خبریں اور تبصرے)

طلبا علم حاصل کر کے انسانی خدمت کو اپنا مطمعِ نظر بنائیں (ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی)

تعلیم کا بنیادی مقصد شخصیت کی تعمیر ہے (پروفیسر ممتاز حسین)

ہماری کوشش ہے کہ طلبا انگلی پکڑ کر کھڑے ہونے کے بجائے اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں (فیض احمد فیض)

عبد اللہ ہارون کالج یونین کی افتتاحی تقریب

کراچی پچھلے ہفتہ عبد اللہ ہارون کالج یونین کا افتتاح پاکستان کے مایۂ ناز سائنس داں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی نے فرمایا۔ اس کالج کی ترقی کے لئے جو گذشتہ سال ہی ملک کے شہرۂ آفاق شاعر فیض احمد فیض کی سرپرستی اور نگرانی میں کھدّہ جیسے پس ماندہ علاقے میں قائم ہوا ہے، خلوص اور لگن کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے تقریب کا آغاز تلاوت قرآن مجید سے ہوا۔ یونین کے عہدے داروں کے تعارف کے بعد فیض صاحب نے کہا کہ ابھی اس کالج کو ایک سال ہی ہوا ہے۔ اس لئے کارگذاریوں کی ابھی کیا تفصیلات عرض کریں۔ ہاں ہم نے اس بات کا ضرور تجربہ کیا ہے کہ طلبا میں علم کے حصول کی لگن اور خود اعتمادی پیدا ہو وہ ہر کام انگلی پکڑ کر نہ کریں۔

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی نے مختصر لیکن نہایت جامع اور دلچسپ تقریر فرمائی اور طلبا کو مشورہ دیا کہ وہ علم حاصل کر کے انسانیت کی خدمت کو اپنا مطمعِ نظر بنائیں۔

اس اجلاس کے بعد انجمن اساتذہ کی طرف سے "عوامی تعلیم کے مسائل" پر مذاکرہ ہوا۔ پروفیسر ممتاز حسین نے نہایت عالمانہ تقریر فرمائی۔ اور کہا کہ تعلیم کا بنیادی مقصد شخصیت کی تعمیر ہے۔ اس کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے "تعلیم اور تہذیبِ عوام" پر سیر حاصل روشنی ڈالی۔ اور علم کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے اور پھیلانے پر زور دیا۔

شام کو ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم خلیل کی صدارت میں شمس العلماء ڈاکٹر عمر بن داؤد پوتہ کی چھٹی برسی منائی گئی۔ شب میں "عوامی محفل" کے عنوان سے پاکستان کی تمام زبانوں کے گیت اور رقص پیش کئے گئے۔ یہ سارے پروگرام طلبا ہی نے ترتیب دیئے تھے، اور بے حد کامیاب رہے۔

ہاجرہ مسرور کی دستخط شدہ چار ہزار کی مالیت کی کتابیں تین گھنٹے میں فروخت ہوگئیں

گلڈ انجمن کتاب گھر پر معزز خریداروں کا ہجوم

اچھی اور معیاری کتابوں کی فروخت کے سلسلے میں گلڈ انجمن کتاب گھر کا کامیاب تجربہ

کراچی۔ پچھلے دنوں گلڈ انجمن کتاب گھر واقع صدر کے زیر اہتمام ملک کی مشہور افسانہ نگار خاتون ہاجرہ مسرور کی دستخط شدہ کتابیں فروخت کی گئیں۔ ہاجرہ مسرور بہ نفس نفیس کتاب گھر میں موجود تھیں۔ تین گھنٹے کے مختصر سے عرصے میں چار ہزار روپے کی کتابیں فروخت ہوگئیں، خریداروں میں مشہور ادیب، شاعر، اہل علم طلبا و طالبات، سفارتی نمائندے اور معززین شہر شامل تھے۔ اچھی اور معیاری کتابوں کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کے لئے اس کتاب گھر نے مشہور و ممتاز مصنفین کی دستخط شدہ کتابوں کی فروخت کا تجربہ کیا ہے جو توقعات سے زیادہ کامیاب ہوا ہے۔ ہاجرہ مسرور سے قبل فیض احمد فیض اور نیاز فتح پوری کی دستخط شدہ کتابیں کافی تعداد میں فروخت ہو چکی ہیں۔ ہاجرہ مسرور کے پانچ مجموعے تیسری منزل، اندھیرے اُجالے، ہائے اللہ وہ لوگ اور چوری چھپے فروخت کے لئے کتاب گھر میں موجود تھیں۔ اطلاعات کے بموجب دسمبر کے پہلے ہفتے میں مشہور افسانہ نگار پروفیسر احمد علی کی دستخط شدہ کتابیں فروخت ہوں گی۔

غالب کا جعلی کلام

لکھنؤ۔ اطلاع ملی ہے کہ غالب پر حضرت نادم سیتاپوری کی ایک تحقیقی کتاب جلد شائع ہو رہی ہے۔ کتاب کا نام "غالب کے کلام میں الحاقی عناصر" ہے۔ نادم صاحب نے بڑی تلاش و تحقیق کے بعد غالب کا وہ تمام کلام جمع کیا ہے جو غالب سے منسوب کیا جاتا ہے مگر دراصل غالب کا نہیں۔ غالبیات کے سلسلے میں یہ کتاب یقیناً ایک اہم اضافہ ثابت ہوگی۔

○ نیویارک۔ مشہور روسی شاعر ورجل کا ۲۰۳ واں جشن پیدائش ایلی نوائس کلاسیکی کانفرنس کے زیر اہتمام شکاگو یونیورسٹی میں منایا گیا۔ جس میں اس کی شاعری اور شخصیت پر روشنی ڈالی گئی اور طلباء نے ورجل کے گیت گائے۔

سارتر نے نوبل پرائز لینے سے انکار کر دیا

پیرس۔ فرانس کے شہرۂ آفاق ڈرامہ نگار، ناول نویس فلسفی ژاں پال سارتر نے ادب کا نوبل پرائز لینے سے انکار کر دیا۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا ادبی اعزاز ہے۔ اِس سے قبل روسی ادیب بورس پیسترناک نے بھی نوبل پرائز لینے سے انکار کر دیا تھا۔ سارتر نے جو پہلے ادب برائے ادب کے قائل تھے لیکن رفتہ رفتہ ان کا نظریہ تبدیل گیا اور بالآخر انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ اب ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ الجزائر کی آزادی کے سلسلے میں سارتر کے جرأت مندانہ اعلان کو شاید ہی کوئی فراموش کر سکے۔ ان کی تحریروں نے نئی نسل کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے

مختصر مگر اہم

○ کراچی۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے قائم مقام سکریٹری جنرل جمیل الدین عالی نے اعلان کیا ہے کہ گلڈ کی چھٹی سالگرہ پورے تزک و احتشام سے ۳۱ جنوری ۱۹۶۵ء کو منائی جائے گی اس تقریب میں آدم جی، داؤد، اور نیشنل بنک آف پاکستان کی طرف سے دیئے جانے والے انعامات کا اعلان بھی کیا جائے گا۔

○ بزم ادب، لاڑکانہ نے اپنے امدادی فنڈ سے جس کے کنوینر محمد صوفی، سازھیب کالج کے طلبا کو متعدد وظائف دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ بی اے یو بی کام اور ایف ایس سی کے چار طلبا کو ۲۱-۸ اور ۱۹-۱۹ روپے کے چار وظائف دے کر بزم ادب نے ایک مثالی قدم اٹھایا ہے۔

○ کراچی۔ دسمبر کے وسط میں پاکستان رائٹرز گلڈ کی شاخ کراچی کے انتخابات منعقد ہو رہے ہیں۔ انتخابات اور ووٹنگ میں صرف وہی حضرات حصہ لے سکیں گے جنہوں نے دستور کے تحت اپنے واجبات ادا کر دیئے ہیں۔ اطلاعات کے بموجب تین سو کے قریب ادیب و شاعر چندہ ادا کرنے کی بنا پر اپنے ووٹ کا حق استعمال نہیں کر سکیں گے چندہ ادا نہ کرنے والوں میں کئی مشہور و ممتاز ادیب و شاعر شامل ہیں۔

○ کراچی۔ حکومت نے ملک میں فحش ادب پر پابندی کو موثر بنانے کے لئے یہاں ایک دارہ قائم کیا ہے جو اخلاق سوز مطبوعات پر نظر رکھنے کے علاوہ اخبارات کی خبروں پر بھی نگرانی رکھے گا، تاکہ ایسا مواد شائع نہ ہو جس سے نوجوانوں کے اخلاق پر اثر پڑے یا جو ہیجان خیز ہو۔

○ لاہور۔ ہمدرد ٹرسٹ کے زیر اہتمام پچھلے دنوں یہاں معروف ادیب اور ڈراما نگار حکیم احمد شجاع کے ساتھ ایک شام منائی گئی۔ آپ نے "لاہور کی قدیم علمی و ادبی مجلسیں" کے عنوان پر تقریر فرمائی اور بتایا کہ مغلیہ دور حکومت میں سرکاری سرپرستی کے باعث علم و ادب نے کتنی ترقی کی۔ آپ نے عمائدین حکومت اور رؤسا پر زور دیا کہ وہ بھی شعر و ادب کی حوصلہ افزائی اور ادیبوں اور شاعروں کی خدمات کا اعتراف کریں۔ اس سے قبل حکیم محمد سعید دہلوی نے حکیم صاحب کا تعارف کرایا۔ آخر میں مسٹر ایس اے رحمٰن کے شکریے کے ساتھ یہ پرلطف تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

○ ڈھاکہ۔ بنگلہ اکیڈیمی کے زیر اہتمام ڈراما اور تھیٹر پر پانچ روزہ مجلس مذاکرہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ مذاکرہ میں گیارہ مقالے پڑھے گئے۔ اور ڈراما اور تھیٹر کی ترقی کے لئے غور و فکر کیا گیا۔ ڈھاکہ میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا مذاکرہ تھا۔

تین ادیبوں کی شادی خانہ آبادی

کراچی۔ پچھلے دنوں تین ممتاز ادیبوں اور شاعروں امین الرحمٰن اور شبنم رومانی کی شادی لاہور میں، اور افکار کے مستقل معاون اعجاز افتخار حسین کی شادی کراچی میں منعقد ہوئی۔

ادارۂ افکار کی دعا ہے کہ خدا انہیں ازدواجی زندگی کی تمام تر مسرتوں اور کامیابیوں سے ہمکنار کرے۔ (آمین)

بین الاقوامی مقابلۂ مضامین میں پاکستان کا اعزاز

ٹوکیو۔ بین الاقوامی مضمون نگاروں کے کلب کے زیر اہتمام بین الاقوامی مقابلۂ مضامین میں پاکستان کے منیر حق نے دوسرا انعام حاصل کیا ہے۔ اس مقابلے کا موضوع "آئندہ ۲۰ سال" تھا۔

○ طلبہ و طالبات کی ضرورت اور سہولت کے پیش نظر کراچی یونیورسٹی کے زیر اہتمام دس ہزار روپے کی لاگت سے یونیورسٹی کیمپس میں کتابوں کی ایک دکان کا قیام عمل میں آیا ہے۔ یہ دکان یونیورسٹی لائبریری کی عمارت کے نچلے حصے میں واقع ہے۔ اور یہاں کتابوں کے علاوہ اسٹیشنری کا دوسرا سامان بھی عام نرخ سے دس فی صد رعائت پر ملے گا۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی نے ایک "کتب بینک" بھی قائم کیا ہے جو طلبا کو طویل المیعاد قرضے کی بنیاد پر کتابیں فراہم کرے گا۔

○ حیدرآباد۔ سندھ یونیورسٹی نے موجودہ تعلیمی سال سے یونیورسٹی میں بنگلہ زبان کی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ اس فیصلے کو مغربی پاکستان کے اہل علم حضرات نے کافی سراہا ہے۔ سندھ یونیورسٹی کے رجسٹرار نے تمام متعلقہ تعلیمی اداروں سے کہا ہے کہ وہ بنگلہ زبان کی تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند حضرات کی فہرست یونیورسٹی کو بھیج دیں۔

○ کوئٹہ۔ گذشتہ دنوں یہاں پشتو کے مشہور شاعر علامہ عبدالعلی کی ۹۴ ویں برسی منائی گئی۔ جس میں کمشنر کوئٹہ ڈویژن نے تقریر کرتے ہوئے علامہ مرحوم کی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ جلسے میں آپ کا پشتو اور فارسی کلام بھی پیش کیا گیا۔ تقریب کی صدارت پشتو کے مشہور شاعر سمندر خاں سمندر نے کی۔

○ کراچی۔ خان بہادر نقی محمد خاں خورجوی کی صدارت میں پچھلے دنوں یہاں "بزم ظرافت" کا قیام عمل میں آیا۔ بزم کے صدر استاد شوکت تھانوی نائب صدر مولانا ماہر القادری اور سکریٹری ناصر کاسگنجوی منتخب ہوئے۔ بزم کے مقاصد میں نئی نسل میں طنز و مزاح کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔

○ نیویارک۔ مشیگن کی ایک پبلک لائبریری میں کتابوں کو چوری سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک انوکھا اور سو فی صد یقینی انتظام کیا گیا ہے یہاں کتابوں کے ساتھ ایسے آلات لگائے گئے ہیں جن کا تعلق خطرے کی گھنٹیوں سے ہے اور ہر کتاب میں ایک مقناطیسی پٹی لگی ہوئی ہے۔ جب بھی کوئی شخص الماری سے کتاب نکالتا ہے، خطرے کی گھنٹی بجنے لگتی ہے منتظمین کا کہنا ہے کہ اس انتظام کے بعد کتابوں کی چوری کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔

نسخ رسم الخط رائج کرنے کے لئے کمیٹی کا قیام

لاہور۔ گورنر مغربی پاکستان نے نستعلیق کے بجائے نسخ رسم الخط اختیار کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی ہے جو ذرائع اور تدابیر کے سلسلے میں اپنی سفارشات پیش کرے گی۔ سپریم کورٹ کے جج جسٹس ایس اے رحمٰن اس کمیٹی کے صدر رہیں۔

"میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں مگر اردو کو نہیں" مشہور شاعر آنند نرائن مُلّا کا بیان

اردو کو مٹانا قتل سے زیادہ بھیانک جرم ہے

جے پور۔ پچھلے دنوں انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام یہاں کل ہند اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ اردو کو یوپی، بہار، بی اور مشرقی پنجاب کی سرکاری زبان قرار دیا جائے۔ ریٹائرڈ جج الہ آباد ہائی کورٹ آنند نرائن مُلّا نے اس کانفرنس کی صدارت کی۔ ایک قرارداد میں افسوس ظاہر کیا گیا کہ انجمن ترقی اردو نے ایک میمورنڈم اردو کے مرتبے کے متعلق بھارتی صدر کو پیش کیا تھا، مگر اس پر کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ کانفرنس کے صدر آنند نرائن مُلّا نے کہا کہ کسی زبان کی ترقی کا راستہ روکنا کسی شخص کے ارتکاب قتل سے زیادہ بھیانک جرم ہے۔

صدر کانفرنس نے ان لوگوں پر نکتہ چینی کی جو تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اور اس فکر میں ہیں کہ اردو کو محض مسلمانوں کی زبان قرار دے دیا جائے۔ مُلّا صاحب نے مزید کہا کہ میں اردو کی خدمت کو اپنا ایمان سمجھتا ہوں۔ میں مذہب تو چھوڑ سکتا ہوں مگر اردو کو نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ نے کہا کہ اس رجحان کو فوراً ختم کیا جائے، ورنہ قومی وحدت کے لئے تمام کوششیں ناکام ہوجائیں گی اور وہ دن آجائے گا جب یہ لوگ تاج محل کو بھارت میں غیر ملکیوں کی طرف سے بنایا ہوا یادگار قرار دیں گے۔ اور بھارت سے مٹا دینے کا مطالبہ کریں گے۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ جواہر لال نہرو کے مر جانے سے اردو کا محافظ اٹھ گیا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اب اردو کو سنگین مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

کتاب میلہ کو دو لاکھ سے زائد افراد نے دیکھا

کراچی۔ پچھلے دنوں کراچی، لاہور اور ڈھاکہ میں پاکستان کا پہلا قومی کتاب میلہ نیشنل بک سینٹر کے زیر اہتمام منعقد ہوا۔ اعداد و شمار کے مطابق اس میلہ کو دو لاکھ سے زائد افراد نے دیکھا۔ خواتین اور طلباء کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ تمام موضوعات سے متعلق کتابیں اہتمام کے ساتھ ترتیب دی گئی تھیں۔ اختتامی اجلاس میں کتاب میلہ کے مقررہ عنوانات پر بہترین مضامین پر طلبا و طالبات کو انعامات دیئے گئے۔ کراچی میں ڈاکٹر ایس ایم شریف کی صدارت میں اختتامی تقریب منعقد ہوئی جس میں کراچی کے نمائندہ ادیبوں، شاعروں، ناشروں اور کتب فروشوں نے شرکت کی۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور ابن انشا اس کامیاب قومی میلہ کے لئے قابل مبارکباد ہیں۔ توقع ہے کہ یہ میلہ ہر سال منعقد ہوگا۔ قومی پریس نے بھی میلہ کو کامیاب بنانے کے سلسلہ میں نمایاں حصہ لیا۔

پشاور سے ماہنامہ ارژنگ کا اجراء

پشاور۔ گذشتہ دنوں اردو اور پشتو کے ایک معیاری ماہنامہ "ارژنگ" کا یہاں اجراء عمل میں آیا ہے۔ ادارت کے فرائض نامور شاعر تاج سعید کے سپرد ہیں۔ یہ ماہنامہ اردو اور پشتو زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کا علمبردار ہے۔ توقع ہے کہ تاج سعید کی ادارت میں "ارژنگ" روز افزوں ترقی کرے گا۔

چند یادیں چند آنسو

کراچی۔ پچھلے دنوں پھر کئی مشہور و مستند ادبی شخصیتیں ہم سے جدا ہوگئیں۔ شاید ہی کوئی مہینہ ایسا جاتا ہو کہ کسی نہ کسی ادیب یا شاعر کا ماتم نہ کرنا پڑے یا کسی نہ کسی ممتاز شخصیت کی یاد میں تقریبات منعقد نہ ہوں۔

○ حیدرآباد دکن سے اطلاع ملی کہ مولوی نصیر الدین ہاشمی کا انتقال ہوگیا۔ وہ جس مرتبے کے محقق تھے ساری اردو دنیا جانتی ہے۔ خدا انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر کی توفیق۔

○ ڈھاکہ سے یہ دردناک خبر آئی ہے کہ مشرقی پاکستان کے مایۂ ناز شاعر کوی غلام مصطفیٰ داغ مفارقت دے گئے۔ ابھی پچھلے دنوں وہ گلڈ کی تقریب میں کراچی آئے تھے اور یہ گمان بھی نہ تھا کہ یہ ان کا آخری سفر ہے۔ انہوں نے بنگلہ شعر و ادب کی گراں مایہ خدمات انجام دی ہیں۔

○ دہلی سے اطلاع ملی ہے کہ مشہور شاعر سلام مچھلی شہری کے والد محترم جناب عبدالرزاق صاحب کا ۳۰ اکتوبر کو انتقال ہوگیا۔ اس صدمۂ جانکاہ میں ادارۂ افکار سلام مچھلی شہری کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

○ کراچی میں مشہور و مستند شاعر عبدالحمید حیرت شملوی کی وفات ہوگئی۔ وہ گذشتہ ۱۲ سال سے فالج میں مبتلا تھے اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

○ میراجی اور حسن کیانی کی یاد میں، راولپنڈی اور پشاور میں تقریبات منعقد ہوئیں اور ان کی زندگی اور فن پر سوگواروں نے اظہار خیال کیا۔ ان تقریبات میں مقامی ادیبوں اور مصنفوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

افکار کے سب سے پہلے علمی دوست خریدار
سیّد مسیح الدین کی رحلت

کراچی۔ افکار کا اجراء ۱۹۴۵ء میں عمل میں آیا تھا، اور بھوپال بنک کے منیجر سید مسیح الدین صاحب اس کے سب سے پہلے خریدار بنے تھے۔ اس رفاقت کا سلسلہ بھوپال سے کراچی تک قائم رہا۔ کراچی میں بنکنگ کے سلسلے میں مسیح الدین صاحب نے اعلیٰ ترین عہدوں پر رہ کر جو گراں مایہ خدمات انجام دیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہر ماہ وہ بے چینی سے افکار کا انتظار کرتے تھے اور اکثر دوستوں سے فخریہ کہتے تھے کہ میں افکار کا پہلا خریدار ہوں اور خوشی کی بات یہ ہے کہ افکار نے اپنا معیار کبھی نہیں گرنے دیا بلکہ ہمیشہ اسے آگے بڑھایا۔ افسوس کہ ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو طویل علالت کے بعد ان کا انتقال ہوگیا، اور افکار اپنے پہلے علم دوست سرپرست سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ط سید صاحب مدیر افکار کے عم محترم پروفیسر سید نواب علی مرحوم کے خاص شاگرد اور ڈاکٹر سید محمد یوسف صاحب صدر شعبۂ عربی کراچی یونیورسٹی کے حقیقی ماموں تھے۔ ادارۂ افکار پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

پچھتے چھپتے

کراچی۔ علمی و ادبی حلقوں میں یہ اطلاع افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ مشہور جواں سال ادیب اور ڈرامہ نگار رعش تیموری طویل علالت کے بعد رحلت کر گئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ط وہ طویل عرصے سے کینسر کے جاں لیوا مرض میں مبتلا تھے۔ ادارۂ افکار پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

ادبی مسائل

سارتر کی آپ بیتی

فرانس کے نئے لکھنے والوں میں ژاں پال سارتر کی شخصیت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ انہوں نے نہ صرف فرانس کے ادب کو ایک انقلابی رنگ و آہنگ سے آشنا کیا ہے بلکہ بعض دوسرے ممالک کی ادبیات پر گہرے اثرات بھی چھوڑ رہے ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ ناول نگار، ایک اعلیٰ درجہ کے نقاد اور منفرد انشاپرداز ہیں۔ ان کے قلم سے نکلی ہوئی ہر بات فکر میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ فکری پہلو اور فلسفیانہ آہنگ ان کی ادبی تخلیقات کی نمایاں ترین خصوصیات ہیں۔ پہلو دار بات کرنے میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کے ہر فقرے اور ہر جملے میں کوئی نہ کوئی رمز ضرور ہوتا ہے۔ اور ان کے الفاظ تہ داری کی کیفیت سے بھرپور ضرور نظر آتے ہیں۔ اسی لئے ان کی ادبی تحریروں میں مجموعی طور پر گہری معنویت کا احساس ہوتا ہے۔ اور وہ پڑھنے والوں کے لئے غور و فکر کا بڑا سامان فراہم کرتی ہے۔

سارتر ۱۹۰۵ء میں فرانس کے ایک بورژوا خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت کے فوراً ہی بعد ان کے والد کا انتقال ہو گیا، ان کی ماں نے ان کی پرورش کی، اور انہوں نے اپنی ماں کے خاندان والوں کے زیر سایہ ہوش سنبھالا۔ بچپن میں ان کے نانا کی شخصیت نے ان پر گہرے اثرات چھوڑے۔ سارتر کے نانا جرمن زبان کے استاد تھے اور اگرچہ ان کی ذہنی نشوونما عیسائیوں کے ماحول میں ہوئی تھی لیکن عیسائیت کا ان پر برائے نام بھی اثر نہیں تھا۔ مذہب کے معاملے میں وہ بڑے آزاد خیال تھے۔ اور زندگی کے ہر پہلو کو عقلی زاویۂ نظر سے دیکھنا ان کے مزاج میں داخل تھا۔ سارتر کے شعور نے آنکھ کھولی تو اپنے آس پاس کے رشتہ داروں کے ماحول میں اس آزادی اور آزاد خیالی کی فضا کو دیکھا بچپن کے دن انہوں نے پیرس اور اس کے مضافات میں گذارے۔ اور اس طرح انہیں وہاں کے ادبی، ثقافتی اور فکری ماحول کو دیکھنے اور اس کے اثرات قبول کرنے کا خاص موقع ملا۔ اسی ماحول میں ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا، اور انہوں نے اعلیٰ درجے کے ناول، ڈرامے، فلسفیانہ مضامین اور تنقیدی مقالات لکھے۔ آج بھی وہ پیرس میں ہیں اور ان کے قلم کا تخلیقی جوہر ابھی تک اپنی آب و تاب سے گل و گلزار کھلا رہا ہے۔

حال ہی میں انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح حیات کا وہ حصہ لکھا ہے جو ان کے بچپن کے حالات اور معاملات و مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ کتاب انگریزی میں "WORDS" یعنی "الفاظ" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس کا ترجمہ IRENE CLEPHANE نے کیا ہے اور انگلستان کے مشہور ناشر HAMISH HAMILTON نے اس کو شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں سارتر کا موضوع ان

سے بچپن کا زمانہ ہے۔ لیکن انہوں نے اپنے بچپن کے اس زمانے کی تفصیل کو جذباتی انداز میں پیش نہیں کیا ہے۔ حالانکہ بچپن کے حالات اور جذباتی انداز کا کچھ ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ غالباً ادب کی تاریخ میں کوئی سوانح حیات ایسی نہیں لکھی گئی ہوگی جس میں بچپن کے حالات و واقعات کی تفصیل کو جذباتی انداز میں پیش نہ کیا گیا ہو۔ خصوصاً خود نوشت سوانح حیات میں تو بچپن کے حالات کو جذباتی آہنگ کے ساتھ پیش کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ بچپن کی زندگی اور اس کی باتیں ظاہر ہے لکھنے والے کو عزیز ہوتی ہیں۔ اور وہ اس زمانے کی برائیوں کو بھی جذباتی زاویۂ نظر سے دیکھ کر سراہنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ سارتر نے اپنی اس کتاب میں ایسا نہیں کیا ہے۔ انہوں نے تو اپنے بچپن کے زمانے کی خاصی بھیانک تصویر کھینچی ہے۔ اس تصویر سے یہ بات ٹپکتی ہے کہ سارتر اس ماحول سے خوش نہیں رہتے جس میں ان کا لڑکپن گذرا۔ اس لئے نہیں کہ ان کے پیدا ہوتے ہی ان کے والد کا انتقال ہو گیا؛ اور انہیں ایک دوسرے ماحول میں ناسازگار حالات کے درمیان بچپن کے دن گذارنے پڑے بلکہ اس لئے کہ وہ اس بورژوا ماحول ہی سے ذہنی مناسبت نہیں رکھتے جس میں عام طور پر ہر بچے کو اپنا بچپن گذارنا پڑتا ہے چنانچہ اپنی اس کتاب میں انہوں نے صاف صاف اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس ماحول میں ماں باپ عزیز اور دوستوں کے رشتے بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں! اور اس کا نتیجہ بچے کی شخصیت اور اس کی نشو و نما پر کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اس کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے جیسے وہ زندگی کے راستے پر آگے بڑھتا ہے اس کی شخصیت کے ہر پہلو میں ایک عجیب طرح کی کمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اپنے بارے میں یہ لکھا ہے کہ اچھا ہوا میرا باپ میرے پیدا ہوتے ہی مر گیا۔ اور مجھے ان حالات سے دوچار ہونے کا موقع نہیں ملا جن سے عام طور پر اپنے باپ کے زندہ رہنے کی وجہ سے بچوں کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اگر میرا باپ زندہ رہتا تو میری شخصیت کو نہ جانے کیسی کیسی ٹھوکریں کھانی پڑتیں، اور خدا جانے وہ کس کس طرح پامال ہوتی۔

سارتر کی کتاب انہیں خیالات کی تفصیل و جزئیات کی ایک نہایت دل کش و دل آویز داستان ہے۔ اور یہ دل کشی اور دل آویزی اس میں زندگی کے گہرے شعور سماجی نظام کی اقدار کی ناہمواری کے صحیح احساس اور ادبی اقدار کے متناسب اظہار و ابلاغ نے پیدا کی ہے ورنہ یوں دیکھا جائے تو اس داستان کی تہہ میں اداسی اور غم انگیزی کے دریا موجزن نظر آتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ اداسی اور غم انگیزی انسان اور انسانیت کے بنیادی معاملات سے تعلق رکھتی ہے اس لئے پڑھنے والا نہ صرف اس سے مطابقت پیدا کرتا ہے بلکہ اس کو یہ اپنی ہی اداسی اور غم انگیزی سمجھتا ہے۔ لیکن اس غم کے ساتھ ساتھ اس میں بڑی زندگی اور جولانی کا احساس ہوتا ہے۔ اور جگہ جگہ آزادہ خیالی جدت مندی اور بے باکی کی کچھ ایسی بجلیاں سی کوندتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں جن سے اس حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے کہ اس کا لکھنے والا انسانی زندگی سے کتنی محبت کرتا ہے اور اس کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کا کس درجہ آرزو مند ہے! ([illegible] سے)

آغا افتخار حسین

دریچے سے

وکٹر اوگو کی محبوبہ کے خطوط

وکٹر اوگو؎ کے نام سے قارئین اچھی طرح واقف ہیں۔ کیونکہ اس کے مشہور ناولوں کا انگریزی ترجمہ ہو چکا ہے اوگو کی ناول لے مزیرابل (مصیبت زدہ) دنیا کے بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ وکٹر اوگو ایک رنگا رنگ شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے صرف ناول ہی نہیں لکھے۔ ڈرامے بھی لکھے ہیں اور تحقیقی مضامین بھی۔ نظمیں بھی کہی ہیں اور افسانے بھی لکھے ہیں۔ وہ آرٹسٹ بھی تھا اور ایک عرصے تک اس نے عملی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ سب سے زیادہ پر لطف بات یہ کہ اس کا دل و دماغ مغربی انداز فکر سے ہی نہیں مشرقی ادب اور فلسفے سے بھی متاثر تھا۔ چنانچہ اس نے گوئٹے کے مشرقی دیوان کی طرح ایک بیاض مشرق لے زوغیاتاں (LES ORIENTALES) بھی لکھی ہے جس میں اس نے مشرقی موضوعات پر نظمیں کہی ہیں اور اس بات پر فخر کا اظہار کیا ہے کہ یہ نظمیں لکھنے میں وہ سعدی۔ حافظ۔ رومی۔ ابونواس۔ متنبی وغیرہ سے متاثر ہوا۔ میرا خیال ہے کہ وکٹر اوگو کی شخصیت کے اس پہلو سے برصغیر کے ادب کے طالب علم زیادہ واقف نہیں۔ افکار کی آئندہ اشاعتوں میں انشاء اللہ وکٹر اوگو کی بیاض مشرق کے بارے میں ضرور لکھوں گا۔ آج کی صحبت میں اس کی محبوبہ ژولیت درو ے کے خطوط کے بارے میں کچھ عرض کرتا ہوں۔

ژولیت درو ے (JULIETTE DROUET) ایک ایکٹرس تھی۔ وکٹر اوگو سے اس کی محبت کی ابتدا اس وقت ہوئی جب اس نے اوگو کے ڈرامے لکریس بورشیا میں شہزادی نگروینی کا پارٹ کیا۔ اس ڈرامے میں ژولیت کا رول بہت کامیاب رہا۔ مصنف نے ایکٹرس کی تعریف کی اور ایکٹرس مصنف پر ہزار جان سے اس طرح فدا ہوئی کہ کچھ ہی عرصہ بعد اس نے ایکٹرس کی شہرت اور عیش کی زندگی کو ترک کر دیا اور

؎ VICTOR HUGO (وکٹر اوگو) کو ہم اردو میں؟ وکٹر ہیوگو لکھا جاتا ہے۔ یہ تلفظ انگریزی تلفظ کی نقل ہے جو صحیح نہیں (H) کا تلفظ فرانسیسی زبان میں ہمیشہ ساکت ہوتا ہے (ت) کبھی نہیں ہوتا۔ اور (U) کی آواز الف کی ہوتی ہے۔ (ہ) کی نہیں ہوتی۔ فرانسیسی زبان میں (U) کی آواز ایک خاص قسم کی ہوتی ہے۔ جو جرمن زبان میں تو ہے لیکن انگریزی اطالوی۔ ہسپانوی اور دیگر لاطینی زبانوں میں نہیں ہے۔ فرانسیسی اور جرمن زبان میں (U) کی آواز نکالنے کی آسان صورت یہ ہے کہ ہونٹوں کو گول بنا کر (ی) کو ایسے کے انداز میں (ی) کی آواز نکالی جائے۔ اس طرح جو آواز نکلے گی اس کیلئے اردو میں بہتر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ پیرس میں ڈاکٹر حمید اللہ فرانسیسی زبان کو اردو رسم الخط میں لکھنے کے موضوع پر کام کر رہے ہیں ان سے جب میری گفتگو ہوئی تو انھوں نے (U) کیلئے "ؤ" کو بہتر سمجھا۔ اس طرح VICTOR HUGO کا صحیح تلفظ وکٹر اوگو ہے نہ کہ وکٹر ہیوگو

ایک معمولی سے مکان میں رہتی تھی۔ اب ان کے سامنے ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ وہ وکتراوگو کے قریب رہے۔ عرصے تک یہی صورت رہی وکتراوگو ڈرامے اور ناول بھی لکھیں۔ ژولیت اسے خط لکھتی رہی۔ یہ خط سینکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ کبھی کبھی ژولیت ایک دن میں تین تین چار چار خط لکھتی تھی۔ ان میں سے چند خطوط پیرس کے مشہور ادبی رسالہ ریووے دو موند (REVUE des deux mondes یعنی دو عالم کا مجلہ) کی جلد ۱۵ (دسمبر ۱۹۱۲ء) میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے پہلے دو خطوط کے اقتباسات یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

یہ ۱۸۳۳ء ہے۔ ژولیت اور وکتراوگو کے معاشقے کو شروع ہوئے پانچ سال گزر چکے ہیں۔ ان کی محبت طوفانی دور ختم کر چکی ہے۔ ژولیت کی عمر تیس سال ہے۔ وہ عرصہ ہوا تھیٹر کی پر تعیش زندگی چھوڑ چکی ہے اور پیرس کے ایک محلے سیت انستاس میں ایک معمولی سے مکان میں رہتی ہے۔ وکتراوگو کئی ڈرامے لکھ چکا ہے۔ اسے پیرس کے ایک بڑے تھیٹر کا ڈائرکٹر دعوت دیتا ہے کہ وہ اسپین کے پس منظر میں ایک ڈرامہ لکھے۔ وکتراوگو کو اسپین اور اس کی تاریخ سے بہت محبت تھی (خصوصاً اسپین میں مسلمانوں کے ثقافتی اثرات سے۔ اس کا ذکر میں بعد کے مضامین میں کرونگا)۔ وکتراوگو نے اس پیشکش کو قبول کیا اور طے کر لیا کہ وہ یہ ڈرامہ لکھے گا اور یہ ڈرامہ اس کا شاہکار ہوگا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وکتراوگو کا یہ ڈرامہ روئی بلاز (　　　) اس کا سب سے اچھا ڈرامہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ ڈرامہ لکھنے کے لئے وکتراوگو نے بہت محنت کی۔ اور صرف اسپین کی تاریخ پر فرانسیسی اور ہسپانوی زبانوں میں چودہ کتابیں لائبریری سے حاصل کیں۔ ژولیت جانتی تھی کہ اب وکتراوگو پھر مصروف ہو جائے گا اور اس سے عرصے تک نہیں ملے گا۔

جس روز اوگو نے یہ ڈرامہ لکھنے کا فیصلہ کیا اسی دن ۱۶ جون ۱۸۳۳ء کو ۱۱ بجے صبح ژولیت نے وکتراوگو کو خط میں لکھا۔

"کیا آج سے میری تنہائی کا زمانہ شروع ہو گیا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے ایک قید تنہائی اس امید پر گذارنی پڑے گی کہ ایک دن تم مجھ سے آن ملو گے"

اسی روز رات کو ساڑھے آٹھ بجے ژولیت نے دوسرا خط لکھا۔

"ایک یا دو ماہ تک تمہیں نہ دیکھنے کا تصور میرے لئے سوہان روح بنا ہوا ہے یوں لگتا ہے جیسے میں سیماب کے ٹکڑے پر گرنے والے قطرے کی طرح جذب ہو کر رہ جاؤں گی۔ اپنے جذبات کو تم سے چھپانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہوں پھر بھی دل نہیں مانتا کیونکہ میں جانتی ہوں کہ جب تم کسی کام میں مصروف ہو جاتے ہو تو تمہاری توجہ میری طرف سے ہٹ جاتی ہے"

اگلے دن جون کو وکتراوگو نے ڈرامہ لکھنا شروع کر دیا۔ اسی روز رات کے ساڑھے سات بجے ژولیت نے وکتراوگو کو لکھا:۔

پیارے! کیا تم نے آج سے اپنا کام باقاعدہ شروع کر دیا؟ میں اس پر ساری دنیا کو مبارکباد دیتی ہوں۔ سوائے اپنے آپ کے مجھے تمہارے شاہکاروں کے مقابلے میں تمہاری بانہوں میں محبت کا ایک لمحہ زیادہ پسند ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں احمق ہوں یا تمہاری عظیم شاعری کی طرف توجہ نہیں دیتی۔ بلکہ یہ کہ تمہارے ایک بوسے میں میں تمہاری تخلیقی قوت اور تمہاری روح کو محسوس کر سکتی ہوں"

"میں نہیں جانتی کہ میں ان ایام غم کو کیسے برداشت کروں گی جو آج سے شروع ہو رہے ہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ میں یہ صبر آزما وقت کاٹنے کے لئے اپنی تمام ہمتیں صرف کر دونگی۔

میں تمہیں کتنا یاد کرتی ہوں! کتنا چاہتی ہوں (کاش میں اس کا اظہار کر سکتی) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے دل سے تمہاری ہر آواز سن سکتی ہوں۔ تم مجھ پر انتہائی ظلم کرو گے اگر تم (کم از کم) مجھے وہ سب کچھ نہ دے دو جس کا تعلق تمہاری (علمی و ادبی) آرزوؤں سے نہیں ہے۔ (یعنی میں تمہاری وہ تمام توجہ چاہتی ہوں جو تمہاری علمی مصروفیتوں سے باقی بچ رہے)

میرے پیارے میرے شوہر میں آج مرجانا چاہتی ہوں تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ میں تمہیں کتنا چاہتی ہوں کیونکہ جب تک میں زندہ ہوں تم یہ کبھی نہ جان سکو گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میری محبت اور تمہاری روح کے درمیان کچھ ایسی رکاوٹیں حائل ہیں جو تمہیں میری محبت کی گہرائیوں تک پہنچنے نہیں دیتیں

ژولیت کے دیگر خطوط کبھی آئندہ پیش کیے جائیں گے۔ آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ بالآخر ژولیت کی وکٹر ہیوگو سے شادی ہو گئی اور وہ تادم آخر بیں وکٹر ہیوگو کی وفادار بیوی رہی۔

رالف رسل

اردو زبان و ادب کا ایک انگریز شیدائی

انگریزوں نے اردو زبان کی جو خدمت کی ہے اس سے اہل نظر خوب واقف ہیں۔ ہندوستان پر برطانوی تسلط کے بعد ایک عرصے تک انگریزوں نے اردو کی حوصلہ افزائی کی اس مختصر دور میں جتنا بنیادی کام اردو میں ہوا اتنا غالباً اس کے بعد کبھی نہیں ہوا۔ یہ ایک حقیقت ہے تلخ سہی لیکن حقیقت یہی ہے۔ اور جب انگریز حاکموں نے اردو زبان کی طرف سے بے اعتنائی برتنا شروع کی تو آہستہ آہستہ اردو بولنے والوں نے بھی اپنی زبان کو نظروں سے گرا دیا۔ چند بڑے شاعر اور ادیب ضرور پیدا ہوئے لیکن اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے نقطہ نظر سے انگریزوں نے جو کام اپنے ابتدائی دور میں شروع کیا تھا اگر ہم اسے (انگریزوں کی "سرپرستی" سے محروم ہونے کے بعد) جاری رکھتے تو اردو زبان آج سے پچاس سال قبل اس منزل پر پہنچ چکی تھی جس کی ہم اب تمنا کر رہے ہیں۔

اس عرصہ میں اردو کو کچھ انگریز چاہنے والے بھی ملے۔ گلکرسٹ سے لیکر گراہم بیلی تک کئی انگریز اہل علم نے اردو زبان میں دلچسپی لی۔ اور یورپ کے مستشرقین کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔ یہاں ایک اور تلخ حقیقت کی طرف بھی توجہ مبذول کرادوں دوسری عالمی جنگ سے قبل ہندوستان میں اردو زبان بحیثیت ایک مضمون کی حیثیت سے میٹرک کے بعد بہت کم یونیورسٹیوں میں تسلیم کی جاتی تھی۔ اور اردو میں ایم۔ اے کی کلاسیں تو بہت بعد میں شروع ہوئیں۔ جس عہد میں اردو کی حیثیت اپنے وطن میں یہ تھی اس زمانے میں لندن یونیورسٹی میں اردو زبان میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے درجہ تک کام ہو رہا تھا۔ چنانچہ ہمارے کئی اہل قلم مشاہیر مثلاً ڈاکٹر زور۔ ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ وغیرہ نے اسی دور میں لندن یونیورسٹی میں نہایت قابل اساتذہ کے زیر نگرانی اعلیٰ تحقیقی کام کیا اور ڈاکٹریٹ حاصل کی اس لئے غالباً یہ کہنا زیادہ غلط نہ ہوگا کہ یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تحقیقی کام کی روایت قائم کرنے میں لندن یونیورسٹی کا بڑا حصہ ہے۔

لندن یونیورسٹی میں شعبۂ اردو عرصے سے قائم ہے۔ اس میں آنرز اور پی ایچ۔ ڈی۔ کے درجہ تک تعلیم کا انتظام ہے۔ اس شعبے میں ایک استاد اہل زبان (پاکستانی یا ہندوستانی) تین تین سال کے لئے مقرر کیا جاتا ہے اور دوسرا استاد انگریز مستقل عہدیدار ہوتا ہے۔ آج کل اس شعبے میں پاکستان سے ڈاکٹر عبادت بریلوی ہیں اور دوسرے عہدہ پر رالف رسل صاحب ۱۹۴۹ء سے فائز ہیں۔ میرے لندن کے قیام کے دوران میں رسل صاحب لیکچرر تھے۔ اب وہ ریڈر ہیں۔ لندن میں میری ان سے اکثر ملاقاتیں رہیں۔ اور بعض اوقات خاصی طویل۔ رسل صاحب نہایت دلنگار رنگ اور باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ اردو اس بے تکلفی سے بولتے ہیں جس طرح ہم لیکن شاید میں نے غلط کہا۔ وہ ہماری طرح اردو نہیں بولتے۔ کیونکہ ہم اردو بولتے وقت عموماً ایک تہائی الفاظ اور بعض اوقات جملے کے جملے انگریزی کے بول جاتے ہیں لیکن رالف

رسل صاحب جب اردو بولتے ہیں تو اردو ہی بولتے ہیں۔

رالف رسل اردو ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان کی لسانیات۔ صوتیات۔ اشتقاقیات۔ تنقید۔ عروض۔ قواعد۔ وغیرہ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے جن مسائل میں رائے کی گنجائش ہوتی ہے ان میں رسل صاحب اپنی جچی تلی رائے رکھتے ہیں۔ اور جن مسائل میں رائے کی گنجائش نہیں ہوتی یا انھوں نے غور کر کے کوئی رائے قائم نہیں کی ہوتی ان میں خواہ مخواہ اپنی رائے مسلط نہیں کرتے۔ اور نہ غیر مفید مباحث میں ہی الجھتے ہیں۔ اردو زبان بولنے والوں کی تہذیب و تمدن (اس کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں سمیت) سے رسل صاحب اچھی طرح واقف ہیں۔ کبھی کبھی وہ ہمارے رسم و رواج کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جیسے خاندان کی کوئی بڑی بوڑھی عورت بات کر رہی ہو۔

رسل صاحب سے میں نے چند مخصوص جملے اور اصطلاحات ایسی بھی سنیں جو صرف علی گڑھ میں رائج تھیں۔ (معلوم نہیں اب بھی ہیں یا نہیں) حتیٰ کہ رسل صاحب کو بعض شعرا کا مخصوص "غیر مطبوعہ" کلام بھی یاد ہے۔

رسل صاحب بہت عرصہ سے تحقیقی کام کر رہے ہیں ان کے مضامین اور تراجم موقر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے عزیز احمد کے ناول "ایسی بلندی ایسی پستی" کا ترجمہ بھی کیا ہے جس کی اشاعت کا انتظام یونسکو کی طرف سے کیا جا رہا ہے۔ رسل صاحب نے تین مغل شعرا میر۔ سودا اور میر حسن اور ان کے عہد پر جو کام کیا ہے وہ زیر اشاعت ہے۔ اس کام میں جزوی طور پر علی گڑھ یونیورسٹی کے ذہین اور جواں سال استاد ڈاکٹر خورشید الاسلام رسل صاحب کے شریک کار تھے۔ گذشتہ سال کے آخر میں انھوں نے اٹھارویں صدی کی اردو شاعری پر ایک کتاب مکمل کر کے ناشر کو دیدی ہے۔ آجکل رسل صاحب غالب کی شاعری اور خطوط کا ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس موضوع پر اہم تحقیقی کام بھی کر رہے ہیں۔ یہ کام انھیں یونیسکو کی طرف سے دیا گیا ہے۔ حال ہی میں رسل صاحب کی زیر نگرانی ایک طالب علم نے رتن ناتھ سرشار پر کام کر کے لندن یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔

ایک اور اہم موضوع جس پر رسل صاحب کام کر رہے ہیں "مرثیہ" ہے۔ یہ کام انھوں نے ۱۹۵۸ء میں شروع کیا تھا جب وہ تعلیمی رخصت پر برصغیر ہند و پاک آئے تھے۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام نے بھی اس کام میں رسل صاحب کی مدد کی۔ رسل صاحب نے اردو زبان کے مشہور مرثیہ نگاروں خصوصاً انیس کے کلام کا تفصیل سے مطالعہ کیا ہے۔ ایک باشعور محقق کی طرح وہ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مذہبی اور معاشرتی ماحول کا بھی قریب سے مطالعہ کیا جائے جس میں اس صنفِ ادب کی تخلیق ہوئی اور رسل صاحب اپنی موجودہ تعلیمی رخصت کا ایک حصہ اسی مقصد پر صرف کریں گے۔ ان کا ارادہ ہے کہ وہ ہندوستان اور پاکستان میں مرثیہ نگاروں سے مرثیہ سنیں اور مجالس عزا میں بھی شرکت کریں تاکہ مرثیہ کی صحیح فضا سے آشنا ہو جائیں۔

رسل صاحب تاشقند اور دیگر ممالک کا دورہ کرتے ہوئے ۵ اکتوبر کو علی گڑھ پہونچ چکے ہیں اور فروری ۱۹۶۵ء تک وہیں قیام کریں گے۔ فروری کے آخر یا مارچ میں پاکستان آئیں گے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ پاکستان کی یونیورسٹیوں اور ادبی اداروں میں ان کی تقاریر کا انتظام ہو جائے۔

رالف رسل صاحب اردو کے سچے پرستار ہیں اردو زبان کو پرستار ہمیشہ ملتا اور ملتے رہیں گے۔ اپنوں میں سے نہ سہی غیروں میں سے سہی بقول شاعر ؎

نہ ماند ناز شیریں بے خریدار
اگر خسرو نہ باشد کوہکن است

ہاجرہ مسرور

گمشدہ قاری

قیامِ پاکستان کے بعد اردو ادب نے ترقی کی ہو یا نہ کی ہو، ایک شوق نے ضرور ترقی کی ہے اور وہ ہے اردو ادب کے بارے میں بات کرنے کا شوق۔

چنانچہ ہر طرف اردو کا چرچا ہے۔ کوئی اسے سراہنے پر آتا ہے تو قصیدے والا مبالغہ برتنے لگتا ہے۔ کوئی گرانے پر آتا ہے تو تحت الثریٰ میں اُتار کر دم لیتا ہے۔ کسی کے پاس عمدہ ادب پیدا کرنے کے خاص مخاص نسخے ہیں۔ جو وہ اردو ادب کی بھلائی کی خاطر مشتہر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور کوئی اٹھتا ہے تو اردو کے مردہ زندہ سارے ادیبوں کو کیڑوں کی طرح چمٹے سے پکڑ کر فرانسیسی، روسی، انگریزی یا امریکی ادب و تنقید کی لیبارٹری میں رکھ کر جانچنے لگتا ہے۔ کوئی اس بے چارے موجودہ اردو ادیب کو سر کے بل کھڑے ہو کر دنیا کو دیکھنے اور اس کے مطابق لکھنے کا مشورہ دیتا ہے اور کوئی طوطا مینا کی آڑ میں لکھنے کو ادیب کے لئے ذریعۂ نجات قرار دیتا ہے۔ غرض خاصی رونق رہتی ہے۔ یہ تو ہوئیں ان لوگوں کی باتیں جو اردو ادب سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہیں۔ مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ اب وہ بڑے لوگ بھی ادب اور ادیب کے بارے میں بات کرتے ہیں جو کسی قریبی رشتے سے بے چارے اردو ادب کے کچھ نہیں لگتے یعنی قاری بھی نہیں۔ رشتہ سوائے اس کے کوئی نہیں کہ اس قسم کے حضرات بھی پاکستان میں رہتے ہیں اور یہیں اردو ادب نامی کوئی شے بھی پائی جاتی ہے۔

چنانچہ قیامِ پاکستان کے بعد سے اردو ادب کے مقام کا تعین کرنے میں تو ہمارے لکھنے والے بٹے ہوئے ہیں۔ اور ادیب کے فرائض کا تعین یہ مذکورہ بالا قسم کے بڑے لوگ کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہی بڑے لوگ اب ادبی محفلوں کی بڑی کرسی کے بھی حقدار سمجھے جاتے ہیں۔ جب کرسی ہو تو پھر خطبہ ضرور ہوگا۔ اور خطبہ کے مخاطب ادیب ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں بتایا جاتا ہے کہ بس قوم کی باگ ڈور آپ ہی کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ ہی کے کندھوں پر عوام کا شعور بیدار کرنے کا، ان میں ترقی کی اُمنگ پیدا کرنے کا بار ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بظاہر تو یہ باتیں اردو ادیب کو مارے خوشی کے پھُلا دینے کے لئے کافی ہیں۔ لیکن اردو ادیب جب اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتا ہے تو اسے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس قوم کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے اس قوم کو اردو ادب نام کی کسی چیز سے کوئی واقفیت نہیں۔ کیا قوم سے مُراد وہ ناخواندہ کسان ہے جو ہمارے لئے فصل اُگاتا ہے، یا وہ مزدور ہے جو تمام دن محنت کرتا ہے۔ کیا قوم میں قلی، چپراسی، گھریلو نوکر، تانگہ، رکشا اور ٹیکسی چلانے والے، اور چھوٹی چھوٹی دوکانیں لگانے والے شامل ہیں؟ اگر یہ سب قوم کا ایک حصہ ہیں تو یہ ہمارے ملک کی تقریباً ساڑھے نو کروڑ آبادی کا اسّی بچاسی فی صد حصہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ "قوم" اور "عوام" کی اس تعریف

میں نہیں آتے جس کی باگ ڈور ادیب کے ہاتھ میں پکڑانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کیوں کہ قوم کی یہ زبردست اکثریت کتاب کے اثر سے سو فی صدی محفوظ ہے، ان کے لئے علامہ اقبال کا فلسفیانہ کلام اور جاسوسی ناول دونوں ہی بے معنی ہے۔ ہم اور آپ سب جانتے ہیں کہ کوئی کتاب پڑھنے کے لئے ضروری ہے کہ اردو قاعدے کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی پڑھی گئی ہوں۔ اب چونکہ عوام میں امنگیں پیدا کرنے کا فرض ادیب کو سونپا جاتا ہے اس لئے جو صورت سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ادیب پہلے تو اسکول ماسٹرنی کر تعلیم پھیلائیں۔ اور اس کے بعد اپنی ایک ایک کتاب اپنے شاگردوں کو پکڑا دیں۔

اب رہی عوام کی تعریف میں آنے والی بقایا پندرہ بیس فی صدی آبادی، اس میں بھی اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو کم تعلیم یافتہ ہیں۔ یہ لوگ اپنی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے بعد رسالہ یا کتاب خریدنے کی عیاشی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ یہ لوگ بھی اردو ادب کی زد سے باہر رہتے ہیں۔ اب لے دے کے رہ جاتے ہیں وہ لوگ جو آبادی کا ایک فی صد حصہ بنتے ہیں۔ یہ لوگ ہمارے نچلے متوسط طبقے اور امیر طبقے میں بٹے ہوئے ہیں۔ غالباً 'عوام' در قوم سے مراد ہماری آبادی کا یہی ایک یا دو فی صدی حصہ ہے۔ اگر ادب ان سب کے لئے ہو تب بھی غنیمت ہے کیوں کہ ان کی تعداد بھی دس بیس لاکھ تک بنتی ہے۔ اگر اردو ادیبوں کی تحریریں دس بیس لاکھ لوگوں تک بھی پہونچیں تو شاید ادیب قوم کے ذہن کا نگہبان بننے کی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا۔ مگر ایسا بھی نہیں ہے۔ ملک کی اس ایک یا دو فی صد آبادی میں بیشتر لوگ تعلیم یافتہ ہیں جو اپنے آپ کو کسی نہ کسی طرح ہمارے ایک ہزار سالہ تمدن اور ثقافتی ورثے کا حقدار تصور کرتے ہیں۔ ان میں سماجی شعور بھی ہے اور وہ حس لطیف بھی پائی جاتی ہے جو انسان کو حسن نفاست، ادب و شعر، مصوری اور موسیقی کی طرف مائل کرتی ہے۔ ان کی معاشی حالت بھی ایسی ہے، کہ وہ تھوڑا بہت روپیہ اپنے ان لطیف جذبات کی تسکین کے لئے خرچ کر سکیں۔ لیکن ادیب کو ادھر سے بھی سوکھی تسلی اور عزت ہی ملتی ہے۔ ان دس بیس لاکھ انسانوں میں سے اردو ادب کی پہونچ صرف چند ہزار لوگوں میں ہے۔ یہ بھی ہر ادیب کے حصے میں نہیں آتے بلکہ ہمارے سارے ادیبوں کا دائرہ اثر ملا کر بھی چند ہزار لوگوں تک محدود ہے۔

جس اقلیت کا میں یہاں ذکر کر رہی ہوں اُس کے مرد اکثر و بیشتر خوش پوش ہیں۔ ان کے گھروں میں سامانِ آسائش کو اس طرح جمع کیا جاتا ہے جیسے کچھ دیوانے تاریخی نوادر جمع کرتے ہیں۔ وہ تفریح طبع کے لئے ہالی وُڈ کی فلمیں دیکھتے ہیں، اور خصوصیت سے ننگی فلموں کو آرٹ کا درجہ دینے پر مصر ہوتے ہیں۔ ہوٹل میں چائے پیتے ہیں، کباب کھاتے ہیں۔ فرصت میں اخبار بھی پڑھ لیتے ہیں لیکن ان میں سے کتنے ہیں جو شام کو گھر لوٹتے وقت اپنے یا اپنے گھر والوں کے مطالعے کے لئے اردو کی کوئی شعری و نثری کتاب ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایسی اقلیت میں جو عورتیں ہیں وہ بازاروں میں گھوم گھوم کر کپڑوں کے نت نئے پرنٹس اور زیادہ سے زیادہ نوکیلی جوتی ڈھونڈتی ہیں لیکن مہینے بھر میں ایک اردو کتاب کی خریداری ان کے بجٹ میں شامل نہیں۔ ان گھروں میں جاکر دیکھئے، انگریزی کے زنانہ رسائل مل جائیں گے کیوں کہ ان کی مدد سے وہ نہ صرف نت نئے فیشن سیکھ سکتی ہیں، بلکہ اس نمونے کے گھر بھی سجا سکتی ہیں۔ لیکن غالب، حالی، اقبال سے اس سلسلے میں کیا مدد مل سکتی ہے، اس لئے انہیں کون خریدے۔ ایسے گھروں کے لڑکے اور لڑکیاں کبھی کبھی ادب ضرور پڑھتے ہیں۔ لیکن کون سا ادب؟ انگریزی ادب! انگریزی ادب پڑھنا کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ اگر وہ ادب ہو تو ضرور پڑھیں، لیکن کتابوں کی دکان پر جاکر پوچھ لیجئے کہ انگریزی کی کون سی کتابیں ہیں جو بکتی ہیں؟ کامکس، جاسوسی ناول، اور ایسے پیپر بیکس جن کے عریاں ہونے کی ضمانت ان کے کور کی نیم برہنہ تصویروں سے ہو سکے۔

ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ یہ سوال تفصیلی تجزیے کا طالب ہے۔ بات یہ ہے کہ جس اقلیت کا ذکر میں نے کیا ہے وہ تیزی سے مغربی

کلچر کی قیدی بنتی جا رہی ہے۔ ہم نے مغربی اثرات کی درآمد کے لئے اپنا دروازہ بالکل پاٹ کھول دیا ہے۔ اس میں سے ہر چیز مغربی چیز گھسی چلی آ رہی ہے۔ چاہے وہ مغرب کی ترقی یافتہ سائنس اور ٹکنالوجی ہو یا گھٹیا ادب عریاں تہذیب اور لباس سینما کے دروازے پر آپ ٹکٹ دکھائے بغیر اندر نہیں جا سکتے۔ آرٹ، ادب اور کلچر کی محفلوں میں شرکت کیلئے آپ کو پاس حاصل کرنے کی تگ و دو کرنا پڑتی ہے مگر ہمارے ذہنوں کے دروازوں پر کوئی چوکیدار نہیں جو باہر سے آنے والے اثرات سے داخلے کا پاس مانگ سکے

کسی ملک کی ثقافتی اور تمدنی فضا اور رجحان ان کے ذریعے بنتا ہے جن کے ہاتھ میں ملک کے نظم و نسق کی باگ ڈور ہو اور جنہیں معاشی غلبہ حاصل ہو۔ جنہیں عوام کہا جاتا ہے۔ وہ مختلف معاملات میں ان خواص کی پیروی کرتے ہیں۔ اس کے بعد کیا یہ انتہائی مضحکہ خیز بات نہیں معلوم ہوتی۔ جب بھی خواص ادیبوں کو مخاطب کر کے انہیں ان کے فرائض سے آگاہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سے زیادہ اردو ادب کا کوئی شیدائی نہیں۔ دوسری طرف انہی لوگوں نے ایسی فضا پیدا کر دی ہے جس میں ملکی ادیبوں کے پڑھنے والوں کا دائرہ سمٹ کر ایک نقطہ بن گیا ہے۔ اپنی موجودہ سماجی، ثقافتی اور تعلیمی فضا میں مجھے تو یہ ننھا سا نقطہ دیکھ کر بھی تعجب ہوتا ہے۔ اس دور میں یہ نقطہ بھی موجود رہ جانا معجزے سے کم نہیں۔ ہمارے یہاں دفتری اور عدالتی زبان انگریزی ہے۔ اعلیٰ مدارس میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اعلیٰ ملازمتوں بلکہ معمولی ملازمتوں کے امتحانات انگریزی میں ہوتے ہیں۔ دفتروں میں داخلے کے لئے پروانہ راہداری انگریزی ہے۔ افسروں سے اپنا جائز کام کرانا ہو تو انگریزی بولئے۔ خوش پوشش لوگوں کی محفل میں رنگ جمانا ہو تو انگریزی بولئے اور انگریزی اخبار و کتب کا حوالہ دیجئے اگر اپنے چپراسی کو ڈانٹنا ہے تو انگریزی میں ڈانٹئے حتیٰ کہ کسی تعلیم یافتہ لڑکی سے محبت بھی انگریزی میں کیجئے۔ غرضیکہ آج انگریزی حصول معاش کا وسیلہ ہی نہیں بلکہ اعلیٰ التعلیم و تربیت بلند ظرفی اور نفاست طبع کی واحد نشانی ہے۔ یہ فضا عوام نے نہیں بلکہ خواص نے پیدا کی ہے ایسی فضا میں ملکی ادیب اور وہ بھی اردو ادیب کا لکھا ہوا پڑھنا ذہنی پستی اور کم عقلی کی دلیل تو ہو سکتی ہے لیکن کوئی قابل فخر بات نہیں۔

وہ مائیں اب خواب و خیال ہوتی جا رہی ہیں۔ جو گھر کے خرچ میں سے کوڑی کوڑی بچا کر کچھ ادبی کچھ زنانہ رسائل کی سالانہ خریداری کا چندہ بھیجا کرتی تھیں۔ اب وہ یہ پیسہ بچا کر اپنی بیٹی یا بیٹے کے لئے نئے فیشن کا نوک دار جوتا خریدتی ہیں۔ یا پھر انگریزی کتابیں۔ آخر وہ کیا کریں انکے بچے ترقی کی راہ میں دوسروں سے پیچھے کیوں رہ جائیں۔ ؟ اب وہ لڑکے لڑکیاں بھی معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ جنکے پاس اردو کے چنے ہوئے شعراء کے اچھے اچھے شعر ایک بیاض میں جمع ہوتے تھے اور جب وہ کسی شاعر یا نثر نگار کو کہیں پر دیکھتے تھے تو انہیں معلوم ہوتا تھا کہ فلاں کس درجے کا شاعر یا نثر نگار ہے۔ مگر آج میں بے حد خوش لباس لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھتی ہوں جو بے حد خوبصورت آٹوگراف البم شاعر کی طرف بڑھا کر پوچھتے ہیں۔ آپ نے کونسی ناول لکھی ہے۔ اور نثر نگار کے سلسلے میں پریشان ہوتے ہیں۔

کہ یہ بندہ خدا کسی مشاعرے میں آج تک کیوں نظر نہیں پڑا

قصہ مختصر یہ ہے کہ اردو ادب دنیا کا وہ عجیب و غریب ادب ہے۔ جس کے پڑھنے والوں کی تعداد آبادی کے تناسب سے صفر کے درجے پر ہے

یہاں بڑے سے بڑے لکھنے والے کی کتاب ایک ہزار کی تعداد میں چھپتی ہے۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ رائٹرز گلڈ کے اراکین کی فہرست بھی ہزار بارہ سو کے لگ بھگ ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ اردو کے ادیب کو وہی لوگ پڑھتے ہیں جنکا ادب سے کوئی تعلق ہے یا وہ خود ادیب ہونگے۔ یا مستقبل قریب میں انکا ادیب بننے کا ارادہ ہوگا۔

باقی اللہ اللہ خیر صلا۔

کبھی ایک مثل سنی تھی۔ اندھے کی جورو سب کی بھابی۔ چنانچہ اردو ادب بھی میرے نزدیک اندھے کی جورو ہے جس کا جی چاہتا ہے اٹھ کر ہنسی ٹھٹھا کر لیتا ہے۔ اور ادیب ہے کہ بے بسی سے ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنا بیٹھا رہتا ہے۔

اس غریب سے اچھے تو فلم والے ہیں جو مقابلے میں آنے والی ہندوستانی فلموں کی درآمد کو رکوا کر چھوڑتے ہیں۔ اردو ادیب میں تو اتنی بھی ہمت نہیں کہ باہر سے آنے والے گھٹیا ادب کی درآمد پر شور کرے۔

اردو ادیب ہمیشہ سے سخت جان ہے۔ وہ اس کے باوجود لکھتا رہے گا۔ کیا یہ کم خوشی کی بات ہے۔

(کراچی یونیورسٹی کے مذاکرہ بعنوان "اردو ادب کی رفتار" میں پڑھا گیا)

شارب ردولوی

چودھری محمد علی ردولوی کے خطوط

جب بھی خطوط یا خطوط نگاروں کا ذکر آتا ہے ذہن کے سامنے فوراً غالب اور ان کے خطوط کی تصویر آجاتی ہے بالکل اس شعر کی طرح سے

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہونچی تری جوانی تک

یوں تو پیغام رسانی کی ابتدا انسان کے وجود کے ساتھ ہوئی ہوگی۔ خوشی و غم کا انسان کا ازلی ساتھ ہے، اس کی اطلاع یا نوید جان پہچان اور پاس پڑوس والوں کو ضرور دی جاتی رہی ہوگی۔ ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے بھی کسی نہ کسی قسم کی پیغام رسانی کا سلسلہ ضرور رہا ہوگا۔ جس نے تحریر ایجاد ہونے کے بعد خطوط کی شکل اختیار کر لی۔ اس طرح یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خطوط کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس جگہ اس کی گنجائش نہیں ہے کہ خطوط کی تاریخ کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔

جدید دور میں خطوط نگاری نے بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ یوں تو اس کو مختلف قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ لیکن سرسری طور پر اسے دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا کاروباری خطوط، دوسرے نجی یا ذاتی خطوط۔ کاروباری خط و کتابت ان اشخاص کے درمیان تو مفید ہو سکتی ہے جن سے اس کا تعلق ہو، لیکن دوسروں کے لئے اس میں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ملتا۔ نجی یا ذاتی خطوط بھی لوگوں کی اپنی باتوں سے متعلق ہوتے ہیں جن میں اُن کے راز، ان کی کمزوریاں، اور اُن کی وہ تمام باتیں ہوتی ہیں جن کے ظاہر ہونے کو وہ اچھا نہیں سمجھتے لیکن ایسے خطوط جب منظر عام پر آجاتے ہیں تو ان سے بہت سی کام کی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ بہت سے مشکل ترین مسائل کا حل مل جاتا ہے اور وہ معلومات ز مستاسعہ کے لئے ایک عظیم دستاویز بن جاتے ہیں۔

عام طور سے خط کا کام صرف پیغام رسانی ہوتا ہے اور ایک خط کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے مقصد کو کامیابی کے ساتھ پورا کرے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اسے خط کہنا درست نہ ہوگا۔ جس طرح ایک زمانے میں اور اب بھی کبھی کبھی لوگ خط کے انداز پر افسانے اور ناولیں لکھا کرتے تھے۔ ان کی شکل خط کی ضرور ہوتی تھی، لیکن انہیں خطوط کا مقام نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے کہ وہ پیغام رسانی کا کام نہیں انجام دیتے ہیں۔ ان میں قصہ پن زیادہ ہوتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان خطوط کے لکھنے کا مقصد کسی کہانی کو پیش کرنا ہے پیغام پہونچانا نہیں۔ ان میں واقعات کی ترتیب، کشمکش، تصادم، پلاٹ اور کردار نگاری وغیرہ ضروری لوازم پوری طرح ملتے ہیں۔ جن کی وجہ سے ان پر خطوط کا اطلاق نہیں ہوتا۔ مولانا آزاد کی مشہور تصنیف "غبار خاطر" خطوط ہی کی صورت میں ہے جو انہوں نے احمد نگر جیل میں لکھے تھے۔ وہ خطوط

بھی پیغام رسانی کے لئے نہیں لکھے گئے ہیں۔ اس لئے ان پر خطوط سے زیادہ انشائیہ کا اطلاق ہوتا ہے حالاں کہ وہ کسی کے نام لکھے گئے ہیں اور خط ہی کہے جاتے ہیں۔ لیکن ان کا مقام انشائیہ کی تاریخ میں ہوگا خطوط کی تاریخ میں نہیں، اس لئے کہ ان میں پیغام رسانی کا عنصر نہیں ملتا اور اگر انہیں خطوط میں شمار کر لیا گیا تو قاضی عبدالغفار کی کتاب "لیلیٰ کے خطوط" کو بھی خطوط ماننا پڑے گا، اس لئے کہ وہ بھی مختلف لوگوں کے نام منسوب ہیں، حالاں کہ وہ ایک نفسیاتی مطالعہ، فلسفیانہ انداز فکر اور طنزیہ افسانے ہیں جس کے ذریعے قاضی صاحب نے سوسائٹی کی دکھتی رگوں پر نشتر لگائے ہیں۔ ان کو ان معنوں میں خط نہیں کہا جا سکتا جن معنوں میں ہم خط کا استعمال کرتے ہیں۔

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ جدید زمانے میں خطوط نے بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ پہلے شاید ہی کسی کے خطوط چھپے رہے ہوں، لیکن غالب کے خطوط کی اشاعت اور مقبولیت کے بعد ہر طرف خطوط کے مجموعے شائع ہونے لگے جن کی اشاعت سے ایک طرف ہمارے ادبی سرمایہ میں اضافہ ہوا دوسری طرف ان سے ہمیں بہت سی تاریخی، علمی اور ادبی معلومات بھی حاصل ہوئیں۔ ان شائع ہونے والے خطوط میں سب کو وہ ادبی حیثیت حاصل نہیں ہوئی جو کہ غالبؔ کو نصیب ہوئی، لیکن ان سے فائدہ ضرور پہونچا، اور بیشتر لوگوں کے خطوط خود ادب کا حصہ بن گئے، حالاں کہ خطوط ادب پارے نہیں ہوتے اور نہ وہ اس بات کو ذہن میں رکھ کر لکھے جاتے ہیں کہ وہ شائع ہو کر ادبی شکل اختیار کر لیں گے لیکن بعض لوگوں کے خطوط کی بے ساختگی، طرز ادا، بے تکلفی اور انداز بیان نے انہیں ادبی شکل دے دی ہے۔ میری اس بات کی تصدیق ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کے مندرجہ ذیل بیان سے بھی ہوتی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

> "خطوط نگاری خود ادب نہیں، مگر جب اس کو خاص ماحول، خاص مزاج ...
> خاص انداز اور خاص آن، خاص گھڑی اور خاص ساعت میسر آجائے تو یہ ادب بن
> سکتی ہے۔ مگر خط کو ادب بنانے کا کام بہت مشکل ہے۔ یہ شیشہ گری ہے شیشہ گری۔
> اور آئینہ ساز ہو کر کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جو سچ مچ ایسا آئینہ ڈھال سکتے ہوں گے،
> جس کے جلوے خود تقاضائے نگاہ بن جائیں گے اور ہر نظارہ اپنے جوہر کی ہر ادبی لکیر
> کو قرگاں بنا دیں گے۔"

ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ خط کو ادب بنانے کا کام "شیشہ گری" ہے اور ایسی "شیشہ گری" جو آئینہ ساز کو تمام عمر کی کاوش کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتی۔ (دستمت والوں کا ذکر نہیں)۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ادب کا آئینہ خانہ بیش بہا آئینہ سازوں کے شاہکاروں سے آراستہ ہونے کے بجائے ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑوں سے بھرا ہوتا۔

ہمارے ادب میں، جن لوگوں کے خطوط نے بلند مقام حاصل کیا ان میں غالب، سرسید، شبلی، اکبر الٰہ آبادی، مہدی افادی، مولانا آزاد، سید سلیمان ندوی، نیاز فتحپوری، عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی وغیرہ کے نام کافی اہمیت رکھتے ہیں۔

غالب کے خطوط کی سب سے بڑی اہمیت اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ اگر ایک طرف اپنے انداز بیان، حقیقت پسندی، بذلہ سنجی، طنز و ظرافت اور طرز ادا کا بہترین نمونہ ہیں تو دوسری طرف اپنے زمانے کی تاریخ کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان خطوط سے اس زمانے کے سیاسی و سماجی حالات وغیرہ کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔

خطوط کے مطالعے سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کسی ادیب کے خطوط اس کے نفسیاتی مطالعے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں ادیب کی شخصیت پوری طرح واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے کہ :

A man Soul lies naked in his letter..

"کسی بھی انسان کے بارے میں اس کے خطوط کو پڑھ کر صحیح رائے قائم کی جا سکتی ہے۔"

غلام رسول مہر نے ایک جگہ لکھا ہے :

"خطوط و مکاتیب ہر شخص کی حقیقی حیثیت کا اندازہ کرنے کے لئے نہایت عمدہ اور بڑی حد تک قابل اعتماد سرمایہ ہیں۔"

یہی وجہ ہے کہ خطوط نجی اور شخصی ہونے کے باوجود جماعتی اور انسانی اہمیت رکھتے ہیں، اس لئے کہ ان کے ذریعے علمی اور فنی معلومات کے علاوہ بہت سی ایسی معلومات فراہم ہوجاتی ہیں جن سے مطالعۂ ادبیات میں مدد ملتی ہے اور شخصی مطالعے میں تو بہت سے نئے ابواب کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ شبلی کے خطوط اگر نہ شائع ہوتے تو آج اُن کی زندگی کا ایک اہم ترین گوشہ ویران رہتا۔ ان کے وہ خطوط جو انہوں نے عطیہ فیضی کو لکھے ہیں ان میں جو تازگی، ندرت اور ایجاز ہے وہ کہیں مشکل سے نظر آئے گا۔ ان خطوط میں جذبات و نفسیات کا شعور پوری طرح نظر آتا ہے۔ اور شبلی کی شخصیت بحیثیت ایک آب و گل کے انسان کے جتنی خوب صورت بن کر آتی ہے وہ اس وقت ہرگز نہ بنتی اگر ان خطوط سے دنیا محروم رہتی۔ ان خطوط کی سادگی، خلوص اور اس کی رنگینی آج بھی اسی طرح تر و تازہ ہے۔ ان کے خطوط میں جذبات کی شورش بھی ہے لیکن شبلی کے "سلیقہ" نے اس کو تمام اعتراضات سے بچا لیا ہے۔

یوں تو اچھے مکتوب نگار بہت سے ہیں جنہوں نے اپنا اثر چھوڑا ہے اور جو اپنی طرز کے مالک رہے ہیں، اور جن کی نقلیں کرنے والوں کو آخر میں کہنا پڑا ہو۔ ع

"اسد اللہ خاں قیامت ہے"

لیکن غالب کے خطوط کے بعد اگر کسی کے خطوط نے لوگوں کو چونکایا ہے تو وہ چودھری محمد علی ہیں۔ چودھری محمد علی کو صاحب طرز افسانہ نگار کی حیثیت سے بہت شہرت ملی ہے، اور انہیں اردو کا "اولین فطرت نگار" مانا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا انداز بیان اور طریقۂ بیان ان کے عہد کے کسی افسانہ نگار کو نصیب نہیں ہوا۔ وہ جہاں پر جس چیز کی تصویر جس انداز میں اور جس شکل میں چاہتے تھے پیش کر دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں گفتگو کا لطف ملتا ہے۔ اس سے پڑھنے والا کردار کے اتنا قریب آجاتا ہے کہ کردار کی خوشی اور ہنسی کا عکس پڑھنے والے کے چہرے پر تبسم کی صورت میں نظر آجاتا ہے۔ ان کا کوئی افسانہ بذلہ سنجی، شوخی اور طنز سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ وہ حقیقت سے اس قدر قریب ہو کر لکھتے تھے کہ آج بھی ان کے کردار چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

یہاں میرا اُن کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھنے کا ارادہ نہیں ہے۔ اس وقت صرف اُن کے خطوط سے سروکار ہے۔ جن لوگوں نے اُن کے خطوط کا مجموعہ "گویا دبستان کھل گیا" دیکھا ہے، اُن کو اس بات کا اندازہ ہوگا کہ اُن کے خطوط میں حقیقت کا اظہار کس حد تک ہوتا ہے۔ اور وہ خطوط کس قدر خلوص سے لکھے گئے ہیں۔ "گویا دبستان کھل گیا" کے بیشتر خطوط اُن کی بیٹی بیگم ہما اخلاق حسین کے نام ہیں۔ چونکہ چودھری محمد علی خطوط کو زندگی کا ایک جز سمجھتے تھے، اس لئے اُن کے لئے ضروری تھا کہ کسی نہ کسی کو خط لکھتے رہیں، اسی لئے ان کے خطوط میں ایک ایسی جانی پہچانی فضا ملتی ہے جو اپنے گھر کی ہو۔ اُن کے خطوط کی دوسری خوبی یہ ہے کہ غالب کے بعد ایک با

پھر "مراسلہ کو مکالمہ" بنانے کا کام چودھری محمد علی نے انجام دیا۔
غالبیات کے سب سے بڑے استاد مالک رام نے لکھا ہے کہ :

"چودھری محمد علی نے یہ خط نہیں لکھے ہیں بلکہ اُن کے قلم نے جس وقت وہ
یہ باتیں سوچ رہے تھے اُن کے ذہن وقلب کی تصویر کھینچ لی ہے۔ اب بھلا یہ کیسے ممکن
ہے کہ کیمرے کی تصویر اصل سے مختلف ہو"

یہ صحیح ہے کہ اس قدر بے ساختہ پن Purity، بے تکلفی، سادگی اور خلوص دوسری جگہ نہیں ملتا۔ جس وقت ہما بیگم نے ان کے خطوط.....
چھپوانے کے لئے کہا ہے تو ایک خط میں انہوں نے اس بات کی شکایت کی تھی کہ اب خطوط میں وہ سادگی اور بے رنگی باقی نہیں رہے گی۔
یہاں پر اس خط کا ایک حصہ نقل کرتا ہوں :

"ہما پیاری ! دعائیں قبول فرماؤ۔ اور میرے بس میں کیا ہے۔
ایک بار مولوی عوض علی مرحوم اور ہم ساتھ جا رہے تھے میں نے ان کی تعریف
شروع کی کہ آپ اچھی خیرات کرتے ہیں۔ وہ کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے : "لے بھائی
ای کا کیہو ہمرا سب کچھ کیا کراوا مٹی کر دیو۔ اب تم کہہ دیو اب کا ہوی ہے۔ لے ہمرا
تو توا لے گوا۔ حکم ہے کہونا اور تم کہہ دیو تو ہم تو کیہن کے نار ہن۔ واہ بھئی واہ ایسا
کوئی کرت ہے بھائی" تم نے لکھا ہے کہ میرے خط چھپوانے کے لئے جمع کر رہی ہو،
اب خط لکھنے کے وقت یہ یاد آجایا کرے گا، اور بجائے سادگی، صفائی، بے لوثی کے
انانیت، اوچھاپن، اظہار رقابیت، املا نحاک دھول خطوں میں نا معلوم کیا کیا
سما جائے گا۔ "لے بھائی جا ای کا کیہو بھئی ہمرا کیا کراوا سب مٹی کر دیو" ایک
مرتبہ یہی بات میں نے اپنے استاد مسٹر سڈنس کو لکھی تھی۔ انہوں نے جواب میں لکھا تھا
کہ میرے خطوط کے چھپوانے کا خیال ہرگز نہ کرنا۔ اگر میں یہ جانتا تو مجھ سے وہ خطوط
لکھے نہ جاتے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ میرے خطوط چھپیں نا۔ اگر ان سے کوئی فائدہ
مقصود ہو تو ضرور چھپیں۔ مگر اس خیال کے بعد تحریر کی بے تکلفی تو گئی۔ مولانا آزاد
نے جیل خانے میں چھپوانے کے لئے خطوط لکھے تھے۔ دیکھ لو۔ ایک خط کے سوا جو
انہوں نے اپنی بی بی کے مرنے پر لکھا تھا، اور جتنے خطوط ہیں ان میں لڑکوں کا باپ
مُردہ، بی بی کا شوہر غائب، اور صرف ادب کا منشی، علوم کا مولوی، انگریزی پالٹکس
کا ادھ کچرا نقال، ریا کا ڈھنڈھورا پیٹنے والا، بڑے بڑے الفاظ اور عربی ترکیبوں
کا اردو کی اونچی نیچی زمین پر ٹینک، چلانے والا دکھائی دیتا ہے"

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ جب کسی کو اس بات کا علم ہو جائے کہ اُس کے خطوط شائع ہوں گے تو وہ بے تکلفی اور سادگی باقی نہیں
رہتی۔ حالانکہ چودھری محمد علی کے خطوط میں آخر وقت تک وہی بے تکلفی، بے لوثی، خلوص اور جذبات کی سچی تصویریں ملتی ہیں جو اُن کے

شروع کے خطوط میں نظر آتی ہیں۔ اس کی اصل وجہ میں مالک رام کے الفاظ میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ "ان کے ذہن اور دل کی تصویر ان کا قلم کیمرے کی صورت میں کاغذ پر منتقل کر دیتا تھا۔ اس لئے اس میں تصنع یا بناوٹ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ راجہ صاحب سلیم پور کو ایک خط میں کس قدر صفائی کے ساتھ اپنی پریشانی کا حال لکھتے ہیں:

"مائی ڈیر راجہ صاحب۔ دعائے شوق۔

معلوم نہیں کب سے ملاقات نہیں ہوئی، نہ معلوم کیوں۔ مگر دیکھنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ مواقع اتنے کم رہ گئے ہیں اور میرا سن اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ اگر دید کی صورت نہ پیدا ہو اور میرا رخت سفر بندھ جائے، تو کوئی تعجب نہیں۔ روپیہ اتنا کم رہ گیا ہے کہ جب تک اشد ضرورت نہ آن پڑے لکھنؤ جانے کا رعب نہیں پڑتا۔ اگر لکھنؤ آ گیا تو کار پر سلیم پور آنا ممکن ہے۔ کار بھی اسی وقت تک ہے جب تک کوئی خریدار نہیں ملتا۔ خریداروں کا یقیناً یہ حال ہو گیا ہے۔

"سب گھٹا دیتے ہیں مفلس کے عوض مال کا مول"

مذہب سے متعلق چودھری صاحب کی کتاب "میرا مذہب" شائع ہونے پر اچھی خاصی چپقلش پیدا ہو گئی تھی۔ اس پر طرح طرح کے تبصرے ہو رہے تھے جس کی جو سمجھ میں آتا تھا رائے دیتا۔ ان رائے دینے والوں میں پر خلوص عاشق بھی تھے، علمائے دین بھی اور اندھے مقلد بھی۔ چونکہ بہت عرصے سے چودھری صاحب نے محرم کی مجلسیں، تعزیہ داری، جلوس اور مجلسوں میں شرکت وغیرہ سب چھوڑ دی تھی اس لئے اس کتاب کی اشاعت اور اس میں اس کے اعلان پر ان کے بہت سے شیعہ دوستوں نے خط لکھے جن میں میجر سید ابو جعفر صاحب بھی تھے۔ ان کے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

"جناب میجر سید ابو جعفر صاحب خان بہادر کلکتہ۔ صاحب خلق عظیم کے امتی سید ابو جعفر صاحب کو سلام شوق پہونچے۔ واللہ میجر صاحب نہ یہ شرط انصاف نہ شرط دوستی، اپنے میٹھے بولوں سے آپ کیا کرنے پر تلے ہیں۔ میں بوڑھا خرف بڈھا اور بالا برابر سٹھیا گیا ہوں۔ بچوں کا ایسا بھولا پن پھر سے آ گیا ہے اور آپ میری حالت سے فائدہ اٹھا کر مجھ کو پھر سے شیعہ کرنا چاہتے ہیں۔ آخر اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ ع

"کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری"

اللہ میاں نے آپ کی زبان میں نرمی اور قلم میں اثر اسی واسطے دیا تھا کہ آپ میرے ایسے نادان پر ہاتھ صاف کیجئے اور مجھ کو مسلمان سے پھر شیعہ کر لیجئے اور تو اور ذری اس بات پر غور کیا ہوتا کہ ابھی ابھی چار پانچ سو لگا کر "میرا مذہب" چھپوایا ہے۔ اگر میں شیعہ ہو گیا تو اس رقم پر پانی پھر جائے گا۔" (سنہ ۱۹۵۲ء)

بذلہ سنجی اور ظرافت ان کے خون میں اس طرح ملی ہوئی تھی کہ ہر موقع پر وہ اس کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکال لیتے تھے۔

اُوپر کے اقتباس سے اس بات کا پورا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایک جگہ چودھری محمد علی کے خطوط پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"یہ خطوط اردو خطوط نگاری کی تاریخ میں ایک نئے مقام کی نشاندھی کررہے ہیں۔"

چودھری محمد علی کے خطوط اس قدر دلچسپ اور اُن کا اندازِ تحریر اس قدر دل کش ہے کہ اُن کے خطوط کا مجموعہ ایک بار اُٹھانے کے بعد رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ان خطوط میں دلچسپی اور رنگینی کے ساتھ ساتھ چودھری محمد علی کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ بحیثیت ایک ادیب اور افسانہ نگار کے، بحیثیت ایک مخلص دوست کے، بحیثیت ایک موحد کے، بحیثیت ایک شفیق باپ کے، بحیثیت ایک استاد گو اور گفتگو کرنے والے کے، اور ہر شکل میں چودھری صاحب کی شخصیت اسی طرح پرکشش اور جاذب توجہ نظر آتی ہے۔ جی چاہتا تھا کہ ان کے مجموعے "گویا دبستان کھل گیا" سے چند اقتباسات نقل کرتا لیکن ان کو چھوڑ کر چند غیر مطبوعہ خطوط کی نقلیں پیش کرتا ہوں۔

اپنی مستقل بیماری سے وہ عاجز ہوگئے تھے۔ دن بہ دن کمزوری بڑھتی جاتی تھی۔ آنکھوں کی بینائی ادھر عرصے سے کم ہوگئی تھی جس سے اُلجھن اور بڑھ گئی تھی۔ لیکن وہ ہر پریشانی کا بڑے صبر و سکون کے ساتھ مقابلہ کر رہے تھے۔ ایک خط میں خواجہ غلام السیدین صاحب کو اپنے ایک عزیز کا جس نے اسی سال ایم اے کیا تھا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

"........ صرف یہ استدعا ہے کہ ہمیشہ کی طرح دل بڑھانے والا شرف دیجئے گا، اور اس نیم کو رمفلوج کی دعائیں لیجئے گا اور آس نہ توڑیئے گا۔

کیا کہیں خواجہ صاحب موت اور زندگی کے درمیان جھول رہے ہیں۔ اگر اعمال کی سزا ہے تو مالک یوم الدین کا عدل ہے اور اگر تخفیف عذاب کی صورت ہے تو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۝

آپ اور آپ والوں کا دلی دُعاگو

محمد علی عفی عنہ

ردولی۔ ۲۶ رمئی سنہ ۵۷ء

نقل خط بنام شاہ آفاق احمد احمدی

شاہ آفاق احمد صاحب درگاہ شاہ مخدوم عبدالحق قدس سرہٗ کے سجادہ نشین جناب شاہ حیات احمد صاحب کے صاحبزادے ہیں جو چودھری صاحب کے قریب ترین دوستوں میں تھے۔ چونکہ چودھری صاحب سے بہت چھوٹے تھے اس لئے وہ ان کو اپنے لڑکے کی طرح مانتے تھے۔ آفاق صاحب کو کبھی کبھی اپنے کاموں سے ردولی سے باہر بھی جانا پڑتا تھا۔ اگر وہ دو ایک دن کے لئے بھی جاتے تو چودھری صاحب کو شاق گذرتا تھا۔ ایک بار وہ بنارس گئے۔ ان کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

"میری آنکھ کا نور، میرے دل کا سرور آفاق بیٹا سلمہٗ
دعائیں دلی۔ تمہارا خط آیا۔ جتنی باتیں تم نے لکھی ہیں وہ سب میرے دل میں

سمجھو۔ اور میرے دل کے تار انھیں ہاتھوں سے مل گئے۔ ہر تار انھیں سُروں میں
سانس دینے لگا محبت بھی عجیب نعمت ہے کہ سیکڑوں کوس پر بیٹھے باتیں کر رہے ہیں
اور ظاہر ہیں دیکھو تو چپ ہیں۔ میں باوجود تمہاری مفارقت سے اچھا ہوں، وجہ
ہے کہ "از دیدہ دور از دل قریب" محسوس کر رہا ہوں۔ قیصر لکھنؤ گئی تھیں —
محبوب عالم کا تار آیا کہ عائشہ کا نکاح ہونے والا ہے۔ وہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ
صرف منگنی تھی۔ تمہارا ڈرافٹ بھی شاید واپس آیا ہے، کیوں کہ اس میں کوئی قانونی
غلطی ہوگئی ہے جو شاید جلدی ہی درست ہوسکتی ہے۔ بالکل عائشہ کا نکاح ہو گیا۔
یعنی "دیر آید درست آید" انشاء اللہ، مگر اس وقت نولینوں شعر
"تجربات جیا بھر دیوں چھوسے نہ دیہوں سر پہ"
یہ دریافت کرتے ڈر لگتا ہے کہ کب تک آؤگے بہرحال
"جہاں رہو نیکے رہو تم ہمرے سینہ روا کے بھاگ"
تمہارے گھر میں سب خیریت ہے۔ کل چودھری نعمت اللہ صاحب مجھ کو دیکھنے
آئے تھے، بڑا دل خوش ہوا جیسے جسم میں طاقت آگئی، اور دل کے چمن میں پھول کھل
گئے، البتہ کھانے پر تمہاری جگہ خالی تھی۔ سیخ کے کباب اور حسینہ کی ترکاری گوشت
کے ساتھ، تم نہیں سکتے اس لئے مجھ کو یہ معلوم ہوا جیسے نمک کم ہے۔ اس وقت صبح کا
وقت ہے، میاں جعفر پوسٹ کارڈ کا کونہ پکڑے اس طرح کھڑے ہیں کہ میرے چہرے
پر دھوپ نہ پڑے تاکہ میرے حواس دماغ سے نہ نکل جائیں۔ اللہ کرے ڈاک کا وقت
نہ نکل جائے۔ دیکھو نہ زور سے دعا کہہ رہی ہیں۔ میں خود کیا کہہ رہا ہوں اس کے لکھنے
کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا تمہارا زکام اچھا کرے اور تمام بُری باتوں کو تم سے دور
رکھے۔ اور تمام اچھی باتوں کو تم سے قریب کرے۔ آمین، آمین، ثم آمین!

راقم تمہارا دعاگو عفی عنہ

۲۱ر فروری سنہ ۵۸ء

سعید کے نام

سعید مصطفیٰ علی چودھری صاحب کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم ہیں اُن کو لکھتے ہیں

"مائی ڈیئر سعید،
میرا بیٹا ملول نہ ہوا کریں۔ شکایت کا خط آیا تھا۔ تم ملنے بہت کرتے ہو۔
مجھے اُمید ہے کہ اپنی ذمہ داریوں کا تم کو اندازہ ہو گیا ہوگا۔ اور کیا لکھوں، موت کا

ہر وقت انتظار دیکھا کرتا ہوں۔

"سیاں آون کی بھنک بریاں درجا کھاری رہوں"

عظیم جو تمہارے میاں کہتے اب کلکتہ بنگلات میں نوکر ہیں .... تم کو سلام کہہ رہے ہیں

دعاگو تمہارا باپ عفی عنہ

۱۴ر نومبر سنہ ۵۸ء

شاہ آفاق احمد کے نام

"آفاق بیٹا،

خدا تم کو اس دنیا کا اور اس دنیا کا اطمینان بخشے۔ تمہارے پہلے خط کا جواب آنکھوں کے دکھوں نہیں دیا۔ دل اور دماغ بھی اس طرح کام کر رہے ہیں، جیسے صوفیانے کی نوحہ خواں کمیٹی۔ آنکھ کا اشارہ کچھ کہتا ہے دل اپنے رنگ میں ہے۔ دماغ ہنڈولے پر مزے کر رہا ہے۔ بایاں ہاتھ پہلے ہی سے زمیندار ہو چکا ہے۔ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّابِاللّٰہِ ۔ یہ کیا لغو باتیں بک رہا ہوں۔ تمہارے والد ان شا اللہ لکھنؤ سے آگئے، ابھی مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ لوگ صحت کی مبارکباد دینے اس قدر آئے ہیں کہ ہر وقت یہاں آنے کا خیال کیا کرتے ہیں مگر پورا نہیں ہوتا۔ احمدی نبلو اور نوری بہن ایک شام[1] مجھے دیکھنے آئی تھیں۔ یہاں مقصود سید پوری کے نواسہ ہوا ہے۔ قیصر بیگم دن بھر کام کیا کرتی ہیں۔ اور مجھ سے تقاضہ کیا کرتی ہیں کہ تم نے آفاق کے خط کا جواب نہیں دیا۔

باقی جگہ سعید اور قیصر کے لئے چھوڑ دی ہے۔　　تمہارا دعاگو عفی عنہ

ڈاک کا وقت کم ہے اس لئے جابر سعید تسلیم عرض کرتے ہیں۔ قیصر دعا کہتی ہیں"

یہاں پر بہت زیادہ خطوط یا ان کے اقتباسات پیش کرنے کی گنجائش نہیں ہے ورنہ ان کا ہر خط اپنی دلچسپی، اپنی سادگی، اپنے پُرخلوص انداز، اپنی طنزیہ اور مزاحیہ چٹکیوں، اپنی محبت اور اپنے حسن میں ایک دوسرے پر فوقیت لے جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہر خط سلاست، بے تکلفی، شگفتگی اور برجستگی کا ایسا خوب صورت مرقع نظر آتا ہے کہ نگاہ جہاں پڑتی ہے وہیں ٹھہر جاتی ہے۔ تکلیفوں، پریشانیوں، بیماری، دکھ اور درد کے باوجود ان پر مسکراتے ہوئے شگوفوں کا گمان ہوتا ہے۔ اور اسی تعجب، حیرت اور مسرت کے عالم میں یہ شعر زبان پر آجاتا ہے،

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

---

[1] ردولی میں ایک محلہ ہے جہاں محرم بہت دھوم سے منایا جاتا ہے۔

جوش ملیح آبادی

رہِ ابدیت

نہ مضطرب ہو مجھے یہ خبر ہے اے دمساز
کہ زیرِ سطحِ مسطح بھی ہے نشیب و فراز

چٹخ رہی ہیں چٹانیں، سرک رہے ہیں پہاڑ
زہے تجلّیِ نفاذِ فکرِ آئینہ ساز

زہے جلالتِ خُدّامِ عارفانِ جدید
بہ ہر نگاہِ کرامت، بہ ہر نفس اعجاز

زہے عروج کہ سلمائے فکرِ اوج شکار
بنا رہی ہے مہ و خور کو فرشِ پا انداز

دھڑک رہا ہے دلِ آسمانِ شعلہ مزاج
اٹھا رہی ہے زمیں دیدۂ قدر انداز

اُڑی ہوئی ہے تب و تابِ خسروِ خاور
ہُوا ہے ذرہ کچھ اس طرح مائلِ پرواز

بہت غرور نہ فرمائیں ثابت و سیار
کہ خاک پر حرکت کا ہُوا ہے اب آغاز

رواں ہیں جانبِ انساں نقاب اُٹھائے ہوئے
فضا کے بھید، زہرہ کے رموز، چرخ کے راز

گدائے راہ کی جانب مُڑی ہے گردنِ شاہ
سرِ نیاز کی جانب بڑھا ہے افسرِ ناز

وہ پا چکا ہے فروغِ انکسارِ پروانہ
کہ شمع بھول گئی ہے غرور کے انداز

فقیہِ شہر سے کوئی پکار کر کہہ دے
کہ اب ہے فرش کا حامی دماغِ عرش نواز

فلک پہ دنگ ہے زہرہ، زمیں پہ داؤد
حریمِ ذہنِ بشر میں چھڑے ہوئے ہیں وہ ساز

ترانہ ریز ہیں کچھ یوں مغنّیانِ زمیں
کہ مطربانِ سماوی ہیں گوش بر آواز

برہمنوں نے بغاوت پہ باندھ لی ہے کمر
لرز رہے ہیں بتانِ عظیم و سرافراز

بصد شکوہ چلے گا جو آبِ حیواں میں
بنا رہی ہے تمنائے زندگی وہ جہاز

مری رہِ ابدیت پہ چل نہ پائے گا
مسیح و خضر کا یہ اختصارِ عمر دراز

جبینِ جوش ہے، اس آرزو میں زانو پر
کہ بے پناہ خموشی سے کھینچ لے آواز

سردار جعفری

پیاس کی آگ

میں کہ ہوں پیاس کے دریا کی تڑپتی ہوئی موج
پی چکا ہوں میں سمندر کا سمندر پھر بھی
ایک اک قطرۂ شبنم کو ترس جاتا ہوں
قطرۂ شبنمِ اشک
قطرۂ شبنمِ دل، خونِ جگر
قطرۂ تبسّم نظر
یا ملاقات کے لمحوں کے سنہری قطرے
جو نگاہوں کی حرارت سے ٹپک پڑتے ہیں
اور پھر لمس کا نور
اور پھر بات کی خوشبو میں بدل جاتے ہیں
مجھ کو یہ قطرۂ شاداب بھی چکھ لینے دو
دل میں یہ گوہرِ نایاب بھی رکھ لینے دو
ہونٹ ہیں خشک مرے، خشک زباں ہے میری
خشک ہے درد کا، نغمے کا گلو
میں اگر پی نہ سکا وقت کا یہ آبِ حیات
پیاس کی آگ میں ڈرتا ہوں کہ جل جاؤں گا

الطاف مشہدی

کومل رُت

ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے اور کرنوں کے ہار
گیتوں کا بہروپ بدل کر اک البیلی نار
سندرتا کا دیپ جلائے آئی میت دوار
برکھا کی من موہن لے میں ڈوب گیا سنسار
کومل رُت کی سارنگی میں جاگ اُٹھے ملہار

ہردے کے آکاش پہ چمکی اک برچھی دودھاری
جوبن بگیا پیچھے پیچھے ساتھ ساتھ پھلواری
سر میں کھو کر ساون گائے جگ جگ سندر ناری
مٹی کی مورت پر ریجھے مدھ ماتے کرتار
کومل رُت کی سارنگی میں جاگ اُٹھے ملہار

چھم چھم پائل رم جھم میگھا کوکو کوئل گائے
شیتل پروا کے ماتھے پر شبنم دیپ جلائے
جب کوئی انمول کہانی جیون سے ٹکرائے
انگڑائی میں ڈھل جائے جب کوئی بانکی نار
کومل رُت کی سارنگی میں جاگ اُٹھے ملہار

سلام مچھلی شہری

دیوانہ

— بڑا خیال

بڑی بات
اور بڑے آدرش
ہر اک ذہن میں ہوتے ہیں
پلتے رہتے ہیں
کوئی نہ کوئی بڑے کام کر گزرتا ہے
کوئی نہ کوئی یہ آدرش ڈھونڈ لیتا ہے
جو کامیاب ہوا اک عظیم انساں ہے
جو کامیاب نہ ہو پایا ایک دیوانہ
مگر وہ بات
جو دیوانے کہہ گزرتے ہیں
اسی سے لیتی ہے اک نور نسلِ مستقبل
بہت اداس نہ ہوا اے اجل رسیدہ دل !
میں مر گیا تو کوئی اور میری جانب سے
مرے خیال کی شمعیں جلا کے اٹھے گا —!؟

ظہور نظر

دشتِ مرگ

پُرسکوت و پُرخطر
بے دلی کے ساحلِ خنک کی گیلی ریت پہ
بند آنکھیں نیم جاں بازوؤں سے ڈھانپ کر
لاش کی طرح پڑا ہوں بے خبر

جب کسی خیال کی، کوئی موج سست رو
میرے نیم سرد ذہن، نیم گرم جسم کو
چھو کے لوٹ جاتی ہے
زندگی کے جھاگ کی سوندھی سوندھی باس سے
اپنی یاد آتی ہے

چونکتا تو ہوں مگر، بند آنکھیں کھول کر
زندگی کو دیکھنے کی تاب اب کہاں سے لاؤں
دب گئے ہیں ریگِ سرد و نم میں جو وہ خواب اب کہاں سے لاؤں

کاش کوئی لہر کوئی موجِ الم مجھے، پھر اُٹھا کے پھینک دے
کرب و درد و غم کے اُس بحرِ جاں گداز میں
تھوڑی دیر قبل جس میں ڈوبنے لگا تھا میں
کشمکش کی لہر جس سے مجھ کو کھینچ لائی تھی
بے دلی کے ساحلِ خنک کی گیلی ریت پر
بے دلی کا ساحلِ خنک کہ دشتِ مرگ ہے

ڈاکٹر منیب الرحمٰن

شامِ غریباں

سوادِ شہر تاریکی میں اُبھرے

یکایک جل اُٹھا ہر داغِ ہجراں

وہی مبہم تمناؤں کے سائے

وہی مدھم امیدوں کا چراغاں

وہی زخموں کی پُراسرار خوشبو

وہی یادوں کے گلہائے پریشاں

دریچے کُھل گئے تنہائیوں کے

جدھر دیکھو وہی سنسان گلیاں

گیا تھا تیری بزمِ رنگ و بو میں

کہاں لے آئی یہ شامِ غریباں

ابن انشا

کنارِ بحر

(دو نظمیں)

(۱)

کسی سے دُور جا پڑے، کسی کے پاس ہو گئے
کنارِ کیسپین پہ ہم بہت اُداس ہو گئے
اُدھر کنارِ بحر تھا، اِدھر بلند گھاٹیاں
جنوں کی وحشتیں ہمیں لئے پھریں کہاں کہاں
وہ رات ایک خواب تھی مگر عجیب خواب تھی
کتابِ زندگی کا ایک لاجواب باب تھی
اِدھر اُدھر کی گفتگو، زمانے بھر کی گفتگو
رہِ درازِ عشق کے کٹھن سفر کی گفتگو
دلوں کی آرزو زباں تک آن کے پلٹ گئی
اسی میں رات کٹ گئی، اسی میں بات کٹ گئی
اُنہیں تو ہم نے پالیا، پہ اپنے آپ کھو گئے
کنارِ کیسپین پہ ہم بہت اُداس ہو گئے

(۲)

سب کو دل کے داغ دکھائے، ایک تجھی کو دکھا نہ سکے
تیرا دامن دُور نہیں تھا، ہاتھ ہمیں پھیلا نہ سکے
نا تجھ سے کچھ ہم کو نسبت، نا تجھ کو کچھ ہم سے کام
ہم کو یہ معلوم تھا لیکن دل کو یہ سمجھا نہ سکے
اب تجھ سے کس منہ سے کہہ دیں، سات سمندر پار نہ جا
بیچ کی اک دیوار بھی ہم تو پھاند نہ پائے، ڈھا نہ سکے
من پاپی کی اُجڑی کھیتی، سُوکھی کی سُوکھی ہی رہی
اُمڈے بادل، گرجے بادل، بُوندیں وہ برسا نہ سکے

(چالوس - مازندران)

عبدالعزیز خالد

تلاش

میں رات بھر فلکِ نیلگوں کو تکتا ہوں
دلِ حزیں میں یہ امید و اشتیاق لئے
کہ وہ ستارہ تم آنگن سے دیکھتی ہو جسے
کبھی تو سامنے آئے گا گھومتے پھرتے
کہیں صباح، بحیرۂ آسماں کے زینوں سے
اُتر کے حسنِ شفق، و شبنم و سحر گاہی
تو خوابگہ کی بجھاتا ہوں بتیاں لیکن
کہیں بُلانے یہ آتی ہے نیند کی دیوی؟

میں ہر دیار و ولایت کے زائر و سیاح
سے جا کے ملتا ہوں شاید کسی نے احیاناً
تمہاری خوشبوئے عفت مآب سونگھی ہو
کنوارے جسموں میں ہوتا ہے مشک و مقناطیس
جو چاندنی کی طرح دل پہ سحر کرتا ہے
مگر کسی نے بھرا دم نہ آشنائی کا
جو ہوشیار ہو کیوں رازداں کرے پیدا؟

میں پوچھتا ہوں نسیم و صبا سے دلبر نے
مرے لئے کوئی پیغام تو نہیں بھیجا؟
کہ اگلے وقتوں کے شاعر مزاج عاشق لوگ

صبا و ابر کو پیغامبر بناتے تھے
ملن کے رس بھرے دوہے ہمیں سناتے تھے
گل آشنا نہیں، بادِ صبا ہے بیگانہ
برہنہ پا پھرے ہے دشتِ جنوں میں دیوانہ
میں اس خیال میں مدتوں سرگشتہ رہتا ہوں
تمہارے ہونٹوں سے نکلا ہوا کوئی نغمہ
کسی گلی، کسی کوچے سے ہو کے پھر شاید
ہوا کے دوش پہ سرمستِ ناز مل جائے
مجھے فسردہ و دلگیر دیکھ کر بولے :
سخن سرا ہو مگر زندگی سے ڈرتے ہو
خدا پرست ہو، قسمت کا شکوہ کرتے ہو؟

میں دیکھتا ہوں حسین عورتوں کے چہروں کو
بلا ارادہ، سرِ راہ، لاابالی وار!
کہ کتنے رازوں کا مدفن ہیں کتنی خوشیوں کا
نقاب پوش سلگتی ہوئی سیہ آنکھیں
لب و نگاہ میں رمز و رضائے بوس و کنار
کہ جیسے آتشِ پنہاں سے دہکے شاخِ چنار
دہانِ تشنہ پکار اٹھے اسقنی خمرًا!
ہوس کہے کہ حریفانہ کھینچ لے دامن
اگرچہ خلدِ نظر ہے بہارِ سرو و سمن
حصارِ دل ہے ہر اک ترکتاز سے ایمن
نگاہِ یاس فقط یہ تلاش کرتی ہے
کسی کے خال و خدِ دل نواز میں شاید
تمہارے حسن کا ہلکا سا عکس شامل ہو
یہ آبِ خضر کہاں، لمعۂ سراب کہاں!

ڈاکٹر سید صفدر حسین

شبِ انتظار

اندھیرا چھا چلا ہے روشنی کم ہوتی جاتی ہے
سیہ بختی مری گویا مجسم ہوتی جاتی ہے

تجلی آنکھ جھپکانے لگی روشن ستاروں میں
بٹی ہے دن کی دولت پارہ پارہ ماہ پاروں میں

مری نظروں میں وہ رنگیں شرارے رقص کرتے ہیں
کہ جن سے شاہدِ تخییل کے گیسو سنورتے ہیں

کسی وعدہ شکن کے عہد و پیماں یاد آتے ہیں
غلط انداز نظروں کے اشارے مسکراتے ہیں

کبھی ہونٹوں پہ اک رنگیں ترانہ جھوم جاتا ہے
کبھی آنکھوں میں اک بھولا فسانہ جھوم جاتا ہے

تبسم کی ادا یوں چھیڑ دیتی ہے رگِ جاں کو
چھوئے جس طرح سے پہلی کرن روحِ گلستاں کو

ہر اک جنبش پہ پردے کی نظر اپنی اٹھاتا ہوں
ذرا کچھ سوچ کر اس وہم پر پھر مسکراتا ہوں

ہر اک ہلکی سی آہٹ روح کو بےچین کرتی ہے
نگاہِ شوق دروازے پہ جا جا کر ٹھہرتی ہے

تبسم وقت کا اک تبصرہ کرتا ہے وعدوں پر
حقیقت طنز کرتی ہے محبت کے ارادوں پر

نہ رونق ہے ستاروں میں نہ کیفیت ہواؤں میں
سکوتِ شب کا اک گمبھیر سناٹا فضاؤں میں

بہ ایں حالت گراں رفتاریٔ لمحات گزرے گی
خداوندا! یونہی کیا آج کی بھی رات گزرے گی

ریاض انور

آوازوں کا بھنور

(مشرقی پاکستان کے بارے میں زیرِ تحریر طویل نظم کا ایک حصہ)

یہ موسم برشگال
شبِ وصال
گاتے ہوئے مستوں کے دلوں کی دھڑکن
سمن بروں، مہ وشوں، حسیناؤں کے
دلوں کے سکوں کا دشمن
گلی گلی مستیوں کا ڈیرا
نگر نگر قہقہوں کا مسکن
ہر ایک گوشۂ کشت مثلِ بہشت رشکِ ہزار گلشن
کنواریوں کے دلوں سے اُبھرے
لبوں سے چھلکے
وہ گیت جن پر نثار ہو چاندنی کا جوبن
دلوں میں چاہت کے دیپ ہونے لگے فروزاں
پیا سے ملنے کی آرزو پھر ہوئی غزل خواں
مچل رہے ہیں تڑپتی لہروں پہ شام کے سُرمئی اندھیرے
نثار ہوں جن کی دلکشی پر بہار کے عنبریں سویرے

ندی[1] کے سینے پہ جل اُٹھے ہیں چہار جانب چراغ کتنے
جُھکی گھٹاؤں کے زیرِ سایہ دہک رہے ہیں ایاغ کتنے
اُداس مانجھی غریب مانجھی دلوں میں صدیوں کا غم چھپائے
قدم قدم جن کے ساتھ چلتے ہیں موت کے بے قرار سائے
صبا کی رفتار سے اُڑے جا رہے ہیں اپنے گھروں کی جانب
کنارِ دریا بہ چشمِ پُرنم
پیا کی رہ تک رہی ہے برہن
ہے منتظر جس کے دل کا آنگن
کرے گا اپنے جوان ہاتھوں سے
آ کے کوئی چراغ روشن
ندی کے ساحل پہ ہانپتی سر پٹکتی موجوں کا شورِ پیہم
پھسل کے ہونٹوں سے آتشیں گیت، ہجر کا میت
تیرتا ہے گرجتے بادل کے دوش پر مثلِ نوحۂ غم

---

[1] بنگلا میں دریا کو ندی کہتے ہیں

لوٹ آؤ من موہن[۲]

تم کس دیس سدھارے

روؤں ندی کنارے

گھاٹ پہ بیٹھی راہ تکوں میں تیرا تو کب آئے

تجھ بن ساجن بے کل من اک پل بھی چین نہ پائے

دریا کی لہروں کے ساتھ یہ پاگل بہتا جائے

تم جیتے ہم ہارے

لوٹ آؤ من موہن

روؤں ندی کنارے

تم تو تھے میرے جیون کی ناؤ کے پتوار

کس نگری میں جا کے بسے ہو چھوڑ مجھے اس پار

دل دریا میں دُکھ کی لہریں اُٹھیں سو سو بار

ڈوب چلے ہیں تارے

لوٹ آؤ من موہن

روؤں ندی کنارے

کنواریاں شوخ ناریاں

رنگ رنگ کی ساریوں میں لپٹی

لجاتی شرماتی گنگناتی، قدم قدم خود ہی مسکراتی

حسین کھیتوں کی ٹیڑھی پگڈنڈیوں پہ ایسے رَواں دواں ہیں

فضا سے جیسے دَھنک اُتر کر زمیں پہ ہر سُو بکھر گئی ہو

کہیں کہیں رک کے دھان کی نرم کونپلوں کو وہ چومتی ہیں

کبھی کسی ناریل کے سائے میں بیٹھ کر چشم نیم وا سے

فضا میں بہتی ہوئی گھٹاؤں کو دلربائی سے دیکھتی ہیں

طویل زلفوں سیاہ چشموں کا سحر سارے میں پر فشاں ہے

گھنے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں بزم یاراں سجی ہوئی ہے

نفس نفس میں مسرتوں اور سکوں کی خوشبو بسی ہوئی ہے

کسی کے ہونٹوں پہ قہقہے ہیں کسی کے ہونٹوں پہ بنسری ہے

ہوا میں گیتوں کی گنگناہٹ فضا میں قوسِ قزح کھچی ہے

چھڑی ہوئی ہیں گئے زمانوں کی مہ لقاؤں کی داستانیں

دکھوں کے لمحوں، خوشی کی گھڑیوں حسیں گھٹاؤں کی داستانیں

جو قحط کی نذر ہو گئے اُن الم نصیبوں کی داستانیں

جو باد و باراں میں مر مٹے اُن غریب لوگوں کی داستانیں

کسی جگہ دَوڑ کشتیوں کی کہیں کبڈی کا شور برپا

کہیں مزاروں پہ جمگھٹے ہیں کہیں کوئی گائن[۳] محفل آرا

کہیں تو ہلکی سی پھوار جیسے ہوائیں ملہار گا رہی ہوں

کہیں گھٹا ٹوٹ کر برستی ہے جیسے آکاش پھٹ پڑا ہو

ہرے بھرے کنج، بہتے نوکے، بھکتے رنگ اور مچلتے دریا

لگا ہوا ہے فضا کے سایوں میں زندگی کا حسین میلہ

---

[۲] منگلا لوک گیت بھویا کا ترجمہ

[۳] دیہات میں بیت بازی کی محفلیں

احمد ہمیش

تھکن

گیانی جی! یہ تو بتلاؤ
تم اُن جبّادوں کی زنجیروں والے شہر میں رہ کے
سنگینوں والے شہر میں رہ کے
کون سی شُبھ گھڑیوں کے سپنے دیکھ رہے ہو!
دیکھو، اس دیوار کے پیچھے،
برسوں کی نفرت سے گھائل، پردے کی اَن جانی یادیں،
سرسوں جیسی زرد پڑی ہیں
گلیوں میں اب اندھیرا ہوا اور پانی کی چاہت کے کارن
بے بس اور ناکام اُمیدیں، ننگے پاؤں چلتے چلتے ہار گئی ہیں
ایسے میں اب گوتم بن کے زیادہ رُکنا ٹھیک نہیں ہے
گیانی جی! اب زیادہ رُکنا ٹھیک نہیں ہے
شاید اس رستے سے آگے
اپنی میلی رنگت جیسی شام نے پردے ڈال دیئے ہیں
آؤ، چلیں، اس شام کے پردے میں چھپ جائیں
شام، جو ہم دُکھیوں کی ماں ہے!!

قمر ساحری

لب بستہ

شب زدہ ذہن
وفادار غلاموں کی طرح
اپنے مسجود کے معبود کے احکام لئے
خنجر تیز لئے
زہر بھرے جام لئے
نغمہ و شعر کے غاروں پہ کھڑے ہیں کہ نہیں
شہر مہتاب پرستاں کی روایت کے خلاف
اُفق عہد رواں پر کوئی
صبح افروز ستارہ نہ دمکنے پائے
کوئی سورج نہ چمکنے پائے

وقار خلیل

سراب

سرابوں کا بہتا سمندر ہے دنیا
ہر اک جھیل دھوکا
ہر اک قطرۂ آب پُرفن
دہانے پہ سنگم کے مجبور ماہی
لئے اپنی پتوار تنہا، اکیلا
بنا نقشِ عبرت وہ کچھ سوچتا ہے۔
سرابوں کا بہتا سمندر ہے دنیا
کہ بس کے کنارے پہ آدم کا بیٹا
فریبِ مسلسل کی مورت کھڑا ہے
جو سیلاب آئے تو یہ کیا کرے گا
نہ لب بھیگتے ہیں نہ پُروائی چلتی۔
طلسمات نے چھین لی ہے بصیرت
حقائق اندھیرے کنویں میں ہیں لرزاں
سرابوں کا بہتا سمندر ہے دنیا

نثار ناسک

پتھر

کتنی روحوں کے اُفق سُونے ہیں
کوئی احساس کا سورج کوئی یادوں کا دھندلکا بھی نہیں
ایک بے نام سی ویران سی تنہائی ہے

کتنے ذہنوں کے چمکتے تارے
اپنے داغوں سے جلائے ہوئے
اپنے ہی پر و بال کی راکھ
اپنی آغوشِ تمنا میں لئے پھرتے ہیں

ان گِنت آنکھوں کے دیدار سے خالی کشکول
وقت کے آہنی قدموں کے تلے ٹوٹ گئے
اب کوئی لاکھ حسیں جلوؤں کی خیرات لئے
شہر در شہر پھرے
کوئی بھی آنکھ نہ پھیلائے گی اب دستِ سوال

کتنے معصوم سے دل ٹوٹ گئے، ہار گئے
کوئی افسانۂ ہجراں نہ کوئی وصل کی بات
پھول کو ہاتھ لگاؤ تو وہ پتھر نکلے
دشت کو پیرنا چاہو تو سمندر نکلے

بند کر لو گے جو آنکھیں تو گزر جاؤ گے
اور اک لمحہ بھی سوچو گے تو مر جاؤ گے

خالد ندیم

آمدِ خورشید

میرا کمرہ — مری تنہائی کا بے بس ساتھی
قید خانہ نہ سہی
حبس و زنداں نہ سہی
پھر بھی اک ایسا خرابہ ہے کہ لمحہ لمحہ
داستانِ غم امروز کو دہراتا ہے
دیکھتا ہے کہ یہاں جو بھی کوئی آتا ہے
چند لمحوں کے لئے آکے چلا جاتا ہے
کون سے لوگ ہیں وہ
جن کو نہیں
فرصتِ یک ساعت بھی
میز پر رکھی ہے
ٹیگور کی کہنہ تصویر
ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہی ہے سب کچھ
منتظر ہے کوئی سنگیت کی رانی آئے
قلبِ شاعر کے لئے پیار کی دھڑکن لائے

اور میں اپنے خیالات میں گم سم بیٹھا
سوچتا ہوں کسی "خورشید" کی تابانی سے
جگمگا جائیں گے اک روز یہ محراب، یہ طاق
اور تنہائی دبے پاؤں گذر جائے گی

طلعت اشارت

صحیفہ

بھول جانا تو گئے دور کا دشوار نہ تھا
ایک نادیدہ خلش آتی رہی سمجھانے
ریگ ماضی میں جھلستا رہا دل کا گلشن
پھول کھلتے رہے، ویرانے رہے ویرانے

خندۂ زیرلبی ہے غم پنہاں جیسے
گرمیٔ شدّتِ احساس سے جل جائے کوئی
اور اپنے ہی بنائے ہوئے معبود کے ہاتھ
اپنی ناکردہ گناہی کی سزا پائے کوئی

یہ خیال آتا ہے اب مجھ کو ترے نام کے ساتھ
چند حرفوں کا یہ مجموعہ صحیفہ تو نہیں

احمد رئیس

چاند!

کسی نے کہا
چاند اک پھول ہے
جو کھلتا ہے شب کی سیہ شاخ پر
کسی نے کہا
چاند اک دیپ ہے
جو جلتا ہے آکاش کے بام پر
کسی نے کہا
چاند اک داغ ہے
فضا کے لچکتے سبک جسم پر
کسی نے کہا
چاند اک زخم ہے
چاندنی پیپ ہے، زہر ہے
کسی نے کہا
چاند تو شہد کی جھیل ہے
دودھ کی نہر ہے

کسی نے کہا
چاند تو ایک ناکام عاشق کی تصویر ہے
کسی نے کہا
چاند تو میرے دلدار کا نقش ہے
مرے یار کا عکس ہے

اور جب مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا
میں بھکاری ہوں، میں کیا کہوں
چاند! میرے لئے
ایک روٹی ہے اور کچھ نہیں !!

صہبا لکھنوی

ایک لمحہ رُکو!

ایک لمحہ رُکو
ایک نغمہ سُنو!
زندگی صرف سیلِ رواں ہی نہیں
موجِ طوفاں بھی ہے
زندگی، زندگی کا نشاں ہی نہیں
مرگِ دوراں بھی ہے
دَور جو آئے گا
دَور جو مَر چکا
وقت، تاریخ، صدیاں، فلک بے نشاں، بے اماں، بے گماں
پھول، کانٹے، جنوں، رسمِ زنداں، شب، گلشن و دانہ و دام، برقِ تپاں
جبر کی داستاں
خونچکاں نوحہ خواں
ایک لمحہ رُکو
ایک نغمہ سنو!
زندگی جبرِ پیہم سہی دوستو! پھر بھی کتنی حسیں، کتنی ناز آفریں
کس سے پوچھوں کہ یہ رات بھاری ہے کیوں؟ آنکھ لگتی نہیں نیند آتی نہیں
کوئی آتا نہ ہو
ایک لمحہ رُکو!

کوثر چاندپوری

دوسرا رنگ

ٹریکٹر کی دھڑ دھڑاہٹ سے، دھرتی کے ساتھ دل بھی دہل گئے۔ گاؤں میں پہلی بار یہ آواز سُنی گئی تھی، عورتوں اور بچوں کی ٹولیاں ایک اونچی جگہ راستہ پر نگاہیں جمائے کھڑی تھیں، بچے بیچ میں سے منہ نکال کر جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے، بھولے پرشاد پجاری بیساکھی کے سہارے دھیرے دھیرے اسی طرف کو کھسک رہا تھا۔ یہ مندر میں اکیلا رہتا تھا۔ پرشاد کھاتے کھاتے خوب موٹا ہوگیا تھا۔ مگر پاؤں ٹوٹ جانے کی وجہ سے بیساکھی لگانے لگا تھا۔ بھولے پرشاد کے پاؤں اتنے نہیں چلتے تھے جتنا دماغ چلتا تھا۔ وہ گاؤں کی سیانی مشہور تھا۔

زمین اور آسمان کے درمیان دھوئیں کی پتلی سی لکیر کھنچ گئی، پھر وہ لکیر اوپر جاکر لہرائی معلوم ہوئی اس کے بعد مٹی بھی اور فوراً چھک چھک دھڑ دھڑ کی آوازیں پیڑوں اور اونچی نیچی پہاڑیوں میں ابھی اس طرح گونجتی رہیں جیسے کسی کو ہچکی یا چھینک آتے آتے رہ جاتی ہے ایک دم بہت سی چھوٹی بڑی انگلیاں اس سمت میں اٹھ گئیں انہیں میں ایک انگلی رانی کی تھی جو بالکل سفید تھی اس کے سرے پر چپٹا ناخن چمک رہا تھا، رانی کے کندھے سے کندھا ملائے اس کی لڑکی اوشا کھڑی تھی اس کی انگلی بھی اُدھر ہی کو اٹھی ہوئی تھی وہ سفید اور موٹی نہیں تھی سرخ اور بہت پتلی تھی دونوں میں گلاب اور مرجھانے ہوئے چنبیلی کے پھول کا سا فرق تھا

"ماپ رے باپ" بھولے پرشاد ہانپتے ہوئے بولا "اتنی انگلیاں تو کبھی چاند کی طرف بھی نہیں اٹھیں"..

"ٹریکٹر بھی چاند ہے اس نئی دنیا کا" ایک نوجوان بولا جو چھٹیوں میں یہاں آیا ہوا تھا اور کالج میں سائنس پڑھ رہا تھا۔

بھولے پرشاد نے کھا جانے والی نگاہوں سے نوجوان کو گھورا، اسے ان نوجوانوں سے خدا واسطے کا بیر تھا جو بل، بکھر چھوڑ کر شہر چلے گئے تھے۔

"چاند ایک ہے، نئی اور پرانی دنیا میں وہی چمکتا ہے" "بابا" نوجوان بولا "یہ بات نہیں، ہوائی جہاز، راکٹ اور زمین جوت کر اناج اگانے والی مشینیں ہماری اس نئی دنیا کا چاند ہیں جسے ہم اب بنا رہے ہیں۔

بھولے پرشاد نے بیساکھی زمین پر ڈال دی اور ایک چٹان پر بیٹھ کر لمبے لمبے سیدھے سانس لینے لگا اُسے یہ نئی اور پرانی دنیا کی بات بالکل نہ بھائی، اس نے جلدی سے سوچا بھلا نئی دنیا میں وہ کہاں ہوگا، اس کا یہ پرانا مندر اس پر جھکا ہوا پیپل کا یہ پیڑ ———— سنکھ، اور مورتی ———— ان سب چیزوں کی جگہ بھی ہوگی اس میں:

رانی کو دھوئیں کی لکیر نظر آرہی تھی مشین پر ابھی اس کی نگاہ نہیں جم سکی تھی۔ اوشا نے اس کا بازو ہلا کر کہا۔

"وہ آرہی ہے ماں!
ندی کے اس پار دیکھو۔
اب تو اور صاف دکھائی دے رہی ہے۔
اتنی بڑی چیز نہیں سوجھتی!"

"سوئی کا ناکا سوجھتا ہی نہیں دھاگہ تجھ سے ڈلواتی ہوں، مشین کہاں سے نظر آئے؟"

اوشا ہنس پڑی، کیا بات کہی ہے ماں نے کہاں سوئی کا ناکا اور کہاں اتنی بڑی، ہاتھی جیسی مشین، رانی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے دراصل اس نے مشین کو دیکھ لیا تھا، اس بھاری بھرکم مشین کو دیکھتے ہی اسے دولت رام کا پہاڑ سا ڈیل ڈول یاد آگیا تھا وہ سوچنے لگی تھی، اوشا کے پتا زندہ ہوتے تو یہ مشین کیوں آتی، کھیتوں میں کانس ہی پیدا نہ ہوتا، وہ کانس کے دشمن تھے، اس کی جڑیں تک اکھاڑ کر پھینک دیا کرتے تھے۔

رانی ادھیڑ عمر کی عورت تھی، سر کے بال سفید کم کالے زیادہ تھے گالوں میں جھریاں بھی نہ پڑی تھیں۔ آنکھوں میں اب بھی دیئے سے جھلملاتے تھے، وہ نو برس ادھر بیوہ ہوئی تھی، اس نے اپنے شوہر دولت رام کے مرتے ہی اس کی جگہ سنبھال لی تھی، وہ اسی انداز سے کھیتوں میں ہل چلا کر چنے اور گیہوں کے پودے اگا رہی تھی، جوار اور مکا کے فصل کی دیکھ بھال آپ ہی کرتی غلیل اور گوپھنی سے پتھر مار کر کوؤں، طوطوں اور دوسری چڑیوں کو دن بھر اڑاتی رہتی، رات کو مچان پر بیٹھ کر پیپا بجاتی اور زور زور سے چیختی، پھر بھی اسے جس وقت وہ سماں یاد آجاتا جب دولت رام ہل چلاتا تھا تو اس کی آنکھیں جھک جاتیں دولت بڑا کڑیل نوجوان تھا وہ ہل کی نوک اور بجھر کی تیز دھار سے دھرتی کی چھاتی چیر کر اس میں بیج ڈال دیا کرتا تھا اور جب ہلکے پیلے رنگ کی سوئیاں زمین سے پھوٹ پڑتیں تو انہیں دیکھ کر پھولا نہ سماتا اسی وقت سے اناج کی پیداوار کے تخمینے لگانے لگتا دیکھتے ہی دیکھتے پیلی سوئیاں ہری ہو جاتیں پھر دھیرے دھیرے اونچی ہونے لگتیں انکی پتیاں لمبی ہو جاتیں، ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکوں سے شرابیوں کی طرح جھومتیں، پھر ان میں بالیں نکل آتیں چیت لگتے ہی سورج کی تمازت سے کھیت سنہری ہو جاتے گرم ہوائیں بالیوں کو جھٹکے دیتیں تو ان میں دانے یوں بجتے سنائی دیتے جیسے بادلوں میں اولے گڑگڑانے لگتے ہیں، اولوں کی آواز سے کسانوں کے دل دھڑکنے لگتے ہیں اور دانوں کی آوازوں سے وہ پھول کی طرح کھل جاتے ہیں پک جانے پر دولت انہیں کاٹ کر کھلیان میں لاکھ کے ڈھیر لگا دیتا، بیل انہیں نوکیلے کھروں سے کچل کر باریک کر دیتے تب تیز دھوپ اور تیز ہواؤں میں اونچی جگہ کھڑے ہو کر ایک آدمی کچلی ہوئی لاکھ کو اوپر سے نیچے ڈالتا، اناج وہیں ڈھیر ہوتا جاتا بھوسا اڑ کر الگ اکٹھا ہوتا رہتا، رانی ان سارے مناظر کو برسوں دیکھتی رہی تھی اس وقت اسے یہ سب باتیں یاد آرہی تھیں۔ اسکی نگاہوں کے سامنے کا ہر منظر دھندلا گیا تھا۔ مگر یادوں کے نقوش جگنوؤں کی طرح چمک رہے تھے، دولت کی موٹی موٹی سخت باہیں اور بھرے بھرے بازو اسکی آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے اس کی وہ مضبوط انگلیاں دکھائی دے رہی تھیں جن میں ہنسیا تھام کر وہ ذرا سی دیر میں پودے کاٹ کر ایک جگہ اکٹھے کر دیتا تھا، اور کالی زمین استرے سے مونڈے ہوئے سر کی مانند کھل جایا کرتی تھی، رانی کی آنکھوں میں اب تک دولت ہی سمایا ہوا تھا کوئی مرد اس کی نگاہوں میں جچتا ہی نہ تھا، سب بونے دکھائی

پڑھتے تھے خود اس کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی لیکن یہ معیار اوشا کے راستہ میں ایک رکاوٹ بن گیا تھا اوشا جب تک چھوٹی تھی تو کوئی بات نہ تھی، اب وہ سیانی ہو چکی تھی، اس کے وجود پر خوشے پیدا ہو گئے تھے جن میں دانوں کی مانند امنگیں گدگدانے اور بجنے لگی تھیں اس نے اپنے دل میں مرد کا ایک تصور بھی قائم کر لیا تھا، جس کے نقش و نگار اپنی پسند کے بنائے تھے، مرد کا یہ مجسمہ اس طرح اس کے دل میں چھپا ہوا تھا جیسے مہک کلی میں پوشیدہ رہا کرتی ہے وہ مرد کیسا ہوگا، یہ بات کسی کو معلوم نہ تھی۔ البتہ سب جانتے تھے کہ اوشا کو وہی نوجوان پسند آ سکتا ہے جو گاؤں بھر میں سب سے اچھا، مضبوط اور لمبا تڑنگا ہو۔ اور کنوار کی دھوپ میں دھرتی کو ہل کی نوک سے اس طرح چیرتا چلا جائے جیسے سانپ پانی پر تیر رہا ہو گاؤں کی یہ لڑکی جیون ساتھی کے متعلق ایسے ہی تصورات میں الجھی رہتی ہے۔

"مشین وہ ہے ماں! ——— اوشا نے رانی کے کہنی مار کر ذرا جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

وہ پیڑوں کی اوٹ میں!۔

کھجوروں کے جھنڈ سے ذرا ادھر!"

"دیکھ رہی ہوں!" ——— رانی کی آواز رندھی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں آنسو تھے، گالوں پر نیر بہ رہا تھا۔

"رونے کیوں لگی ماں؟ ——— کیا ہوا؟؟"

اوشا نے رانی کو جھنجھوڑ ڈالا وہ رونے کی عادی نہیں تھی اوشا بیمار ہو جاتی تو بھی اس کی آنکھیں نہ بھیگتیں، اوشا کی نگاہیں مشین سے ہٹ کر رانی کے چہرے پر جم گئیں۔

"ماں! ——— میری ماں سچ بتا کیا ہوا۔؟"

"کچھ نہیں سوچتی ہوں تیرے پتا ہوتے تو یہ مشین کا ہے کو آتی یہاں، ان کے جیتے جی کھیتوں میں کانس کے ایک پودے کو بھی سر ابھارنے کی ہمت نہ ہوئی، وہ اور کسانوں کو بھی کام کرنے پر اکساتے رہتے تھے"

اوشا سنجیدہ ہو گئی، ادھر ٹریکٹر ندی پار کر کے رک گیا شاید کوئی پرزہ خراب یا ڈھیلا ہو گیا تھا، وہ سوچنے لگی ماں کو کبھی میرے باپ کی یاد نہ آئی، وہ اس طرح آج تک روتے نہیں دیکھی گئی آج مشین کو دیکھتے ہی وہ کیوں رو پڑی، پتاجی آج اس طرح یاد آ گئے جیسے ان کا سندیسہ لے کر آئی ہو یہ مشین، پھر وہ بھی خیالات کے جال بننے لگی، بہت اچھا ہوگا میرا باپ، پتاجی اتنے اچھے تھے جب ہی تو کوئی لڑکا ماں کی نگاہوں میں نہیں چڑھتا، آس پاس کے دیہات میں ایک سے ایک بڑا زمیندار اور کسان آباد ہے، سب کے پاس کھیت ہیں وہ کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں، عورتیں گاتی ہوئی ان کے پیچھے پیچھے چلتی رہتی ہیں، ایک آدمی مٹھیاں بھر کر اناج بکھیرتا جاتا ہے کٹنی کے وقت سیکڑوں مرد اور عورتیں ہنسے تھامے قطاریں بنا کر کھیتوں میں چلتے ہیں ان کے پیچھے کالی مٹی کی ننگی چھاتی ہوتی ہے اور آگے سنہری بالیاں ناچتی، جھومتی رہتی ہیں جیسے کہ رہی ہوں آؤ ہم اپنی جوانی تمہارے ہنسیوں کی دھار پر رکھنے کے لیے بے چین ہیں، جلدی آؤ دھرتی ماتا کے دودھ کی دھاریں دھوپ کی تیزی سے سوکھ نہ جائیں، ان کسانوں اور زمینداروں کے جوان لڑکے بھی ہیں۔

سندر کتنا اچھا لگتا ہے، وہ پڑھتا بھی ہے مگر کوئی پسند بھی آئے ماں کو، عورتیں کہتی ہیں رانی کو گھمنڈ ہے، وہ کیوں نہیں دیکھتی کہ اوشا گیہوں کے پودے کی مانند بڑھ رہی ہے وہ ان سکھی بالیوں کی طرح اپنی گردن ہنسیے کی دھار

پرکھ دینا چاہتی ہے۔

رگھوپتی ہی کو دیکھو اس کے کنویں پر رہٹ چلتا ہے اس کی گھوں، گھوں کی آوازیں دور تک بلکہ دھرتی سے آکاش تک میٹھے میٹھے راگ گھول دیتی ہیں، سارا جنگل تالوں سے گونج جاتا ہے، رگھوپتی کے گنوں کے کھیت میں سچ مچ سبز پریاں ناچتی رہتی ہیں اور گیہوں کے پودے شرابیوں کی مانند جھومتے ہیں۔

ماں کہتی ہے رگھوپتی کا بال بال قرض میں بندھا ہے، مگر وہ یہ بھی کہتی ہے کہ تیرے پتا پر بھی قرض تھا جب شادی ہوئی ہے وہ نام ہی کا دولت رام تھا، اور شاید یہ اس گھمنڈ ہی کا نتیجہ ہو کہ ہمارے کھیت کانس سے بھر گئے، اور کنوار کے مہینے میں جب کانس پھولتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بڑی سی جھیل ہو پیداوار گھٹ گئی ہے، ہل چلانا دوبھر ہو گیا ہے، مجبور ہو کر ماں نے بھی اس کاغذ پر نام لکھوا دیا تھا جو گاؤں والوں نے تحصیل میں بھیجا تھا، کئی دن سے کسان مشین ہی کی باتیں کر رہے ہیں ان کا خیال ہے کہ وہ کھیت صاف کر دیگی۔

ٹریکٹر نے پھر سیٹی دی وہ چل پڑا تھا پیروں تلے کی زمین ہل رہی تھی، جیسے اندر جوالا کھول رہی ہو۔

"ماں مت رو، میری ماں چپ ہو جا، میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے" اوشا نے رانی کو بچوں کی طرح بہلایا "مشین پھر چل پڑی ہے وہ دیکھو ماں دھواں اٹھ رہا ہے رات کو رجوالا اوپر بیٹھا کہہ رہا تھا ماں کہ وہ موٹر کی طرح کھیت میں دوڑتی ہے، اس کے پیچھے ہل لگے رہتے ہیں وہ دھرتی کو اتھل پتھل کر دیتے ہیں۔

اس میں دھواں نکلنے کی چمنی ہوتی ہے ایک آدمی آگے بیٹھ کر اس کا پہیہ گھماتا ہے۔"

"آدمی پہیہ گھماتا ہے!" —— رانی نے دوپٹہ سے آنسو پونچھتے ہوئے سوال کیا اور پھر خاموش ہو کر سوچنے لگی پہیہ گھمانے والا آدمی دولت رام کی طرح نہ ہوا، ویسا ہی بھاری بھرکم، موٹے موٹے بازوں والا، گول گول کلائیوں والا تو سچ کہتی ہوں کہ کھیت صاف نہ ہوں گے نہ پیداوار بڑھیگی۔

کیا سچ مچ مشین اسی طرح ہل چلا سکے گی جیسے اوشا کے پتا چلایا کرتے تھے۔

یہ سوال رانی کے ذہن میں اس وقت ابھرا جب ٹریکٹر کچھ اور آگے بڑھ آیا تھا، اس کا پیلے رنگ کا خول صاف دکھائی دینے لگا تھا لگ رہا تھا کہ ہاتھی پر پیلی جھول ڈال دی گئی ہے اور وہ سونڈ اٹھائے آگے کو سرک رہا ہے۔ اوشا دو قدم آگے بڑھ گئی گاؤں کی دوسری عورتیں اس سے کئی گز آگے تھیں، بچے ان سے بھی آگے نکل چکے تھے، بھوسے پرشاد بھی بھیا کمی سنبھال کر چلنے کو تیار ہو رہا تھا اب تک وہ رانی اور اوشا کو بہت غور سے دیکھتا رہا تھا اُسے یقین تھا آج یہ دونوں ضرور دیوی کی مورتی پر پرشاد چڑھانے مندر آئیں گی، گاؤں میں جب بھی کوئی نیا کام ہوتا ہے، مندر میں سنکھ ذرا زور سے بجنے لگتا ہے لوگ اسے سنکر چونک جاتے ہیں، ٹریکٹر قریب آچکا تھا اب وہ اتنی دور رہ گیا ہے کہ اس میں بیٹھے ہوئے آدمی بہت صاف نظر آ رہے تھے، اوشا کی آنکھیں چمک اٹھیں نہ جانے یہ چمک کیسی تھی، شاید اس کے من مندر میں بھی کسی نے سنکھ پھونک دیا تھا، وہ نگاہیں جمائے ٹریکٹر کو دیکھ رہی تھی

"اوشا —— ٹھیک تو ہے آدمی ہی چلا رہا ہے مشین کو سچ ہے آدمی کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا، مشین بھی وہی چلاتا ہے اور زمین بھی وہی جوتتا ہے، آدمی ہر چیز کی جان ہے"

اوشا بھی شاید ماں کے دل میں یہ کوئی ہوک اٹھی وہ پھر نہ رو پڑے، اوشا کا جی چاہ رہا تھا وہ خوب ہنسے مگر یہ اچھا نہ لگتا تھا کہیں رونے اور ہنسنے بات تو جب ہے کہ دونوں ہنسیں،

اگلے دن رانی ہی کے کھیت میں مشین نے ہل چلایا وہی کل والا نوجوان خاکی کپڑے پہنے آگے بیٹھا پہیہ گھما رہا تھا، دیکھنے میں وہ اور سب کی طرح تھا پھر بھی اس میں کوئی ایسی بات ضرور تھی۔ جو اسے سب سے الگ کئے دے رہی تھی، مشین کھیت میں دوڑ رہی تھی، دھرتی کے پرت پیاز کے چھلکوں کی مانند الٹ رہے تھے کانس جگہ جگہ اوندھے پڑا تھا، رانی غور سے پہیہ گھمانے والے نوجوان کو دیکھ رہی تھی دولت رام جس کام کو گھنٹہ بھر میں کرتا تھا وہ اسے منٹوں میں کر رہا تھا اسکی آنکھوں میں غرور چھلک رہا تھا جیسے کوئی دیوتا ہو، رانی نے مٹی کو ہاتھوں میں اٹھا کر دیکھا پھر سونگھا اس میں ویسی باس نہ تھی جیسی دولت رام کی جوتی ہوئی مٹی میں آیا کرتی تھی۔

بہت گہرا ہل لگایا ہے اس نے!

یہ دولت رام سے بھی بڑا ہے!

اس کے آگے اور سنا کے پیا بہت چھوٹے لگ رہے ہیں پھر وہ بولی۔

"کچھ بھی ہو، مشین کا پہیہ گاڑی سا لگتا ہے، ہم تو جب جانے بغیر پہیوں کی مشین بنا لیتا۔ کوئی"

دوپہر کو ٹریکٹر کھیت ہی میں کھڑا کر دیا گیا اور سب لوگ کھانا کھا کر بوڑھے پیڑ کی چھاؤں میں لیٹ گئے۔ رانی گھر چلی آئی، ٹریکٹر رات کو بھی کھیت ہی رہا، رانی رات بھر اس نوجوان اور دولت رام کے دھیان میں رہی، وہ ان کا مقابلہ کرتی رہی نوجوان کا نام عجب سنگھ تھا وہ تھا بھی بہت عجیب، رانی کے خیالات کی وسیع دنیا میں عجب سنگھ اور دولت رام دونوں طاقت آزمائی کرتے رہے، مشین اس ہل سے ٹکراتی رہی جس میں مریل سے بیل جڑے ہوئے تھے ——— آخر میں ہار دولت رام کی ہوئی وہ جھینپ گیا، اور عجب سنگھ کی آنکھیں چمک اٹھیں وہ فتح کے نشہ میں جھومنے لگا۔

ہفتہ بھر کے اندر ہی عجب سنگھ نے گاؤں کے سارے کھیت جوت ڈالے، کانس جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جن کسانوں کی زمین برسوں سے پڑتی پڑی تھی عجب سنگھ نے اسے بھی جوت ڈالا اور اس میں اس سال چنا بونے کا مشورہ دیا، تھوڑی سی زمین رانی کے پاس بھی ایسی ہی تھی جو نہ جانے کب سے بنجر پڑی تھی، اس میں شاید کبھی ہل چلا ہی نہ تھا، کسانوں کا کہنا تھا اس میں ہل چلانا بیلوں کے بس کا نہیں عجب سنگھ نے آخر میں اُسے بھی توڑ ڈالا، رانی اس دن کھیت ہی پر رہی اور شاستری تھی ٹریکٹر کھیت کی ایک مینڈھ سے دوسری مینڈھ تک دوڑتا چلا جاتا عجب سنگھ اپنی جگہ بیٹھا پہیہ گھمائے جا رہا تھا۔ زمین کے پرت کتاب کے ورقوں کی طرح الٹ رہے تھے، جھاڑیاں اکھڑتی جا رہی تھیں، تحصیل کا ایک منشی بھی وہاں موجود تھا عجب سنگھ ٹریکٹر روک کر اس کے پاس آیا تو منشی نے ایک شاعرانہ بات کہی۔

"خوب آدمی ہو عجب سنگھ، تم نے کھیت کو اس طرح صاف کر دیا جیسے میرا استاد غزل کو کانٹ چھانٹ کر درست کر دیتا ہے، سچ کہتا ہوں جس طرح غلط الفاظ اور لولے لنگڑے محاورے غزل کا عیب ہیں اسی طرح کانس، اور یہ جھاڑ جھنکاڑ زمین کے عیوب میں داخل ہیں، خراب شعر پر داد نہیں ملتی، اور بیکار زمین کے اندر غلہ پیدا نہیں ہوتا"

عجب سنگھ نے قہقہہ لگایا، اور بالوں کی گرہ درست کرتے ہوئے بولا۔

"چراغ دین اتو گجل (غزل) کہتا ہے ہم ٹریکٹر ہانکتے ہیں بول ایمان سے کون اچھا کام کرتا ہے یاد رکھ میرا ٹریکٹر ہمیشہ چلتا رہے گا تیری گجل جلد ہی تھک جائے گی۔"

"تو پیٹ پالتا ہے میں لفظوں میں روح کو گرماتا ہوں، تہذیب اور کلچر جب تک چل رہے ہیں غزل بھی ٹریکٹر کے ساتھ دوڑتی رہے گی"

رانی اور ادشا منشی کی باتیں پر ہنستی رہیں رانی بغیر سمجھے ہنستی رہی اوشا سمجھ کر، وہ اسکول میں برسوں پڑھتی رہی تھی، رانی

نے عجب سنگھ کو اچھی طرح دیکھا، پہلے دن وہ بہت کالا دکھائی پڑا تھا پھر سانولا گیا تھا مگر آج، ـــــــ آج تو وہ بہت گورا اچھا معلوم ہو رہا تھا، اس کا جی چاہا عجب سنگھ کے ان ہاتھوں کو چوم لے جن سے وہ پہیہ گھماتا ہے، لوٹتے وقت اس نے پیچھے مڑکر کہا ـ

"کتنا اچھا ہے عجب سنگھ!"

"سچ، ہاں وہ بہت اچھا ہے ـ"

اوشا مسکرانا چاہتی تھی لیکن تبسم کی لہر ہونٹوں پر جم کر رہ گئی، آنکھوں میں ضرور چمک آگئی،

رانی پھر سوچ میں پڑ گئی، میں نے ایسی بات کیوں کہہ دی نہ جانے عجب سنگھ کا چال چلن کیسا ہے، پتہ نہیں اس کا بیاہ ہو چکا ہے یا نہیں،

چال چلن کیسا بھی ہو، وہ خود بہت اچھا ہے دھرتی کو لوہے سے چیر کر اس سے سونا اگلواتا ہے ـ

وہ یہیں رہ جاتا تو کتنا اچھا ہوتا ـ

اس رات کو عجب سنگھ اور منشی چراغ دین نے کھانا رانی کے گھر ہی کھایا، گاؤں والوں نے گانے گائے وہ خوب ناچے، عجب سنگھ خوب قہقہے لگاتا رہا آخر میں چراغ دین نے غزل سنائی پھر بولا ـ

"یہ کلچر ہے سردار! تہذیب کی جان!

تو تہذیب کا پہنا ہوا کوٹ ہے اور میں کلچر کا وہ ریشمین بنیان ہوں جو تہذیب کے بدن پر چپکا رہتا ہے، آنکھ کبھی نہیں تھک سکتی"

عجب سنگھ چپ رہا اُسے چراغ دین کی غزل سے بڑا آرام ملا تھا اس کے دل میں پہلی مرتبہ یہ تمنا پیدا ہوئی تھی کہ اسی گاؤں میں رہ پڑے ـــــــ اگر وہ کھیتی کرنے لگے تو کیا زندگی آرام سے نہ گزرے،

رانی اور اوشا عورتوں کے ہجوم میں آخر تک بیٹھی رہیں جو عجب سنگھ کی مشین دوسرے گاؤں میں جانے والی تھی سب چاہتے تھے کہ اسی طرح گاتے ناچتے صبح ہو جائے، ایک سن چلے نے تجویز پیش کی کہ رات تھوڑی ہی رہ گئی ہے ذرا عورتوں کا ناچ گانا بھی ہو جائے عورتیں آسانی سے تیار ہو گئیں پہلے بال بچوں والیوں نے گیت گائے، ایک ٹولی ناچتی رہی پھر کنواریوں کی باری آئی ان میں اوشا سب سے آگے تھی وہ ذرا نہ شرمائی، دیر تک ڈھولک کی تال پر گائی اور تھرکتی رہی، رانی اس کا گانا سنکر حیران رہ گئی، اس نے اسکول میں اتنا اچھا ناچ سیکھ لیا ہے، رانی کو اس کا پتہ آج ہی چلا،

عجب سنگھ نے گاؤں چھوڑنے میں جلدی نہیں کی وہ ٹریکٹر کے پرزے صاف کرتا رہا اس کا یہاں سے جانے کو بالکل جی نہیں چاہتا تھا لیکن مجبور تھا، دن ڈھلے وہ ٹریکٹر میں بیٹھ کر چلا گیا، اور گاؤں میں نہ جانے کب تک بسنت رت چھائی رہی، ٹریکٹر کے رنگ لہراتے رہے،

اس سال اساڑھ خوب برسا رانی نے جوار اور مکئی بوئی، کھیتوں میں دانے پھوٹ نکلے، جہاں دھان بونے تھے وہاں دھانوں کی پود لگائی گئی، گاؤں میں ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی، گیہوں کی زمینیں بڑی محنت سے کمائی گئی تھیں، ساون گئے ہی اوشا نے برگد میں جھولا ڈالا، لڑکیوں نے بڑے جوش کے ساتھ ساون کی لمبی جھڑیوں میں گیت گائے، راکھی بندھن کے تہوار پر رانی شہر گئی معلوم نہیں وہ عجب سنگھ سے ملی یا نہیں، مگر برسات بیتتے ہی وہ اس ارادے سے گاؤں آگیا کہ عمر بھر یہیں رہے گا اس نے ایک بہت بڑا کھیت خرید لیا اس کا خیال تھا وہ کنوئیں پر انجن لگا کر گنوں کی کاشت کرے گا، وہ رانی کے یہاں ٹھہرا ـ

رانی اس کے خیال سے بالکل متفق تھی، اس نے اپنے کنویں پر انجن لگانے کی اجازت دیدی۔

ایک دن راجو نے الاؤ پر آگ تاپتے ہوئے کہا۔

"اوشا کا بیاہ عجب سنگھ سے ہوگا۔"

بھولے پرشاد پجاری بھی وہیں بیٹھا تھا وہ بولا۔

"نہیں رنگ دوسرا ہے۔"

"کیا؟"

راجو نے سوال کیا

پجاری جواب میں صرف ہنس دیا

سب کو خیال ہوا کہ عجب سنگھ رانی کے اشارے ہی سے آیا ہے، کسانوں کے وہ نوجوان بیٹے جو شہر میں پڑھ رہے تھے، یا گھروں پر موجود رہ کر کھیتی باڑی کے کام کرنے لگے تھے مایوس ہو گئے۔ اب تک وہ اوشا کو بیوی بنانے کے چھوٹے سپنے دیکھتے رہے تھے، اور جب پجاری کا بتایا ہوا دوسرا رنگ سامنے آیا تو گاؤں بھر میں سنسنی پھیل گئی، اور ایک دن بھولے پجاری نے صاف کہہ دیا۔

"عجب سنگھ، دولت رام کی جگہ لے رہا ہے۔"

ایسا نہیں ہو سکتا۔

ایسا نہیں ہونا چاہئے۔"

سب نے ایک زبان ہو کر کہا۔

اسی دن شام کو عجب سنگھ نے اوشا کو دیکھا وہ پنگھٹ سے آرہی تھی، سر پر دو گگرے تھے وہ عجب سنگھ کے قریب سے گزر گئی مگر اُسے دیکھا نہیں، عجب سنگھ نے دیکھا، اوشا کے سر پر رکھے ہوئے گگروں سے تیز چلنے کے باوجود پانی کی بوند بھی نہیں چھلکی مگر اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں ان سے پانی بہہ رہا تھا عجب سنگھ اُسے دیکھتا رہا، یہاں تک کہ وہ گاؤں کے کچے جھونپڑوں میں کھو گئی۔

صبح کو عجب سنگھ گاؤں سے غائب تھا وہ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا، رانی چولہے کے سامنے بیٹھی رو رہی تھی۔ لکڑیوں سے دھواں اٹھ رہا تھا، اس کے مرغولوں میں گھرا عجب سنگھ کا چہرہ بالکل سیاہ دکھائی دے رہا تھا، اوشا اپنے پلنگ پر پڑی تھی اور ماں کو روتا دیکھ کر آپ ہی آپ ہنس رہی تھی، اسکی نگاہوں میں عجب سنگھ آج اور زیادہ حسین ہو گیا تھا، اسوقت وہ بالکل نہیں سوچ رہی تھی کہ ماں کے رونے کے وقت اُسے ہنسنا نہیں چاہئے۔

شکیلہ اختر

آشا

بدحواس دوڑتی ہوئی جب وہ چلتی ٹرین کے پائیدان پر باہر والے راڈ کو پکڑ کر جھولنے لگی، اور زنانے ڈبے کی عورتوں کے ساتھ میں نے بھی باہر پلیٹ فارم پر ہاں ہاں کا شور سن کر باہر پائیدان پر سامنے لٹکی ہوئی لڑکی کو اندر کھینچ لیا، تب بھی اس کا یہی حال تھا۔ ایسے ہی سوکھے مارے اڑتے ہوئے بال، بدرنگ سا بلوز، مَلی دَلی اُونچی نیچی اڑسی ہوئی ساڑی، جس کے کنارے پر گرد اور مٹی کے گوٹے لگے ہوئے تھے۔ گھِسا پٹا میلا سا ہوائی چپل پہنے وہ ایک معمولی سا کپڑے کا بیگ تھامے لمبی لمبی سانس کھینچتی دَم سے میرے پاس آکر سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ اُس کے چہرے کی سیاہی گھبراہٹ اور خوف سے دَمک اٹھی تھی، اور رخساروں کی اُبھری ہوئی ہڈیاں پسینے کی تری سے اور بھی نمایاں لگ رہی تھیں اس کی جلدی جلدی جھپکنے والی آنکھوں سے اس کی دلی پریشانی اور اداسی کا صاف اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے کمپارٹمنٹ پر ایک جھلکتی ہوئی نظر ڈالی اور معافی مانگنے والے انداز اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں بڑی شرمندہ ہوں۔ کیا کروں ابھی ابھی میری ماں کی سیریس بیماری کا تار آگیا تھا۔ میں پل پر سے دوڑتی ہوئی تو اتری تھی مگر پھر بھی گاڑی چل چکی تھی۔"

ایسی اجاڑ صورت، اور پریشان حال لڑکی سے پہلے پہل میری ملاقات ریل پر ہوئی تھی! اپنی پریشانیوں کے باوجود بہت جلدی ہم لوگوں سے گھل مل گئی تھی۔ مگر ہماری ہمدردانہ نگاہ کے ہوتے ہوئے بھی اس کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو ہمیشہ اس کی یاد دلا سکتی۔

زندگی کے ہر موڑ پر ویسے تو حسین، خوبصورت، کامینی، بھدی، بدصورت اور بھیانک شکلیں نگاہوں سے گذرتی رہتی ہیں مگر اس سیاہ رنگ اور ابھری ہوئی ہڈیوں والی صورت میں اس کے چمکتے ہوئے ہموار سفید دانتوں میں بڑی کشش تھی، اس کے لہجے میں افسردگی اور بیچارگی کے ساتھ بڑی اپنائیت کے بول تھے۔ "ستنے، اچھے بول کہ جب میں اپنا سفر ختم کرکے ٹرین سے اترنے لگی تو اس کے بڑھے ہوئے سیاہ پرخلوص ہاتھ کو تھام کر مجھے اس سے یہ وعدہ لینا پڑا کہ اپنی ماں کے اچھے ہو جانے کے بعد واپسی پر وہ ضرور میرے گھر آئے گی۔ میں نے اپنے گھر کا پتہ اور نشان اس کو اچھی طرح سے سمجھا دیا تھا۔

فون کی گھنٹی بجتی رہی۔ دن بھر ایسی طرح سے ٹرنگ ٹرنگ کرکے وہ بجتی رہتی تھی میں نے اکتا کر جب ریسیور اٹھایا تو آواز پہچان نہ سکی۔

"دیدی — میں ہوں! میں آشا بول رہی ہوں۔ ابھی آپ کے اسٹیشن پر اتر کر یہیں سے بول رہی ہوں"—

آشا! — اس نام کی کسی لڑکی کی کوئی یاد میری نگاہوں میں نہ جھلکی — اور ادھر وہ بڑے پیار سے کہے جا رہی تھی۔

"دیدی۔ میں آپ کے گھر آ رہی ہوں — آپ ابھی گھر پر رہیں گی نا —!"

جانے یہ کون سی آشا کہاں سے ٹپک پڑی تھی۔ میں نے ریسیور رکھ کر بہت سوچا! کہ یہ آشا کون ہو سکتی ہے مگر اس نام پر سے کوئی پردہ اٹھتا ہوا نظر نہ آیا۔

"یہ آشا جو بھی ہو اب تو اس کو دیکھ کر ہی پتہ چلے گا!" میں نے اپنے آپ کو آنے والی گھڑیوں کے سپرد کر دیا۔

کھڑکھڑاتا ہوا رکشا جب پورٹیکو میں آ کر کھڑا ہوا اور کئی دنوں کے پہنے ہوئے میلے مسلائے میلے کپڑے پہنے ایک کالی سی۔ و کھے بالوں والی لڑکی اتر کر مجھ سے بے اختیار چمٹ گئی۔ تب میں نے جانا کہ یہ آشا وہی بیل والی لڑکی تھی۔

آج اس کی کالی رنگت میں خوشیوں کی مہک پھوٹ رہی تھی، اور سفید پر کشش دانتوں کی قطار بار بار ہنسنے میں جھلک پڑتی تھی۔

آشا نے بڑے پیار و حیرت سے میرے گھر کو دیکھا۔

"اے دیدی! تیرے تو بڑے ٹھاٹ ہیں میں تو تجھے اپنے جیسی سمجھتی تھی، یہی چھوٹے سے گھر اور سڑک پر چلنے والی!"

اس کی اس سادہ سی باتوں کو سن کر میں ہنس پڑی "تو اگر تمہیں میرے گھر کا پتہ ہوتا تو پھر تم مجھ سے ملنے نہ آتیں!"

میں نے اس کی پھیلی ہوئی آنکھوں کو تکتے ہوئے کہا۔

وہ ہنسی۔

"آتی کیوں نہیں — ضرور آتی — مگر ذرا کچھ ٹھاٹ باٹ سے کپڑے و پڑے بدل کر آتی — مگر دیدی! مجھے یہ سب بڑے گھر مت لگے نہیں۔ جس دن ذرا اُجلے صاف ستھرے کپڑے پہنتی ہوں ہائے۔ بندھا بندھا سا جی لگتا ہے۔ جب تک میں پھیل کر بیٹھ ہی نہیں سکتی۔ تو پڑھنے میں بھلا خاک مزا ملے گا؟"

وہ بڑے پیار اور خلوص سے کئی دنوں تک میرے پاس ٹھہری، گھر کے احاطے اور پھولوں کے کنج میں وہ میرے ساتھ ساتھ رہتی۔ لیکن جب سے وہ آئی تھی میرے ننھے ننھے بچے آشا کے ڈر کے مارے مجھ سے دور دور رہنے لگے تھے۔ آشا بڑے شوق سے ان کو پیار کرنے جاتی، ان کو بھاگتے ہوئے پکڑنے کی کوشش کرتی، مگر بچے اس کی کالی اجاڑ صورت سے اتنے خوف زدہ تھے کہ اس کو دیکھتے ہی چیخیں مار کر بھاگ جاتے اس وقت میں کٹ کر رہ جاتی۔ اور یہی دعا کرتی کہ بے چاری آشا بچوں کے خوف کی وجہ نہ سمجھے۔

آشا بڑے شوق اور محبت سے اپنے جیجا جی سے ملتی، مسکرا مسکرا کر ہنستی اور مذاق کرتی ان کو پھولوں سے مارتی اور پھر اس امید میں رہتی کہ اس کے جیجا جی بھی اسی ناٹک اور پیار سے اس کو اپنی سالی بنائیں۔ میں آشا کے اس پیار اور سادگی کو دیکھ کر سوچنے لگتی تھی، مجھے اس، اس طرح کھل کر ہنستے مسکراتے اور اپنی تمناؤں کا اظہار کرتے دیکھ کر محسوس ہوتا کہ یہ بیچاری لڑکی جیسے مدتوں سے پیاسی ہے، اپنائیت اور محبت کی بھوکی ہے۔ نہیں تو پھر یہ چند ہی دنوں میں ہمیں اپنا نہ سمجھ بیٹھتی مگر اس

کے بجائے ——— اور اس کے جیجا جی مجھے چپکے سے کہتے کہ "تم نے میری سزا کے لئے یہ لڑکی کہاں سے حاصل کی ہے"۔

وہ اپنے آپ سے بڑی بے پرواہ تھی، بہت بدذوق اگر کبھی استری کے کپڑے پہن بھی لئے تو وہ زمین ہی پر پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتی اس کے بیگ کے اندر کچھ تھا بھی نہیں، دو جوڑے معمولی کپڑوں کے تھے ایک ٹوٹی سی کنگھی تھی اور چند موٹی موٹی کتابیں میرے سنگار میز کے پاس سے وہ اس طرح گزر جاتی جیسے زندگی کے لئے وہ ایک بیکار سی چیز تھی۔ اس کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ وہ کپڑوں سے صرف جسم کو ڈھانک لینا ہی جانتی ہے۔ الجھی ہوئی بے ہنگم ساری کے کناروں میں ہمیشہ مٹی پٹی رہتی تھی ——— اس کو اپنا ہوش ہی نہ رہتا تھا۔ اس کے سر کے بال روکھے بے رونق سے ہر گھڑی اس کے چہرے پر لوٹتے رہتے تھے۔

جس پیار و محبت سے آشا میرے پاس ٹھہری تھی اسی خلوص سے جانے کے وقت اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔

"دیدی ۔۔ تمہارے انہی ہاتھوں نے مجھے ریل پر مرنے سے بچایا تھا ۔ ۔ تو پھر اب یہ ہاتھ مجھے ہمیشہ یاد رکھیں گے نا"؟ جاتے جاتے جب اس نے مجھ کو اپنا پتہ لکھ کر دیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ تو تھرڈ ایر میڈیکل کالج کی اسٹوڈنٹ تھی ——— اور میں سوچتی رہ گئی تھی کہ ایسی اللہ کی ماری صورت والی یہ لڑکی اب ڈاکٹر ہو جائے گی! ——— اور مجھے اس خیال سے بڑی خوشی محسوس ہونے لگی تھی کہ وہ اپنی بدصورتی کے باوجود ایک اہم شخصیت بن جائے گی۔ مگر اس کے انداز سے اس کے کسی انداز سے ابھی تک اس میں آنے والی بڑائی کا احساس نہ ہوتا تھا۔

آشا جب چلی گئی تو سارے گھر پر ایک اداسی چھا گئی تھی کیونکہ وہ مہمان ہوتے ہوئے بھی گھر کے ہر حصے میں چلتی پھرتی رہتی تھی۔ میز پر وہ اپنے سامنے کھانا لگواتی ——— باورچی خانے میں دوڑ دوڑ کر جاتی اور وقت بے وقت اپنے ہاتھوں سے چائے بنا بنا کر لے آتی۔ جب سے وہ میرے پاس آ کر ٹھہری تھی مجھے آپا کہنے لگی تھی ——— اور چھوٹی بہن کے ناطے ہر کام اپنے ہاتھ سے کرنا اس کو بڑا اچھا لگتا تھا۔

مہینوں بیت گئے۔ اور دیکھی ہوئی فلم کی طرح آشا کی یاد بھی میرے ذہن میں دھندلی سی باقی رہ گئی تھی۔

سردیوں کے دن تھے گھر سے میرے بھائی بہن اور کچھ اور لوگ آ گئے تھے ——— گھر کے اندر کی رونق سے جب طبیعت اکتا گئی تو پکنک، آؤٹنگ اور شکار کا پروگرام بنا۔ رسٹ ہاؤس اور سرکٹ ہاؤس ریزرو کرائے گئے، پک اپ، جیپ اور کاروں پر بستروں، بکسوں، اور کھانے پینے کے سامانوں سے لدے لدائے ہم سب لوگ گھر سے چلے گئے۔ بچوں کی ٹولیاں بڑی خوش تھیں۔ اور ان کی تعداد پونے سو تھی۔ اسٹیشن ویگن کی لمبی لمبی دونوں سیٹیں بچوں سے بھر گئیں۔ تب آیا، اور ملازموں کو بستروں کے ڈھیر پر بٹھانا پڑا۔ چالیس میل کا لمبا راستہ۔ آٹھ بچوں نے پہلے تو انگلش پوئٹری خالص انگریزی دھنوں میں گایا، پھر اردو گانوں کا مقابلہ شروع ہوا اور جب ہار جیت کے بغیر ختم ہو گیا تو پھر سب مل کر ایک ساتھ کورس میں فلمی گانے گانے لگے۔ ایسی ہی دوڑ دھوپ میں میرے سب سے چھوٹے بچے کو ٹھنڈ لگ گئی۔ اور میں بڑی پریشانی کے عالم میں سب کو چھوڑ چھاڑ کر بیمار بچے کو لے کر اپنے سب سے بڑے شہر راج گڑھ کے میڈیکل کالج ہوسپٹل کے ایک کیبن میں داخل ہو گئی ——— سارا مزا بچے کی اس بیماری نے کرکرا کر دیا تھا۔ کہاں تو سانبھر اور ہرنوں کا شکار کھیلا جا رہا تھا۔ اور اب میں کہاں ہوسپٹل میں ایسی بدحواس پڑی تھی ——— بچے کی بیماری اور تکلیف اتنی بڑھ گئی تھی کہ دل کو ذرا سکون نہ ملتا تھا۔ اور کبھی کبھی تو راتیں جاگ کر گزارنی پڑتی تھیں۔

دم بھر کے لئے میری آنکھیں جھپکی نہیں کہ مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے مجھے اچھی طرح کمبل سے ڈھانک دیا ہے۔ کمبل کی گرمی سے آرام پاکر بخار میں کڑی پڑی کتنی دیر تک سوتی رہی۔ جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ آشا بچے پر جھکی ہوئی اس کو دوا پلا رہی تھی میں بے اختیار بول پڑی۔

"ارے آشا تم ۔ ! — یہ تم کہاں سے آگئیں۔"

آشا نے بڑی شکوہ بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"آپا تم نے مجھے خبر تک نہ کی۔ وہ تو ابھی میں اس وارڈ سے گزر رہی تھی کہ تمہاری آیا پر نظر پڑ گئی۔ اگر تم مجھے بلا لیتیں تو مجھے کتنی خوشی ہوتی آپا۔

"اور تم جو یہ بن بلائے چلی آئیں مجھے کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ میں نے آشا کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔ اور پھر آشا بڑی محبت سے میرے بچے کی خدمت میں لگ گئی۔

آشا جب کبھی سفید ایپرن پہنے ہوئے ڈاکٹر لڑکیوں کی ٹولی میں ہوتی تو وہ دور ہی سے اپنے الجھے اور بے رونق بالوں سے پہچان لی جاتی تھی کالج کے اندر اس کے ڈھنگ ذرا نہ بدلے تھے۔ ویسے ہی لٹی پٹی سی ساری پہنے وہ لڑکیوں کے جھرمٹ میں نظر آتی تھی۔ کبھی کبھی دوپہر کو اپنی ڈیوٹی ختم کرکے وہ آجاتی تھی۔ اور روزانہ رات کو وہ بڑی پابندی سے میرے پاس آجاتی اور ساری رات بچے کی دیکھ بھال خود سے کرتی اور اس کا سارا کام اپنے ذمہ لے لیتی تھی۔

وہ اتنی بے تکلف اور بے پرواہ تھی کہ اس کے ساتھ رکھ رکھاؤ کرنے سے اس کو تکلیف ہوتی اور وہ قاعدے اور تہذیب کے پھندے میں پھنسنے سے بری طرح گھبرایا کرتی تھی۔ بچے کی حالت جب تک پریشان کن تھی آشا کو کھانے پینے تک کا ہوش نہ تھا۔ بچہ جب خطرے سے باہر ہوگیا تب آشا کے چہرے پر ہنسی آنے لگی تھی۔

میری چھوٹی بہن بچے کی بیماری کی خبر سن کر ہوسٹل میں آگئی تھی آشا جب اس سے ملی تو خوشی سے جھوم اٹھی اور اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے سارے وارڈ دکھاتی پھرتی۔ پھر میرے پاس واپس آکر اپنی بے کیف آنکھوں میں شراب بھر کر میری چھوٹی بہن سے کہتی۔ دیکھتی ہو۔ ہاں! آپا سے کچھ نہ کہنا — اور اپنے سیاہ لبوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتی پھر آپ ہی آپ کھلکھلا کر ہنس پڑتی — "آپا یہ ننھی ہے نا بس اسے میڈیکل میں ڈال دے۔ پھر آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ بڑا ٹھیک لگتا ہے اسے۔"

جب کبھی آشا ہنسنے لگتی، تو میں بڑے شوق سے اس کے پیلے دانت کو دیکھتی ہوئی سوچا کرتی کہ اگر فطرت اس غریب کو سفید ہموار سے دانت بھی بخش دیتی تو اس کے پاس کیا رہ جاتا۔ ؟ —

آشا کی صورت جیسی بھی تھی لیکن پیچھے سے جاتے ہوئے دیکھنے میں اس کا قد بڑا اچھا لگتا تھا۔ اس کی صورت اور رنگ کا کوئی سایہ اس کی پشت پر پڑتا ہوا نظر نہ آتا، نکلتا ہوا قد، اور بھرا ہوا جسم۔ یہی دو چیزیں ایسی تھیں جو اس کی شخصیت کو ابھار دیتی تھیں۔ جب کبھی مجھے آشا کی پرخلوص خدمت اور محبت پر بے اختیار پیار آجاتا تو میرا جی یہی چاہتا کہ وہ صرف ہنستی رہے تاکہ میری آنکھیں اس کے سفید سچے موتی جیسے دانتوں کو دیکھتی رہیں! یا پھر واپس جاتے ہوئے میں اس کو دیکھ کر یہ سوچوں کہ آشا کتنی پیاری۔ کتنی ٹوٹ کر محبت کرنے والی دولت ہے"

لیکن آشا کی صورت جب میری نگاہوں کے سامنے ہوتی اور وہ اپنی چار آنکھوں کو جلدی جلدی جھپکا کر مجھ سے باتیں کرتی رہتی تو مجھے اس پر بے حد رحم آجاتا تھا۔ ایسا رحم، جیسے اندھے فقیروں کو دیکھ کر خود بخود دل کے اندر ایک ابال کی صورت میں پیدا ہوجاتا ہے۔

برآمدے میں اپنے ساتھ لائی ہوئی بدرنگ سی چیک کی چادر پر لیٹی لیٹی آشا جب کبھی مجھ سے بہت قریب ہوجاتی اور میں

اس کی سانس کو اپنے چہرے سے ٹکراتا ہوا محسوس کرنے لگتی تب ایسا لگتا تھا کہ آپ ہی آپ آشا پگھلتی جا رہی ہے۔

"آپا - میں نے گھر کا سکھ کبھی نہ دیکھا۔ بچپن میں شاید ماں باپ نے مجھے دور رکھا تھا۔ جب بھی میری پہلی یاد جاگتی ہے تو مجھے کونونٹ کا وہی حصہ یاد آتا ہے جہاں غریب بچے بورڈنگ کے لیے لیے کپڑے پہنے ہوئے پڑھائے جاتے ہیں۔ اب بھی اس اسکول کی مدر سپیرئر مجھے بہت پیار کرتی ہیں جس رات آپ کے بچے کو بہت تیز بخار تھا اور ہوسپٹل میں کہیں برف نہ ملا تھا تو میں اتنی رات کو بیگ کونونٹ چلی گئی تھی۔ بے چاری مدر نے خود سے اٹھ کر اپنی فرج میں سے مجھ کو برف نکال کر دیا تھا۔

"اتنی بارش اور آندھی میں تم وہاں چلی گئی تھیں۔؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کوئی بات نہیں آپا رکشے پر تو گئی تھی۔"

آشا کے خلوص میں اتنی سپردگی تھی جیسے یہ لڑکی برسوں سے اپنی راہ کی تلاش میں بھٹک رہی ہو ---- مگر جس کے سامنے نہ تو راستہ ہی تھا اور نہ کوئی منزل۔

اور اب ریل کے پائیدان پر جھولتی ہوئی لڑکی کو جس ہاتھ نے وقتی طور پر ایک سہارا دیکر خطرے سے بچایا تھا اسی ہاتھ کو آشا اپنا سب کچھ سمجھنے لگی تھی۔ مگر یہ سہارے ایسے تو نہ تھے جو زندگی کی بنیاد بنتے اور اس پر تمناؤں کی تعمیر ہو سکتی۔

جب کبھی میرے کیبن میں ڈاکٹر لڑکے اور ڈاکٹر لڑکیاں آجاتیں اور اگر کہیں اس وقت وہ بے ڈھنگی چال سے چلتی ہوئی آجاتی تو اس کا چہرہ اداس ہو جاتا۔ وہ دبی دبی سی کنارے کھڑی رہتی۔ اور ان ڈاکٹروں کی ہنسی اور قہقہوں کے درمیان مجھ کو الجھی نگاہوں سے تکتی رہتی ایسی حالت میں اسے دیکھ کر مجھے اس پر بڑا ترس آجاتا تھا ---- شاید اس کو اپنی کم مائیگی کا احساس تھا۔ یا دوسری ڈاکٹر لڑکیوں کے سامنے اپنی بدصورتی اور بے ڈھنگے کپڑوں کی کھٹک اس کو ستانے لگتی تھی۔

مگر جب وہ اکیلی ہوتی تو ہمیشہ کی طرح بے پروا اور اپنے حال میں مست رہتی۔ کوئی پرچھائیں تک اس کی نگاہ میں تیرتی نظر نہ آتی تھی ---- !!

نگی کو آشا کے بڑھتے ہوئے خلوص کے ساتھ بے ہنگم باتوں اس کے اوٹ پٹانگ کپڑوں اور اس کی بدحالت سے بڑی شکایت تھی۔

"کس بے وقوف نے اس گندی لڑکی کو میڈیکل کالج میں بھیج دیا ہے۔ ہائے یہ کس ڈھنگ سے رہتی ہے" اور نگی پھر مجھ پر ناراض ہونے لگتی۔

"اپنی چہیتی دوست کو کبھی گت سے رہنا بھی نہیں سکھاتیں! کٹ کے رہ جاتی ہوں اسے دیکھ کر ساری کے کناروں میں نہ جانے کہاں سے اتنے اتنے کیچڑ لگا کر آتی ہے۔ اور اس کے ساتھ شوق ہے کہ میرے ہی ساتھ لگ کر بیٹھے گی، میرے ہی بستر پر لیٹے گی۔ ہو نہ ہو جانے آپا یہ کباڑ کہاں سے اٹھا کر لائی ہیں میرے لئے ---- اللہ قسم۔ اس کا بلوز تو ایسا مہکتا ہے جیسے مرا ہوا چوہا! کم سے کم اس کے سر میں کبھی تیل ہی ڈال دیتیں۔ یہ بھی کوئی محبت ہے کہ اسے اس حال میں دیکھتی ہیں۔ اور کسی کرم کی ماری بھی نہیں ----" نگی پھر آپ ہی آپ ہنس پڑتی ---- اور اس پر یہ خیال ہے کہ اسی کالج کے دو دو لڑکے اس سے محبت کرتے ہیں۔ اندھے ہوں گے وہ جبھی تو سجھائی نہیں دیتا۔" پہلی بار نگی کی یہ باتیں سن کر میں چونک پڑی۔

بچاری آشا ---- اپنے کو بہلانے کی خاطر اس نے یہ کھلونے خود ہی گھڑے ہوں گے ---- اور کھلونوں میں کون نہیں کھیلتا اندھے لنگڑے لولے سب ہی کے اپنے جذبات ہوتے ہیں اور بچارے کھلونے ان کی اپنی زبان ہی کہاں ہوتی ہے جو اس طرح سے

کھیلنے والوں کے ہاتھ جھٹک دیا کریں۔

ایک رات آشا ذرا دیر سے آئی —— وہ آتے ہی پچھے پر جھکی اور مجھے سوتا ہوا دیکھ کر برآمدے کی زمین پر اپنی چادر بچھا کر چپکے سے لیٹ گئی —— شاید اس نے مجھے سوتا ہوا سمجھ لیا تھا۔ کمرے کے اندر لائٹ جلتی ہوئی رہ گئی تھی اس کی روشنی میں میں نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو مجھے بڑا افسوس ہوا —— شاید وہ اس لئے سست تھی کہ یہاں کسی کو اس کا انتظار نہیں تھا۔ نگی جان بوجھ کر اپنے بستر پر اس کے آنے سے پہلے اس طرح پھیل کر سو جاتی تھی کہ آشا کی محبت سے محفوظ رہ سکے۔ میرا جی ننھانا۔ صرف میری خاطر وہ اپنے کاموں اور اپنی ڈیوٹی سے تھک کر آتی اور ایک پالتو کتے کی طرح میری چوکھٹ سے لگ کر اتنے پیار سے سو جاتی تھی۔

میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آج بڑی چپ چپ سی ہو آشا۔؟"

"اتنا سنتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ "کبھی کبھی میں اپنے آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں آپا —— مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے دیکھوں۔ اب تک میں نے اپنی زندگی میں جھانک کر دیکھا ہے تو یہی نظر آیا ہے کہ میرا باپ ایک غریب آدمی ہے اس کی تینوں لڑکیاں بیاہی جا چکی ہیں اور اس کی دوسری بیوی بے حد نفرت کرنے والی عورت ہے میرے باپ کو اپنی غریبی دور کرنے کے لئے ایک بیٹے کی بہت تمنا تھی۔' بھگوان نے جب بیٹا نہ دیا تو وہ بے چارے اپنا پیٹ کاٹ کر مجھی کو ڈاکٹری پڑھا رہے ہیں، لیکن ماں میری پڑھائی سے بہت ناراض ہے! کبھی کبھی تو وہ مجھ کو دیکھنا تک پسند نہیں کرتی۔ لیکن مجھ کو اس سے محبت ہے۔ کیونکہ وہ میری دوسری ماں ہے اور میرے باپ کی بیوی۔ مگر آپا۔ جب میں اپنا بچپنا یاد کرتی ہوں، تو کوئی گھر اور اپنا بنایا ہوا کوئی گھروندا مجھے کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ہر طرف سسٹر مدر اور اسکول کے احاطے کے سوا اور کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد جیسے اندھیرے میں باپو کی صورت ابھرتی ہے —— جو کبھی کبھی تھوڑی سی مٹھائی لے کر مجھ سے ملنے کو آجاتے تھے —— اور بہت دنوں کے بعد جن کو میں اپنا باپ سمجھنے لگی تھی۔ یہ سب کیا تھا آپا۔؟ —— کیا ماں کے مرنے کے بعد مجھے غریب بچوں کے اسکول میں ڈال دیا گیا تھا۔؟!"

آشا بڑے دکھ سے اپنے گزرے ہوئے دنوں کو یاد کرتی اور ایسا لگتا تھا کہ اپنی زندگی پر پڑا ہوا کوئی دبیز پردہ اٹھانے کو اس کا جی بے چین ہے۔

میں نے اس کے الجھے ہوئے بالوں کو تھپک کر تسکین دی۔ "پگلی پچھلی باتوں کو چھوڑ اب آنے والی گھڑیوں میں مجھے یہ بتا کر اپنے دونوں ڈاکٹروں میں سے کس کو چاہتی ہے۔؟"

"ارے آپا۔" کہہ کر اس نے ہلکی ہلکی آتی ہوئی روشنی میں شرما کر اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیا تھا۔

"اب میں ماروں گی اس نگی کی بچی کو۔" وہ ہنس کر بولی۔

اس کے چہرے پر آیا ہوا رنگ اندھیرے میں اگرچہ میں دیکھ نہ سکی تھی مگر اس کی آواز میں ایک　　اور لہک کا صاف پتہ چل رہا تھا —— اور اب آشا کا موڈ بدل چکا تھا۔

"اچھا اب مجھے بتا نگر یہ قصہ کیا ہے۔؟"

آشا پہلے تو نئی دلہن کی طرح شرمائی شرمائی سی چپ رہی۔ پھر اس کی آنکھیں ٹمٹمانے لگیں اور اس کی آواز میں رسیلے پن کا احساس ابھرنے لگا۔

"میرا ایک کلاس فیلو ہے وجے میں کلاس میں جہاں بھی بیٹھوں گی وہ مجھ ہی کو دیکھتا رہے گا —— اتنی ساری خوبصورت لڑکیوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ جب کتاب مانگے گا تو مجھ ہی سے مانگے گا۔ میں بھلا ایک معمولی، سیدھی سادھی سی لڑکی۔ کون سی بات

ہے مجھ میں پر نجانے کیوں اس نے کہی بات۔ راستے میں چلتے چلتے مجھ سے کہا ہے کہ آشا جی مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ مگر آپا ابھی تک اس کی کوئی بات نہیں سنی۔ بڑے مزے میں اس کے پاس سے گزر جاتی ہوں اور وہ بیچارہ نروس سا ہو جاتا ہے ایک اور فائنل ایر کا لڑکا ہے۔ موہن بری طرح سے میرے پیچھے پڑا ہوا ہے، دو ایک بار تو اس نے کاغذ کی پتیاں بنا بنا کر میری طرف پھینکی ہیں۔ ایک دن مجھے ایک لڑکی نے مجھے بتایا کہ موہن تم سے پیار کرتا ہے۔ مجھے یہ سن کر بڑا غصہ آیا، اگر اسے پریم کرنا ہے تو ڈھنگ سے کرے یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ پریم پتر لکھ کر کاغذ کی گولیاں بنائیں اور میری طرف پھینک دیا۔! — جہاں کسی لڑکی کو دیکھا اور راستے میں کھڑے لمبی لمبی سانسیں لے رہے ہیں — میں نے ایک بار بڑی کڑی نگاہ سے دیکھ کر پوچھا، — موہن جی — کیا بات ہے، کچھ کہنا چاہتے ہیں آپ مجھ سے —! بس میری تو اتنی سی بات سن کر وہ گھبرا گیا — پھر سنا کہ ساری رات وہ روتا رہا!" آشا لیٹی لیٹی اٹھ کر بیٹھ گئی! — "میں نے پرسوں نگی کو دکھا دیا تھا" — موہن کی ڈیوٹی اسی طرف کے وارڈ میں ہے! نگی کہنے لگی —" یہ تو چار لگتا ہے تم دونوں سے شادی کرنا ہے" آشا کھل کھلا کر ہنس پڑی — اور میں یہ سوچنے لگی کہ یہ کیسی لڑکی ہے جو قبر کے اس احساس پر بھی اپنی طرف کوئی دھیان نہیں دیتی — بھلا اس بے ڈھنگے پن میں وہ ہے اور موہن کو اس کی کون سی کو ملتا اور من موہنی ادا بھا گئی تھی، جب سے میں نے اس کی زبانی سے اس کی محبت کے قصے سنے تھے اس کو ایک عجیب و غریب لڑکی سمجھنے لگی تھی۔ انسان بھی کیسی کیسی فطرت لے کر آتا ہے۔ کسی کو برفی بھی نہیں لگتی اور وہ گڑ کی مکھی بھنکتے ہوئے بتاشوں پر جان دینے لگتا ہے۔ شاید اگر ایسی باتیں انسانوں میں نہ ہوتیں تو بے چارے ان گڑ کے بتاشوں اور ہماری آشا کا کیا حشر ہوتا۔!

ادھر نگی کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا کہ آشا کے بلاؤز کی سلائی جو جگہ جگہ سے ادھڑی رہتی ہے تو وہی پھٹا بلاؤز پہن کر اس نے کا رخ کیسے بنایا جاتا ہے، آخر وہ اپنے کو کیا سمجھتی ہے —! پتھر —! باریک دیوار —! دوسری دوسری نگی اور میری دوسری رشتہ دار لڑکیوں کو یہ تھی کہ آشا بار بار انھیں ہوسٹل میں لے جا کر اتنے کھانے کیوں کھلاتی رہتی ہے!! ڈھیری منع لو نے ہوتے ہوئے بھی وہ خود سے انڈوں سے آملیٹ بنا کر لے آتی اور زبردستی کر کر کے کھلاتی اور نگی کا کہنا تھا کہ انہی پیسوں سے اگر وہ اپنا بلاؤز بنا لیتی تو کتنا اچھا ہوتا —!

جتنے دنوں تک ہوسپٹل میں رہ کر جب میں گھر واپس جانے لگی تو آشا بڑی اداس ہو گئی — ہوسپٹل کی آخری رات وہ بہت دیر تک جاگ کر گزارتی رہی تھی۔

آشا جب افسردہ ہو جاتی تو اس کے چہرے کا رنگ اور بھی سیاہ پڑ جاتا تھا۔ اور ہنسنے بغیر سفید چمکیلے دانتوں کی خوبصورتی کی جو ایک ہلکی سی کرن دمک اٹھتی تھی، اس کا کہیں پتہ نہ ملتا تھا — اس وقت ملی دلی ساری اور بکھرے ہوئے بالوں کے بیچ سے جوڑے — نہ کرتی اس کو کبھی ایک ڈاکٹر لڑکی سمجھ بھی نہ سکتا تھا۔

میں اپنے بچے کو تندرست لے کر خوشی خوشی کیبن سے نکل کر جب احاطے میں کھڑی ہوئی موٹر میں بیٹھنے لگی تو آشا موٹر کا گیٹ کھول کر نیچے پر جھکی ہوئی اسے دیکھنے لگی تو اس کی آنکھوں میں بھرے ہوئے سارے آنسو ایک ہی بار بھر بھرا کر بچے کے چہرے پر اور اس کی فراک پر گر پڑے موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے جو سلکن فراک پر جذب ہوئے بغیر سچے موتیوں کی طرح دمک رہے تھے۔

میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور بے اختیار میرا جی چاہا کہ اس کی سونی کلائی کو چوم لوں، پھر میں جھجک کر رہ گئی۔ میرے پیار کی گرمی شاید اس کو اور بھی بے چین بنا دیتی میں نے اس کے بھیگے ہوئے گال کو ہلکے سے چھوا، گاڑی اسٹارٹ

ہو چلی تھی اس نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ کے لئے اٹھایا اور اپنی آنسوؤں بھری آنکھیں مجھ سے چھپاتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی
گاڑی جب احاطے کے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی تو میں نے پلٹ کر آشا کو دیکھا۔ چپ سی کھڑی بڑی حسرت سے گاڑی کی طرف دیکھ
رہی تھی۔ آشا کے پیار بھرے خط آتے رہے۔ دیوالی، عید اور کرسمس پر وہ رنگین اور مسرت بھرے کارڈ بھیجتی رہی۔ پورا
ایک سال میں اس کی طرف سے مطمئن رہی، کبھی میں اس کو چھٹیوں میں اپنے پاس بلاتی اور کبھی وہ اپنی پڑھائی کی مشغولیت پیش
کر کے مجھ کو ملنے بنا کر ہوسپٹل آنے کو لکھتی

پھر مجھے کسی سے یہ خبر ملی کہ فائنل ایئر میں وہ بے حد پریشان ہے پڑھائی کے ساتھ اس آخری سال میں اس کے ساتھ
کئی طرح کے خرچ بھی نکل آئے تھے۔ پھر ایک بار یہ معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہو کر اسٹوڈنٹ کیبن میں پڑی ہوئی ہے۔ ان ہی چکروں میں
اس کا خط بہت کم آنے لگا تھا۔ اور آہستہ آہستہ پھر اس کا خط آنا یکدم سے بند ہو گیا۔ اس کو کئی خط لکھے، مگر کوئی جواب
نہ آیا۔ میں نے سمجھا کہ آخری سال کی پڑھائی بڑی جان لیوا ہوتی ہے جب اس کا امتحان ختم ہو جائے گا تو خود ہی مجھے خط لکھے گی اس
کے بعد میں اس کے امتحان اور اس کے رزلٹ کا انتظار کرنا بھی بھول گئی۔ کبھی کبھار ہوسپٹل کا نام سن کر آشا کی اک یاد آجاتی
تھی — ؛

پھر مہینوں اور سال بیت گئے۔ آشا کی کوئی خبر نہ ملی اور اتنے عرصہ میں آشا کو مزید ڈھونڈ نکالتی۔ آشا کا خلوص اس
کی محبت اور اس کا پیار جب مجھے یاد آجاتا تو بے اختیار اس سے ملنے کو جی چاہتا تھا۔ اس کے الجھے ہوئے بالوں کو ڈھنگ سے
سنوارنے کی خواہش ہوتی اور پھر مجھے ایک پچھتاوا سا ہونے لگتا کہ اس اجڑی اجڑی سی ویران لڑکی کی اندھیری زندگی میں میں
نے خوشیوں کے چراغ جلانے کی کبھی کوشش کیوں نہ کی۔ اور رفتہ رفتہ آشا کا ایک دھندلا سا یاد جا کر رہ گیا۔
دراصل میری تمنا اتنے دنوں کے بعد پوری ہوئی اور ہم لوگ تبدیل ہو کر راج گڑھ کے اس شہر میں آگئے جہاں کبھی آشا
تھی۔ گھر کی الجھنوں سے جب کبھی فرصت ملی تو میں نے ہوسپٹل میں فون کر کے آشا کا پتہ پوچھا — مگر کوئی خبر نہ ملی۔ کئی ملنے
جلنے والوں سے بھی تلاش کرایا، ایک بار خود بھی ہوسپٹل گئی مگر ہر بار یہی خبر ملتی رہی کہ تھوڑے دنوں تک فیملی وارڈ میں ہاؤس
سرجن رہ کر وہ کہیں باہر پریکٹس کرنے چلی گئی ہے۔ اب میں اس کو کہاں ڈھونڈتی۔ اس کے گھر کا پتہ مجھ کو معلوم نہ تھا —
جب کبھی میں کسی ڈاکٹر لڑکی کو دیکھتی تو مجھے آشا ضرور یاد آجاتی تھی۔ اس طرف چند دنوں سے دو بڑی پیاری صورت والی
ڈاکٹر لڑکیاں میرے گھر آنے لگی تھیں۔ ان کو امریکہ جانے کے لئے کسی گورنمنٹ آفیسر کی مدد سے سرٹیفکیٹ اور پاسپورٹ
حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔ وہ لڑکیاں دبی دبی شرمائی مگر شگفتہ سی آتیں۔ ان کے خوبصورت کپڑوں، نئے نئے
اسٹائل کے جوڑوں اور خوبصورت چپلوں کو دیکھ کر میں بڑے درد کے ساتھ آشا کو یاد کرتی۔ آخر ایک دن میں نے ان ڈاکٹر
لڑکیوں سے آشا کا تذکرہ کیا، جو اتنی بے لوث محبت کرنے والی اور بڑی غریب سی لڑکی تھی۔

موہنی نے اپنی بڑی بڑی مدھ ماتی آنکھوں کو اوپر اٹھا کر مجھ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

میں اسے جانتی ہوں وہ ہماری سینئر رہ چکی تھی، بچاری کے پاس پیسے نہ ہوتے۔ جب بھی دوست لڑکیوں کو ہوسٹل
لا لا کر کھانے کھلاتی، اور کئی دنوں تک خود بھوکی رہ کر اس کے فاضل پیسے پورے کرتی تھی۔

دوسری لڑکی نرلیش بیچ ہی میں بول اٹھی — وہ بڑی عجیب سی لڑکی تھی! آشا بھی۔ کوئی اس کو دیکھ کر کبھی ڈاکٹر
نہیں سمجھتا تھا۔ کتنی دفعہ خود اس کے مریض اس کو ڈانٹ دیا کرتے تھے — مگر وہ ذرا بھی برا نہ مانتی۔ ہمیشہ ہنس کر ٹال

دیتی" نرٹش ذرا سکی۔۔ بیچاری آشا نے فائنل ایر میں بڑے دکھ سہے تھے، اس کے پاس میڈیکل کی پوری کتابیں بھی نہ تھیں ادھر ادھر سے مانگ کر پڑھ لیا کرتی۔ اسی لئے فرسٹ اگزام میں وہ ایک سبجکٹ میں فیل ہو گئی تھی۔ پھر چھ مہینے کے بعد سپلی میں نکل آئی۔ ان دنوں اس کو پیسوں کی بڑی کمی ہو گئی تھی۔ اس کے روپے تک بیچاری بڑی مشکلوں سے ادا کرتی اس زمانے میں اس کے گھر سے بھی بہت کم پیسے آنے لگے تھے۔ اور اس پر سے کسی نے یہ الٹی سیدھی باتیں اسے سمجھا دی تھیں کہ اب تک جس گھر کو اپنا گھر سمجھتی آئی تھی وہ اس کا اپنا نہیں تھا۔ وہ دراصل وہ کونونٹ میں پلنے والی یتیم بچی تھی جس کو ایک بہت ہی معمولی حیثیت کے آدمی نے اس لئے گود لے لیا تھا کہ پڑھا لکھا کر اس سے بیٹے کی کمی پوری کرے گا۔ اور شاید کوئی شک اس کے دل میں پہلے ہی سے تھی۔ اسی لئے اس نے بہت جلد ہی ان ساری باتوں پر یقین کر لیا تھا۔ اور جب اچانک اس نے اپنے آپ کو اس دنیا میں بے سہارا اور تنہا محسوس کیا تو وہ اپنے آپ سے بیزار رہنے لگی اور ہر کسی سے ملنا جلنا تک چھوڑ بیٹھی تھی"

موہنی کہنے لگی ۔۔۔ آشا کالج کے دنوں میں ہمیشہ بے گت رہی۔ جیسے اس کو اپنے سر پیر کا بھی ہوش نہ رہتا تھا وہ اپنے کالج کے اندر اور باہر سارے لڑکوں کے درمیان ایسی بے پروائی سے چلتی پھرتی رہتی جیسے اس کی بدصورتی نے اس کو سارے مردوں سے نڈر بنا دیا تھا۔ اپنے آپ کو ایک لڑکی سمجھتے ہوئے کبھی اس میں کسی طرح کی جھجک پیدا نہیں ہوئی۔ آخر دنوں میں اس کی ایک عجیب حالت ہو گئی تھی جیسے اسکو ہسٹریا سا ہو گیا ہو۔ ہر تھوڑے دنوں پر وہ اسٹاف کیبن میں داخل ہو جاتی۔ کبھی اس کے پیروں میں درد کی تڑپ تڑپا ہٹ ہونے لگتی کبھی کمر درد اور پیٹھ میں اینٹھن سی ہونے لگتی۔ اور پھر وہ اس کے بعد بدحواس ہو کر ہسپتال میں داخل ہو جاتی۔ کسی ڈاکٹر کو اس کے مرض کا پتہ نہ چلا۔ مگر ہوسٹل اور اس کی ساتھی ڈاکٹر لڑکیاں کہنے لگی تھیں کہ آشا کے پاس جب کھانے کے پیسے نہیں ہوتے تب وہ بیماری کا بہانہ کر کے مفت کھانے کی خاطر ہوسپٹل میں داخل ہو جاتی ہے۔ پھر نہ جانے آشا کہاں چلی گئی" اور ان ساری باتوں کو سن کر میری آنکھوں سے اچانک آنسوؤں کے چند قطرے بے اختیار ٹپک پڑے۔

رام لعل

شیرازہ

نئی سڑک پہ بنے ہوئے ایک مکان کے دروازے پر کیلے کے پتے اور رنگ برنگی جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ اندر سے زور زور سے منتر اُچارن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ آواز بھی مختلف آوازوں کا مرکب تھی لیکن معلوم ایک ہی شخص کی ہوتی تھی۔ جیسے بہت ہی گمبھیر ہو، بہت ہی بوڑھا ہو، بہت ہی جذباتی بھی ہو۔

جو ٹیکسی اس سہ منزلہ مکان کے سامنے آ کر رکی اس میں سے چار آدمی نکلے۔ ایک پینتالیس برس کا خوش پوش مرد، اس کی بیوی بھرے بھرے جسم کی اور اُن کے نو عمر بچے ——— لڑکا اور لڑکی ——— وہ سب مکان کی دلکشی سے مسحور ہو کر رہ گئے۔ چند لمحوں تک سر اُٹھائے، کھڑے دیکھتے رہے۔

ان سے ذرا فاصلے پر چھوٹے چھوٹے کئی بچے آئس کریم والے کو گھیرے کھڑے تھے۔ انہوں نے ان لوگوں کو دیکھا تو بھاگتے ہوئے آ پہنچے ———

"انکل انکل!"

"آنٹی!"

"ہیلو بنٹی! ہیلو شوشو!"

ٹیٹو، ٹکی، ممی، گوگی، ڈوم، بلا، پپلی، راجا اور ——— نہ جانے کتنے سارے نام ایک ساتھ بھی اور ایک ایک کر کے بھی پکارے گئے۔ اور اُسی وقت سیڑھیوں پر سے بھی دو اور بچے کودتے ہوئے نیچے آئے۔ شور بڑھ گیا۔ شور سن کر ہی اندر سے کچھ مرد اور عورتیں باہر نکل آئیں۔ انہیں دیکھ کر سب خوشی سے چلا اُٹھے۔

"آپ لوگ کس گاڑی سے آئے؟"

"ہم تو مایوس ہو چکے تھے!"

"جب گاڑی کا وقت نکل گیا تو پتا جی پہلے تو بہت ناراض ہوئے پھر ——— رونے بھی لگے!"

"پتا جی کہاں ہیں؟"

"اندر ہون کرا رہے ہیں!"

"میں نے تار بھی تو دیا تھا! انہیں ملا؟ گاڑی چھوٹ گئی تو بڑی مشکل سے ایک پلین میں جگہ حاصل کر کے پہونچے۔ منوہر تم کب آئے؟"

"کل رات"

"اور تم مدن؟"

"آج ہی صبح جی ٹی سے۔ ناگ پور سے آتے ہوئے راستے میں اٹارسی جنکشن پر مجھے نند کمار بھی مل گیا۔ چلئے چلئے، اندر چلئے۔ ہمارے خیال میں سب مہمان آ چکے ہیں۔"

چاروں بھائی ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔ چودھری صاحب کا آہوتی والا ہاتھ رک گیا۔ انہوں نے چونک کر دیکھا۔ پھر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پروہت نے بھی منتروں کا اچارن روک لیا۔ ہون کنڈ کے آس پاس جتنے لوگ تھے وہ سب بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

دیر سے پہنچنے والے چودھری صاحب کے سب سے بڑے پتر نے باپ کے چرن چھوئے۔ پھر اس نے ان سب لوگوں کو پرنام کیا جو اس کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ چند منٹ کے لئے جیسے سب کچھ رک سا گیا لیکن پھر سب کچھ جاری بھی ہو گیا۔ ملی جلی آوازوں کا منتر اچارن، آہوتی اور کنڈ کے اندر چھوٹی چھوٹی، سوکھی اور خوشبودار لکڑیوں کے گھی اور سامگری کے ساتھ مل کر جلنے کی چڑچڑ کی آواز۔

تت سوتر ورے نیم بھرگو دے وس دہی مہی

چودھری نے اگنی کنڈ میں چمچہ بھر گھی ڈالا، اور پھر ایک ہاتھ کی پشت سے پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ کر اپنے بیٹوں کی طرف دیکھا جو ان کے سامنے ایک قطار میں سر جھکائے ہاتھوں میں سامگری اٹھائے بیٹھے تھے۔

پھر اچانک ہی چودھری کے قریب ان کے دو پوتے آ کر بیٹھ گئے۔ دادا نے انہیں شفقت سے اپنے گھٹنوں کے قریب کر لیا۔ چاہتے تھے سر جھکا کر باری باری سے دونوں کے سر کو چوم لیں لیکن پروہت کی سواہا کی گرج نے انہیں چونکا دیا اور انہوں نے جلدی سے گھی سے لبالب بھرا ہوا چمچہ آگ میں گرا دیا۔

لوہے کا چھوٹا سا تپتا ہوا ہون کنڈ آگ کے شعلوں سے بھر گیا تھا۔ اب شعلے لوہے کی دیواروں سے ابھر ابھر کر اونچا اٹھنا چاہتے تھے۔

ایک گھنٹے کی مدت میں ہون کی سماپتی ہو سکی۔ اس عرصے میں چودھری نے کئی بار بے چینی سے پہلو بدلا تھا لیکن اب ان کے چہرے پر ایک مسرت آمیز طمینان کی جھلک تھی۔ وہ اپنی سفید گھنی مونچھوں کو ہاتھ کی پشت سے سہلاتے ہوئے ان لوگوں کی طرف بہت خوش ہو کر دیکھ رہے تھے جو مکان کی تعمیر پر پسندیدگی کا اظہار کر رہے تھے۔

ہون کے بعد بڑے کمرے میں چائے کا اہتمام تھا۔ سب مہمانوں کو وہیں لے جایا گیا۔ جو لوگ دیر سے پہنچے تھے وہ مکان کے ہر ایک کمرے میں جا کر اس کے در و دیوار کو دیکھ رہے تھے۔ موزیک کا فرش، بلجیم کے دھندلے شیشوں کی لمبی کھڑکیاں، شیشم کے جدید طرز کے دروازے سیڑھیوں پر سفید سیمنٹ کی جالی کا اسکرین ــــــ ان لوگوں میں چودھری کا بڑا بیٹا بھی شامل تھا جس کے سامنے لوگ اس کے باپ کی محبت اور محنت کی سراہنا کر رہے تھے۔ چودھری ان سب کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ سر جھکائے ہوئے، ایک ایک قدم بڑی احتیاط، فخر اور اطمینان سے اٹھاتے ہوئے۔

ان کی بیوی ایک الگ کمرے میں اپنی بہوؤں اور لڑکیوں میں گھری بیٹھی تھی۔ اپنے ایک پوتے کو گود میں تھپکتی ہوئی سب پر بار بار یہ بات واضح کر رہی تھی کہ اتنا بڑا مکان چودھری صاحب کی تنہا کوششوں سے بنا ہے۔ جب ان کا ایک بھی بیٹا یہاں موجود نہیں تھا۔ سب کے سب گھر سے باہر تھے۔ بھلائی، کلکتہ، بمبئی اور ناگ پور میں۔ انہوں نے باپ کو مدد کے لئے روپے بھیجے تھے لیکن چودھری صاحب نے سب کے روپے لوٹا دیئے۔ وہ کسی سے ایک پیسے کی بھی مدد نہیں لینا چاہتے تھے۔ ان کے اپنے پاس جب کافی رقم موجود تھی تو وہ مدد کیوں لیتے؟ وہ صرف اتنا ہی

چاہتے تھے کہ اپنے بچوں کے لئے ایک بہت بڑا مکان بنوا سکیں :

جس وقت چودھری بہوؤں اور بیٹیوں سے بھرے ہوئے کمرے میں پہونچے تو وہاں پاملا اور نیرا کی سگائی کی بات چل رہی تھی۔ یہ دونوں ہی اُن کی پوتیاں تھیں۔ کل کی بچیاں بڑی ہو کر کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم بھی پوری کر چکی تھیں۔ انہوں نے کانوں میں پڑی اس آواز کو اَن سُنا نہیں کیا کہ پاملا کلکتے کے ہی ایک پروفیسر سے لو میرج کرنا چاہتی ہے۔ انہوں نے اپنی بڑی بہو کو غصے بھرے لہجے میں پکارا :

"شاردا، بچوں کی شادی بیاہ یہیں پر ہوگا جہاں ہم لوگ رہتے ہیں۔ دوسری جگہ کہیں بھی نہیں۔ دکھ سکھ آتے دیر نہیں لگتی۔ ایک دوسرے کے قریب رہنے سے بڑا سہارا ہو جاتا ہے۔" اس کے بعد ان کا غصہ اُتر گیا۔ اسی فطری جذباتیت بھرے لہجے میں بولے: "شاردا تم نے اپنا مکان دیکھا کہ نہیں؟"

انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کو بھی پھر سے بُلایا، اور انہیں مکان کے اس حصے میں لے گئے جہاں انہیں رہنا تھا۔ گھر کے سارے لوگ ان کے ساتھ پھر سے ہو لئے۔

" ہر ایک کے رہنے کے لئے تین کمرے، ڈائننگ روم، کچن، باتھ روم، اسٹور، اور آنے جانے کا راستہ تک الگ۔ ایک روز میں نے اسی کھڑکی میں سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ ایک مزدور کو بلانا چاہتا تھا۔ سامنے کے حصے پر نظر پڑ گئی جہاں مدن کو رہنا تھا۔ تو مجھے وہاں کی برساتی بے پردہ دکھائی دی۔ میں نے پوری دیواریں دو دو فٹ اوپر اٹھوا دیں۔ کسی بہو کی بے پردگی کیوں ہو؟ ہر ایک کو اُٹھنے بیٹھنے کی پوری آزادی ہونی چاہئے نا! کیوں؟"

یہ بتا کر وہ ہنس بھی پڑے۔ پھر پہلے کی مانند آبدیدہ بھی دکھائی دیئے۔

جانے کے بعد سب مہمان رخصت ہو گئے۔ گھر میں صرف اپنے ہی بچے بالے رہ گئے تو انہوں نے سب کو جمع کر کے وصیت نامہ نکالا، چاروں بیٹوں کے ہاتھ میں ایک ایک نقل دے کر کہا ـــ

"زندگی کا تو کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ اب تم لوگ جلدی سے یہاں آکر بس جاؤ۔ میری آنکھوں کے سامنے۔ جس گھر کو بنوانے میں میں نے اپنی پوری پونجی صرف کر دی ہے اس میں تم سب کو رہتے ہوئے بھی تو دیکھ لوں!"

بیٹے وصیت پڑھتے پڑھتے رک گئے۔ اپنے باپ کی طرف ہکا بکا ہو کر دیکھا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر سب سے بڑے نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا :

"پتا جی آپ تو جانتے ہی ہیں میں کلکتے کی جس فرم میں ملازم ہوں وہ پرائیویٹ ہے۔ اُسے چھوڑ کر یہاں آجاؤں گا تو پھر اتنی اچھی تنخواہ تو نہیں ملے گی اور وہ سب سہولتیں بھی جو ہمیں وہاں رہنے سہنے کی اور بچوں کی تعلیم کی ملی ہوئی ہیں!"

چودھری نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ مندر کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہو سکتا جو اس نے کہا ہے۔ لیکن پھر بھی انہوں نے پوچھا ـــ

"تیرے ریٹائر ہونے میں تو ابھی بیس برس ہوں گے!"

"جی ہاں اتنے تو ضرور ہیں"

"تو تُو سمجھتا ہے میں تب تک زندہ رہوں گا؟"

اس کے بعد انہوں نے مدن کی طرف دیکھا ـــ

"مدن تُو؟ تُو تو آجائے گا نا!"

مدن ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ جس میں ملازمت کی ساری بے بسی سمٹ آئی تھی۔ بولا ــــ "ہماری کمپنی کی ملیں صرف چار جگہوں پر ہیں بمبئی، بنگلور، مدراس اور مدورائی۔ ادھر تو ایک بھی نہیں ہے"

چوہدری صاحب کتنے لمحوں تک اس کی آنکھوں میں ڈوبے ہوئے سے دیکھتے رہے جیسے جاننا چاہتے ہوں کیا اُس نے یہ سب کہہ کر اپنے باپ کے ساتھ انصاف کیا ہے؟

نندکمار نے باپ کے پوچھنے سے پہلے ہی کہہ دیا ــــ "میری قسمت تو بھلائی کے ساتھ ہی وابستہ ہو چکی ہے مجھے فولاد کے اس کارخانے کے علاوہ اور کہیں بھیجا ہی نہیں جا سکتا"

سب سے آخر میں جواب دینے کی باری منوہر کی تھی۔ وہ پچیس برس کا ایک مضبوط نوجوان تھا۔ لیکن اُس کے چہرے پر ابھی تک لڑکپن کی جھلک بھی تھی جیسے زندگی کے کارزار میں اُسے قدم رکھے ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی ہو۔ اس نے پہلے تو ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر کہا: میں نے سائنس کے جس سبجیکٹ میں ڈاکٹریٹ کی ہے اس کی مزید ریسرچ میں ناگ پور میں رہ کر ہی کر سکتا ہوں۔ پتہ نہیں میں یہاں کبھی آبھی سکوں گا کہ نہیں! ہو سکتا ہے ناگپور میں رہتے رہتے وہیں پر ہی بس جاؤں!"

چوہدری صاحب کو یوں لگا جیسے اُن کی ساری محنت پر پانی پھر گیا ہو۔ وہ دیر تک کچھ بول ہی نہ سکے۔ اُن کے لڑکے اپنے اپنے بیوی بچوں کو لے کر وہاں سے کھسک گئے۔ کسی کو سسرال جانا تھا۔ کسی کو اپنے دوستوں سے ملنے۔ کسی پر کوئی پکچر دیکھنے کی دُھن سوار تھی۔ چوہدری صاحب اور ان کی بیوی وہاں اکیلے بیٹھے رہ گئے ــــ اتنے بڑے مکان میں اکیلے ــــ!

جمیلہ ہاشمی

مہادیو

چھت کے ساتھ لٹکے ظلسے جیسے بوند بوند ٹپکتے پانی کی طرف اشارہ کر کے پجاری نے کہا۔

"یہ مہادیو کا چشمہ ہے، چاروں طرف سمندر ناگرجتا ساگر ہے۔ یہ پہاڑی مانو ایک طرح سے تو ساگر میں کھڑی ہے اور اس چشمے میں میٹھا پانی ہے۔ ہر ہر مہادیو!"

"اچھا" میں نے بظاہر حیران ہو کر کہا۔

"اور" ایک جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا "یہ مہادیو کے پارس کا نشان ہے جب وہ پہلے پہل اس دھرتی پر اُترے تھے۔"

میں نے جھک کر دیکھا کیونکہ مندر میں اندھیرا تھا۔ شوراتری کے دن دور تھے، اور آبادی سے پرے ہونے کی وجہ سے لوگ یہاں کم ہی آتے تھے۔ پجاری صبح اور شام دیا جلا دیتا جو چٹان کے اندر بنے ہوئے مندر کے اندھیرے کو دور نہ کر سکتا۔ مورتیوں کی صورتیں سیندور میں نہائی ہونے کے باوجود بہت دھندلی دکھائی پڑتی تھیں۔ پوجا کی جگہ پر باسی پھول اور سوکھے بیل پتے تھے۔ ساگر کی باس بھی بہت مدھم سی تھی جیسے بس خیال ہی ہو۔

پجاری نے دیوار پر ایک جگہ ہاتھ لگا کر کہا: "یہ شیام سندر اور رادھیکا ہیں۔ یہ پانی پر سے اترتے ہوئے ہنومان جی ہیں۔ ہاتھ پر پہاڑی اٹھائے ہوئے۔ یہ شو پاروتی اور گنیش ہیں۔"

اس نامعلوم سی روشنی میں آنکھیں مندر کی دیواروں پر بنے دیوی دیوتاؤں کو دیکھ رہی تھیں اور پجاری کی آواز گونج بنتی جاتی تھی، جیسے ساری مورتیاں اس کی آواز میں آواز ملا رہی ہوں۔

"آپ اس جگہ کھڑے ہوں تو پانی کی پھوار ہلکی سی پڑتی ہے حالانکہ کنارہ یہاں سے بہت نیچے ہے آج تک کسی کو پتہ نہیں چل سکا کہ یہ پھوار یہاں کیسے پہنچ پاتی ہے۔"

"جے جے مہادیو!" پجاری نے زور سے کہا۔ جیسے مہادیو اس کی بات سن رہے ہوں، اور اپنی استتی سن کر خوش ہوں۔ آواز مندر کا گنبد گونج رہی تھی۔

"پوجا کا سمے ہو گیا ہے مہاراج۔" اُس نے خوشبو کی بتیاں جلائیں، زور سے سنکھ بجایا اور گھنٹیاں ہلا کر دیکھنے لگا۔

"میری طرف سے مورتی پر پھول اور پھل چڑھا دینا پجاری" میں نے روپے اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

دور سے بانسری کی آواز آئی

پجاری کی آنکھیں ٹپک اٹھیں۔ "مہاراج یہ میرا پگلا بیٹا ہے سارا دن چٹانوں پر گھومتا بانسری بجاتا رہتا ہے اور کہتا ہے میں شیام سندر ہوں۔ میں مہادیو ہوں میں برہما ہوں وشنو ہوں۔ اس ڈر سے کہ لوگ اس کی باتیں سن کر نہ جانے کیا کہیں میں دن میں اسے یہاں نہیں آنے دیتا کبھی کوئی یاتری آجائے تو کیا کہے۔"

"تو یاتریوں کا کیا جاتا ہے پجاری" میں نے اوپر جانے والی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے کہا

"مہاراج جاتا تو کچھ نہیں پر آپ کی طرح تو ہر کوئی نہیں سوچ سکتا نا! ہم لوگ صدیوں سے اس مندر کے پجاری ہیں میں نے اپنی ساری زندگی یہاں گزاری ہے اور میرا ہی لڑکا اپنے آپ کو مہادیو اور بھگوان کرشن کہے تو سننے والے کیا نہ کہیں گے یہ تو دھرم کا اپمان ہوا نا!"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "نراش ہونے کی کوئی بات نہیں آپ سے آپ ٹھیک ہو جائے گا"

"اچھا مہاراج آپ کہتے ہیں کہ آپ سے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔ کبھی ایسا ہوا بھی ہے کہ کوئی پاگل خود سے درست ہو جائے" پجاری ہاتھ جوڑ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں آس کی چمک تھی۔

میں نے کہا "گھبراتے کیوں ہو۔ وقت سارے سپنوں کو آپ سے آپ ہرا دیتا ہے سدا سے یہی ہوتا آیا ہے۔ تمہارا لڑکا بھی بانسری کی تان میں یہ سپنا دیکھتا پھرتا ہے"

"اچھا مہاراج میں آس لگائے رکھوں گا جب اس کے سپنے آپ سے آپ ہار مان لیں گے اوہ! پر آپ تلک تو لگواتے جائیں" اس نے مجھے مہادیو کے مندر کی راکھ کا تلک دیا، "چندن اپنے پاس آج نہیں ہے اور نہ ہی گلال مہاراج" اس کی آواز میں منت اور شرمندگی سمٹی ہے۔

میں من ہی من مسکراتا ہوں۔ اب تو میں بھی مہادیو ہوں ان گرجتی جھاگ اڑاتی غصے سے پاگل ہوتی لہروں سے میں نے اپنے آپ کو بچایا ہے۔

نیچے بہتے کنارے کی ریت پر نسیم بچوں کے ساتھ گھوم رہی ہے مجھے چٹان کے سرے پر کھڑے دیکھ کر بچے زور زور سے ہاتھ ہلا رہے ہیں۔ سورج شفق کے اس آکاش سے ملتے دور تک پھیلے تال میں ڈوب چکا ہے ہوا کنارے پر سسکیاں لیتی لگتی ہے لہریں سرخ پہاڑوں کے پاؤں پر منہ پر کیے بین کر رہی ہیں شام کا تارا نیلاہٹ میں اکیلا آنسو گرانے کی کوشش میں آنکھیں جھپکا رہا ہے۔ میں دھیرے دھیرے اس کنارے کی طرف جا رہا ہوں جہاں نسیم اور بچے میرا انتظار کر رہے ہیں۔

رات کالی چادر منہ پر ڈالے ماتم کرنے والوں میں ملنے آئی ہے پانی پر سیاہی جھکتی آتی ہے۔

رات صدیوں پہلے کی وہ رات جب اس نے کہا: میرے بیچ کتنے جنم کا فاصلہ ہے؟

ہم کنارے کی ریت پر خاموش بیٹھے تھے وہ تینوں جب جیسے سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے تو انھوں نے غم کو بھولنے اور اداسی کو دور کرنے کے لیے خوب شراب پی جہاز صبح تین بجے روانہ ہونے والا تھا مجھے معلوم تھا وہاں میرے لئے کوئی آس نہیں سگر میں اس کے قریب رہنا چاہتا تھا اس ہوا میں سانس لینا چاہتا تھا جس میں وہ تھی۔ چاہت کا پاگل پن سپنوں کی پرچھائیں جیوتی کو میں نے پہلے پہل کسی مباحثے میں دیکھا تھا۔ وہ سننے والوں کی پہلی قطار میں بیٹھی تھی اور میں بولنے والوں میں تھا۔ وہ میری طرف بہت

خود سے دیکھ رہی تھی میں نے اسے بھی ان لڑکیوں میں سے ایک سمجھا جو مجھ پر پروانوں کی طرح مرتی تھیں میری فوٹو البم میں لگانا اور آٹوگراف پر میرے دستخط لینا ہی زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ جلسے کے ختم ہونے پر میں نے ہجوم میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر وہ وہاں نہیں تھی۔ ہال میں پیچھے اور دروازے میں سے باہر جانے والے لوگوں میں بھی میں اسے دیکھ نہ سکا۔ آپ ہی آپ میں حیران ہو رہا تھا کہ وہ سارا وقت مجھے دیکھتی رہی تھی اس کی آنکھوں میں خوشی تھی کیا اس کا جی اور لوگوں کی طرح مجھ سے ملنے کو نہیں چاہا؟

اس دن اپنی جیت مجھے زیادہ خوش نہ کر سکی۔ میرے اندر کوئی شے تھی جیسے تھکن اور دکھن کے بعد رگوں کی اینٹھن ہو جیسے خالی پیالہ ہو اور بھرے جانے کے انتظار میں ہو۔

کبھی کبھار اپنے سے بہت زیادہ امیدیں لگانا بھی کتنا مہنگا پڑتا ہے

اس کے بعد ہر ہجوم میں سڑک پر سے گذرتے ہوئے لڑکیوں کے گروہوں میں یونیورسٹی کے لمبے اور نسبتاً اندھیرے میں ڈوبے برآمدوں میں ہر جگہ چہروں کے رکھے ہونے کا گمان ہو سکتا تھا میں نے اسے تلاش کیا۔

ست پال نے مجھ سے پوچھا بھی "پانڈے آج کل تمہاری آنکھوں میں سائے سے کیوں ہیں کسے کھوجتے ہو"

میں اسے کیا بتاتا

پھر مہینوں کے بعد ایک اور مباحثہ ہوا۔ وہ اسی طرح پہلی قطار میں بیٹھی مجھے دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ اس دن سننے والے کہتے ہیں میں نے سب پر جادو سا کر دیا میری آواز میرے اپنے کانوں میں گونج رہی تھی مگر یہ کان میرے نہیں اس کے تھے میں اپنے آپ کو اس کے کانوں سے اپنی گرجتی سرگوشی بنتی اور مختلف اتار چڑھاؤ طے کرتی آواز سن رہا تھا۔

لوگوں نے اب کے بھی مجھے گھیر لیا اور وہ غائب ہو گئی۔

دنوں میں نے پہلے کی طرح اسے بھی ہر جگہ اسے کھوجا۔

ست پال نے پھر کہا "کیسی کھوج میں الجھے ہو ہمیں بتاؤ۔ ہم دوست ہیں تمہارے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں تمہیں کیا دکھ ہے"

میری ہنسی ایک بیمار عورت کی ہنسی تھی پھیکی کھوکھلی اور بے آس سی مگر ست پال سے کسی طرح بچنا ممکن نہ سمجھ کر میں نے اسے بات بتا ہی دی۔

" تم نے ہم سب کا منہ کالا کر دیا ہے کیا تم اس وعدے کو بھول گئے جو ہم نے یہاں آنے سے پہلے کیا تھا کہ "دل کو کسی شے سے چھونے نہ دیں گے" پر خیر اب تم نے وعدہ توڑ ہی دیا ہے تو ہم تمہاری مدد ضرور کریں گے مگر پہلے یہ بتاؤ تم کہیں اسے چاہنے تو نہیں لگے" دیوانند نے جب سنا تو مجھے جی بھر کر کوسا " ارے جیوتی سے دل لگایا ہے وہ تو ہیرے کی طرح سخت ہے اسے کوئی شے نہیں توڑ سکتی اسے کوئی شے نہیں چھو سکتی میں اسے بہت دنوں سے جانتا ہوں تم اس سے بھلا کیا بات کر سکتے ہو۔ وہ تو دیوی سے بھی زیادہ اونچی ہے دیکھو شاید تم اسے رجھا سکو۔"

اس کے دفتر میں میرا اور اس کا تعارف کروایا گیا۔ ہم وہاں کسی ریڈیو پروگرام کے سلسلے میں گئے تھے۔ جیوتی پلو سنبھالنے سے بے نیاز ڈھیروں کاغذات کے درمیان یوں بیٹھی تھی جیسے اجیالا اندھیرے کے درمیان دھیرے دھیرے جلنے

کے لیے تڑپ رہا ہو جیسے پانی کے اندھیرے پر روشن کنول ہو جیسے میٹھے پانی کا کنڈ ہو جا آگ اڑاتے ساگر کے درمیان۔ جیوتی قریب سے مجھے اتنی ناقابل یقین حد تک خوبصورت لگی۔

میں سانس روکے منتظر بیٹھا تھا کہ وہ ہنس کر میری طرف دیکھے گی اب جبکہ وہ اتنے انتظار اور کھوج کے بعد مجھے ملی تھی میں یوں کراتے پھر کھونا نہیں چاہتا تھا۔

اس کی آنکھوں میں خوشی کی وہ چھپی ہوئی لہر نہیں اٹھی جو اپنے پسندیدہ بولنے والے کو دیکھ کر لڑکیوں کی آنکھوں میں پیدا ہوتی ہے اور نہ وہ پہچان جو میں مباحثے میں بولنے کے بعد سڑک پر چلتے ہوئے لوگوں کی آنکھوں میں دیکھنے کا عادی تھا۔ وہ تو آپ ہی اپنی روشنی بکھیرتی ہوئی اجیالے کا کنڈ۔ جیوتی۔

اس سے اس کے دفتر میں ادھر ادھر کے کاموں کے سلسلے میں ملنا ہوتا مگر مجھے کبھی ایک لفظ اس سے کہنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

ست پال نے کچھ دنوں بعد مجھ سے پوچھا کہو کہاں تک پہنچے ہو؟
۔ ابھی تو میں نے چلنا ہی شروع نہیں کیا۔

ست پال نے اس روز مجھے ڈرایا دھمکایا۔" ارے وہ کوئی دیوی تو نہیں جو تم اس سے اتنا گھبراتے ہو۔ ہر عورت کسی نہ کسی چوکھٹ پر ماتھا ٹیکتی ہے تم ہی وہ چوکھٹ کیوں نہیں بنتے تم تو ان جوان ہوتے لڑکوں کی طرح ہو جو کسی بڑی عمر کی عورت کو چپکے چپکے سراہتے ہیں یہاں تک کہ جوانی ان کو دوسری کٹھن منزلوں کی طرف لے جائے۔ یاد رکھو اگر تم نے اب بھی اس سے دل کی بات نہیں کی تو ہم تم سے روٹھ جائیں گے تم سے الگ ہو جائیں گے۔"

اس دن میں نے بڑی ہمت کر کے جیوتی کو اپنے ساتھ چل کر کہیں چائے پینے کی دعوت دی وہ بے تحاشا پڑھی لکھی اور بہت عمدہ باتیں کرنے والی ایسی لڑکی تھی جسے نہ اپنے حسن کا احساس تھا نہ اس روشنی کا جو اس کے گرد تھی اور نہ اپنی سخنی کا۔ چائے پی کر باہر نکلے ہیں تو دھند سے بھری اور گہری ہوتی ٹھنڈ میں یونہی گھومتے رہے۔

جیوتی نے بہت رسان اور اعتماد سے جو پرانے دوستوں میں ہوتا ہے کہا
"اگر تم شام میرے ساتھ ہی گزارنا چاہتے تھے تو باہر گھومنے کی بجائے چلو میرے ساتھ میں تمہیں کافی پلاؤں اور ہم وہاں جی بھر کر باتیں کر سکتے ہیں۔"

رات گئے جب میں اس کے ہاں سے لوٹا ہوں تو میرے ہاتھ میں چند فلسفے اور نظم کی کتابیں تھیں اور میرے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔

ست پال اور دیوندر نے جب ان کتابوں کو دیکھا تو بہت ہنسے دیوندر کہنے لگا" کتابوں کے چکر میں نہ پڑنا میرے دوست جادو کے اندر بند راجکماری کو لینے جاتے یہ سب مشکلیں راہ میں پڑتی ہیں مگر انہی کو منزل نہ سمجھ لینا۔ کتابیں دیتے ہوئے جیوتی نے کیا کہا تھا بھلا؟"

"اس نے کہا تھا اپنے آپ کو مکمل کر دیا نڈے زندگی اتنی چھوٹی سی ہے اور کرنے کو ابھی بہت کچھ ہے۔"
ست پال نے کہا" عورت آدمی کو کہے کہ تم اپنے آپ کو مکمل کرو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ تم نظموں کی کتابیں

پڑھنے لگو گے۔

میں نے انہیں وہ ساری گالیاں دیں جو مجھے یاد تھیں جیوتی کے لئے کوئی ایسی باتیں کہے یہ مجھے پسند نہ تھا۔

آج سوچتا ہوں۔ مگر آج سوچ کہاں ہے۔ آج تو صرف یادیں تھیں جو سمندر کی لہروں کے ساتھ بہی ہوئی بیکار چیزوں کی طرح مدتوں تک گمبھیر نیلاہٹ پر ڈولتی رہی تھیں دور دور تک گئی تھیں اور پھر موجوں نے انھیں ساحل پر لاکر بکھیر دیا ہے آج میرے پاس صرف یادیں تھیں سوچنے کا وقت کہاں ہے بھلا

کسم ہے اور بچے ہیں۔ کسم کا مجھ پر مکمل اعتماد کرتا ہوا چہرہ ہے کسم جو میری زندگی کا ایک کونا پاکر سکون سے بیٹھی ہے اور جس کے دل میں یہ دیوانہ خیال کبھی نہیں آیا ہوگا کہ میں اسے ہی اپنا سب کچھ سمجھوں اس کے لئے ہی جیوں اور وہ دن جو میرے بیتے دنوں اور یادوں میں شریک نہیں تو اسے اس کا کچھ غم نہیں وہ ایک پتی ورتا عورت ہے جس کا کام سوال کرنا نہیں۔ کسم نے کتابوں اور فلسفے کی آڑ لیکر جینے کی کوشش نہیں کر رہی۔ کسم جو عورت ہے سرسوتی نہیں۔

جیوتی وہ سب کچھ تھی جو کچھ نہیں ہے میں اور وہ مل کر کتابیں پڑھتے۔ اپنے روشن اور گرم کمرے میں بیٹھی وہ آنکھیں جھکا کہیں دور دیکھتی ہوئی کہتی "پانڈے تم لفظوں کی آڑ لیکر اپنے آپ کو کام کی سختی سے بچانا چاہتے ہو مگر یاد رکھو منہ سے نکلتے ہوئے زندہ جاندار لفظ تمہاری زبان پر دھڑکتے ہوئے لفظ باہر آتے ہی مر جاتے ہیں اس کے بعد ان کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں رہتی۔ مگر سوچ سوچ ہی سب کچھ ہے سوچنے کی عادت ڈالو پانڈے"

مجھے لگتا زندگی میں یہی سب کچھ ہے جس کی مجھے ضرورت تھی۔ ان دنوں ان بھرپور اور چمکدار دنوں میں اگر میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے قریب کیا ہوتا؟

مگر ہاتھ بڑھانے کی ضرورت ہی کہاں تھی میں اس کی آنکھوں کی روشنی میں پھول کی طرح بڑھ رہا تھا اس کی مہک مجھ میں بسی تھی وہ اپنا پن جو سوالوں اور جھگڑوں کو بیکار کا خیال بنا دیتا ہے اور پھر جب خوشیوں کا اجالا ہر طرف ہو تو آدمی اندھیکار کو بھول جاتا ہے میں نے اس سے کبھی نہیں کہا "جیوتی میں تمہیں چاہتا ہوں" میں لفظوں کا سہارا لینا نہیں چاہتا تھا۔

ست پال نے ایک دن برآمدے میں روک کر مجھ سے پوچھا۔

"پانڈے اب تو تم صرف جیوتی کے ہو کر رہ گئے ہو کیا بتاؤ گے نہیں کہ کہاں تک پہنچے ہو" اور بہت دنوں کے بعد اس دن مجھے معلوم ہوا جیسے کسی کو گیان ہوا اندھیرے کو کاٹتی ہوئی ایک کرن سی میرے انتر میں اتری میں ابھی چلا ہی نہیں تھا۔

ست پال نے کسی مہاتما کی طرح ہاتھ اٹھا کر مجھے شراپ دیا "بھگوان کرے تم کبھی چل ہی نہ سکو تم نے ہمارے گروہ کی بے عزتی کی ہے تم نے دوست ہو کر ہمیں دھوکا دیا ہے" میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "ست پال ایسی باتیں بری باتیں منہ سے مت نکالو میں منت کرتا ہوں مجھے چند دنوں کی اور فرصت دو میں اس سے بات کروں گا"

"تم سوچتے ہو وہ سرسوتی دیوی ہے جس کے چرنوں میں بیٹھ کر تم ودیا پراپت کر لوگے کیا" اور نروان دیوندر نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

اس شام جب میں پہنچا ہوں تو جیوتی وائلن بجا رہی تھی۔ وہ آگ کے پاس شعلوں کے رنگ کی ساری پہنے بیٹھی تھی اس کے بالوں میں پھول تھے جب میں اپنا کوٹ اتار کر اس کے قریب تپائی پر بیٹھا ہوں تو اس نے وائلن پرے رکھ دیا اور

کہنے لگی۔

"پانڈے آج جی بہت اداس ہے بیکار میں وقت گزرتا ہے اور آج تک ہم نے سیکھا بھی کیا ہے؟"

میں نے اکتارہ ہاتھ میں پکڑ کر اس کے تار پر انگلی لگاتے ہوئے کہا "تم یہاں نیچے کیسے اتر آئیں۔ تم تو سوائے کتابوں کے کسی شے میں یقین ہی نہیں رکھتیں تمہاری سیکھنے کی پیاس تو ایسے ایسے کئی جنموں تک نہیں بجھ سکتی تم میرا بائی کی طرح بھگوان کی پیار محبت میں کیسے لگ گئیں۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ کتابوں میں الجھے رہنے سے زندگی کی باقی خوشیوں کا کتنا اپمان ہوتا ہے"

"میں ہار گئی ہوں پانڈے یہ میرا پاگل پن تھا۔ مجھے پریم سے اور پریم کرنے والوں سے نفرت تھی۔ میں نے سرسوتی بننا چاہا تھا، مگر آدمی کتابوں کے سہارے کہیں بھی نہیں پہنچ پاتا۔ اب میں بھگوان کی شرن لوں گی"

"بھگوان کی شرن" میں نے اکتارے کو پرے لڑھکا دیا۔

ہاں پانڈے میں اور تم دو پجاریوں کی طرح مل کر بھگوان کا بھجن کیا کریں کہ مجھے معلوم ہے تم دوسرے لوگوں سے الگ اور اونچے ہو،

میں نے اور لوگوں سے الگ اور اونچا بننے کے لئے اپنے آپ کو برباد کر لیا۔ مورتیاں تو سب پتھر کی ہی ہیں کسی کا نام مہادیو ہوا اور کسی کا پاروتی۔

اگر میں اس سے وہ سب کچھ کہتا جو میں کہنا چاہتا تھا اور وہ مجھے ٹھکرا دیتی ایک بار اپنی چوکھٹ سے دھتکار دیتی تو یہ پاگل پن جو کبھی کبھار میرے جی میں دیوانی ہوا کی طرح چکر لگاتا ہے نہ لگا کرتا۔ مگر جیوتی اور میں برابر ملتے رہے ہماری ان شام کی بیٹھکوں میں ایک اور آدمی شریک ہو گیا مرلی منوہر۔

مرلی منوہر نے جیوتی کو صرف ایک عورت سمجھا جو کتابوں اور گیتوں کا سہارا لے کر شام کے دھندلکوں میں اپنے آپ کو گم کر رہی تھی اس نے اس کے اندر سے رادھیکا کو گھسیٹ کر باہر لا کھڑا کیا جو پانی میں کھڑی تھی اور درختوں میں چھپے کنہیا سے منت کر کے اپنا تن ڈھانپنے کو کپڑا مانگ رہی تھی مرلی منوہر نے اس کو کپڑا دیا تو سہی مگر وہ اس کا بھگوان بن گیا۔

جو پہلا جہاز مجھے ملا میں اس سے وطن واپس چلا آیا۔ دنوں ایک ٹوٹے ہوئے آدمی کی طرح میں ماں کے رونے اور بہنوں کی منتوں سے بے پروا اپنے کمرے میں پڑا رہا اور سوچتا رہا کہ میں وہ بھگوان کیوں نہ بن سکا؟

ست پال نے لکھا تھا "اس دن میں نے تم کو سراپ نہیں دیا تھا پر سچ بات کہی تھی سوئمبر کو جیتنے اور کڑی کمان پر چلہ چڑھانے کے لئے تمہارے ہاتھوں میں بل کہاں تھا اور اب تم ہارے ہوئے جواری کی طرح جنگل جنگل گھوم رہے ہو بھلا کوئی اپنے آپ سے چھپ کر کہاں جا سکتا ہے"

"بکواس" میں نے خط کو پھاڑ کر پھینک دیا اور اس کے پرزے ہوا میں اڑا دئے۔ ان دنوں میرے سینے میں دل ایک ناسور کی طرح دکھتا تھا میں گھبرا کر اپنے بکھرے ٹکڑوں کو سمیٹنے کی کوشش کرتا مگر بھکاری کی پھٹی جھولی میں سے اس کا سب کچھ بکھر جاتا۔ میں اپنا آپ تو داؤ پر لگا سکتا ہوں میں ایک کوشش اور کروں گا۔ شاید میں بھی جیوتی کو عورت سمجھتا تو! اور یہ پچھتاوے مل کر میری چادر بن گئے۔ اس چادر میں لپٹے ہوئے میں نے سوچا میں پھر جاؤں گا۔ یہ سوچ میرا سہارا بن

گئی میں نے جیوتی کے پاس اس کے چرنوں میں لوٹنے کی تیاری کرنی شروع کر دی۔ من ہی من میں سوچتا جب میں
جیوتی سے کہوں گا کہ میں اُسے اتنے بہت دنوں چاہتا رہا ہوں تو وہ مجھے زندگی کے ایک کونے میں تو چپ چاپ کھڑا رہنے

مگر اس کی ساری زندگی تو اب مُرلی منوہر سے بھری تھی، اس میں کہیں چپ چاپ کھڑے رہنے کے لئے بھی جگہ
کہاں تھی۔ جیوتی نے جو مجھے ساگر کی لہروں کی طرح اپنے اندر سمیٹ رکھا تھا اس کا کیا ہوگا؟
اُن دنوں ایک آگ کی بھٹی تھی جس میں تپ کر میرا کھوٹا اور کھرا سب الگ ہوگیا۔ میرا وہ کھرا جس نے جیوتی کو چاہا
تھا میرا سب کچھ بن گیا اور اسی کے آسرے میں نے زندگی کے جی میں پھر رستے بسنے کا ارادہ کیا۔
دُکھ سے میں نے سمجھوتہ نہیں کیا میں نے اسکے سامنے ہی اپنی فوج اتار دی۔ مگر یہ تو بہت بعد کی باتیں ہیں۔
اس رات جب میں اپنا آپ داؤں پر لگانے کیلئے دوبارہ وہاں جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا تو دوستوں نے مجھے
الوداعی دعوت دی تھی ہم سب مردہ ڈھانچوں کی طرح کنارے کی ریت پر پڑے تھے جنہیں لہریں آکر سکو جاتیں۔ اندھیرے میں
موجوں کی اُٹھتی دیواروں اور جھاگوں میں چمکتی مچھلیاں تڑپتی اور جھلاتی لگاتی دکھائی دیتیں ستارے پانی میں بہتے ہوئے ہماری طرف
آتے نقشے کہکشاں میرے سر کے اتنے قریب تھی کہ میں ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتا تھا۔ پھر ہوتے ہوتے مجھے لگا جیسے ساگر
خوفناک اژدر۔ جو دیو کی طرح مجھے نگل جانے کو تیار ہے آہستگی سے لہروں کے ساتھ بہتا گیا یہاں تک کہ ریت کے ذرے کی طرح
جس کی اپنی کوئی مرضی اور ہستی نہ ہو جو کچھ بھی نہ ہو۔ میں مٹ گیا، غراتا چنگھاڑتا غصہ دکھاتا سمندر مجھے مٹا گیا۔
پھر دور سے کسی بانسری کی تان سنائی دی، رات گئے جانے کون تھا وہ اور وہ آواز کہاں سے آئی تھی شاید میرے اندر
سے کوئی گیت پھوٹا تھا جیسے کسی چٹان کے اندر سے پانی کا دھارا بوند بوند ہو کر بہتا ہے۔ فنا ہونا مٹنا اور یہ چپ چپ کا سناٹا
بہت ہی دکھ دینے والا تھا۔
اُن لہروں میں سے ایک مورتی نکلی تھی نیرون کمار پانڈے کی مورتی پھر میں نے ساگر سے کہا دیکھو تم اپنی حدوں کے
اندر رہو گے تم اس مندر کی دیواروں کے ساتھ ٹکرا سکو گے مگر یہ کنارہ تمہیں چھوڑنا ہوگا تاکہ میں جی سکوں اس کنارے کے اُدھر
سب کچھ تمہارا ہے یہ ریت ہے جہاں تمہارے پاؤں کے نشان رہیں گے مگر میں یہاں تمہارے قریب زندگی اور رسم و رواجوں کے
درمیان رہوں گا۔ میں نے اور دُکھ کے مہا ساگر نے دو دشمنوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے ڈیرے ڈال لئے۔
میں آپ مہادیو بن گیا۔
پھر میں نے مندر کے خالی آسن پر اپنی مورتی سجائی۔ مندر کے اندھیکار میں اور بھی بہت سی مورتیاں رکھی ہیں اور بھی
اَن گنت دیوی دیوتا ہیں مگر یہاں سب سے اونچے سنگھاسن پر میری مورتی ہے۔ مہادیو کی مورتی۔

یونس رمزی

سناٹا

چاندنی کی روشنی دریچے سے اندر آ رہی تھی، اور ریشمی پردے سے الجھتی ہوئی ہوا کی گونج سنائی دے جاتی تھی۔ مینٹل پیس پر رکھے ہوئے بیوٹی پیسز کے سائے بڑے دل نشیں تھے۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ اور میں نے دیکھا میرا شاعر دوست، میرا مطلب ہے اردو کا ایک بہت بڑا شاعر (بہ زعم خود زیادہ، بہ زبانِ دیگراں کم) کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"آؤ آؤ میرے دوست اس نرم نرم سی روپہلی چاندنی میں آگ لگا دو۔"

وہ میرے صوفے پر آ کے ڈھے گیا۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ سامنے منل آرٹ کے ایک پورٹریٹ کو اس نے غور سے دیکھا، دھیرے سے مسکرایا۔ سگریٹ جلائی پہلا کش لیا، اور دھواں تصویر کی جانب چھوڑ دیا۔ دھوئیں کی لکیر نے تصویری عورت کے خوب صورت لبوں کو بہت دھیرے سے چوما۔ پھر اس کے گریبان سے ہوتی ہوئی ---

"کوئی بکواس --- تازہ بکواس" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں ایک تازہ بکواس لکھ رہا ہوں، عنوان ہے خوب صورت چہرہ!"

"'خوب صورت چہرہ' عنوان ہی بکواس ہے۔ ہم شاعر جن باتوں کو ایک شعر میں کہہ جاتے ہیں۔ تم لوگ ایک طویل بکواس لکھ کر بھی وہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔"

"ممکن ہے!" میں نے برا مانتے ہوئے کہا۔

"ممکن نہیں سچ ہے!"

"ضد نہ کرو --- ورنہ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ جھوٹ ہے۔"

"اچھا ہٹاؤ اس بحث کو --- آؤ چاند دیکھیں۔"

"تم دیکھو میں تو چاندنی دیکھتا ہوں۔"

"کیسے کور ذوق ہو، تم کہانی کار بس واقعی بکواس ہی کرتے ہو۔"

"دیکھو مجھے غصہ آ رہا ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔

"تو پھر آؤ چاند دیکھو۔ میں نے آج چاند پر بڑی حسین شاعری کی ہے۔ چاند کو میں نے ایک سمبل بنا دیا ہے --- زندگی کا سمبل ---

سماج کا سمبل — محبوب کا سمبل —

"یہ بکواس ہے" میں نے تنک کر کہا " زندگی صرف چاند سا چہرہ تو نہیں — "

"بکواس، اب مجھے غصہ آرہا ہے" شاعر نے کہا۔

"اچھا تم اپنی نظم سناؤ —"

"نہیں تم پہلے چاند کو دیکھو۔"

"اس چاند کو جس کے فاصلے کا حجاب اٹھایا جا رہا ہے۔ میاں چاند میں اب کیا رکھا ہے۔ چاند میں کچھ بھی نہیں ہے۔ تم چاہو تو اب چاند پر ہنی مون منا سکتے ہو۔"

"چاند کی توہین نہ کرو۔ ہماری شاعری کا یوں مذاق نہ اڑاؤ"

"چاند بالکل غلط سمبل ہے میں پھر کہوں گا"

"پھر میری معرکۃ آرا نظم کا کیا ہوگا؟"

"اس کا جسم بدل ڈالو"

"میں شاعر ہوں۔ آپریشن کا ڈاکٹر نہیں جو دل جگر بھی بدل دیتے ہیں"

"تو پھر سناؤ اپنی نظم"

"میں اپنی نظم تم پر برباد کرنا نہیں چاہتا۔ تم اپنی کہانی سناؤ"

"نہیں — میں تم پر اپنی کہانی خرچ کرنا نہیں چاہتا"

"ہا ہا ہا...... ہم دونوں فراڈ ہیں۔"

"نہیں صرف تم فراڈ ہو"

دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ اور میں نے دیکھا شہر کا اعلیٰ موسیقار کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"آؤ میرے دوست آؤ — شاعر اس چاندنی میں آگ نہ لگا سکا — اب یہ آگ تم ہی لگاؤ اپنی آواز سے۔ تمہاری آواز میں تو پھول کھلتے ہیں اور پھر ان کی خوشبو سماعت سے گذر کر دلوں میں پیوست ہو جاتی ہے، سانسوں میں گھل جاتی ہے۔ دھڑکنوں میں سما جاتی ہے، تمہاری آواز ایک حسین دریچہ ہے جس سے ہم سب جھانکتے ہیں اور زندگی کے حسن کو پا لیتے ہیں"

"چپ رہو — تم صحیح تعریف بھی نہیں کر سکتے، میرا ایک شعر سن لو۔"

"میں نہیں سنوں گا"

"تم میری توہین کر رہے ہو۔ میری شاعری سننے کو تو دنیا گوش برآواز ہے"

"جھوٹ ہے"

"کیا یہ جھوٹ ہے موسیقار؟"

"نصف جھوٹ" موسیقار نے کہا۔

"وہ کیسے؟" شاعر چونکا۔

"نصف پیج میں ہوں اس لئے۔

"ہاہاہا — کیا خوب صورت بات کی ہے، تم شاعری کی روح کو پہچانتے ہو۔ ذرا اومن پر میرا وہ گیت تو دہراؤ — "یہ خوب صورت چاندی سی زندگی"۔

"زندگی بدصورت بھی ہے سٹر، تم شاعروں کو پتہ نہیں کیا ہوگیا ہے زندگی کو صحیح پرسپکٹو میں نہیں دیکھتے"۔

"تم چپ رہو داستان گو ورنہ"۔

"ورنہ کیا؟"

"ورنہ میں چلا جاؤں گا"۔

"تو کیا ہوگا —؟"

"تم میری دوستی سے محروم ہو جاؤ گے — اور میں اپنے دوست — سے کہہ کر تمہاری افسانہ نگاری کی ایسی تیسی کرا دوں گا"۔

"بھئی تم تو خواہ مخواہ سیریس ہو گئے"۔ موسیقار نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی۔

"تم نے کوئی افسانہ لکھا ہے۔ تو آؤ سنیں"۔

"میں نے ایک خوب صورت چہرہ کی کہانی لکھی ہے اور میں اس کے سامنے نہیں پڑھوں گا کہ عورت کو وہ صرف حسین بدن کہتا ہے۔
EXCHANGEABLE COMMODITY.

"یہ میں نے کب کہا ہے؟" شاعر بولا۔

"زبانی — شاعری میں نہیں"۔

"ہاں زبانی اور بات ہے۔ شاعری میں عورت کا تصور سب کچھ ہے"۔

"تمہارے قول و فعل میں بڑا تضاد ہے اسی لئے میں"۔

"میں خود تمہاری کہانی سننے کے موڈ میں نہیں"۔

"پھر چھوڑو اس قصہ کو موسیقار تم ہی کوئی دھن سناؤ — یا کوئی گیت"۔

"میں نے ایک دھن بنائی ہے"۔

"سناؤ سناؤ —"

"اس دھن کو سن کر تم یہ تصور کرو گے جیسے کوئی البیلی رسونتی نار سولہ سنگھار کئے دبے پاؤں رات کے بے کراں سناٹے کو پائل کی گونج پر اٹھائے دھیرے دھیرے اپنے محبوب سے ملنے جا رہی ہے"۔

"شاعری میرا حصہ ہے — تم گیت سناؤ"۔

"پہلے تمہید ضروری ہے"۔

"تو پھر خاموش رہو"۔

اتنے میں دروازے پر پھر دستک ہوئی — ایک اجنبی لڑکی کا چہرہ میرے سامنے تھا۔

"آپ؟" میں نے حیرت کے لہجے میں پوچھا۔

"جی میں ——"

"میرا مطلب ہے آپ ...."

"جی میں !"

"اندر آجایئے"

اجنبی لڑکی اندر آگئی۔ ایک بار گھوم کر چاروں طرف دیکھا۔

شاعر کی آنکھوں میں روشنی جاگ اٹھی —" وہ آئیں ہمارے گھر —" شاعر نے کہا۔

"مسٹر گھر میرا ہے ......" میں نے ٹوکا۔

"آیئے آیئے — باہر چاندنی کتنی خوش گوار ہے"

"جیسے پگھلی ہوئی چاندی" شاعر نے کہا "میرے قریب جگہ خالی ہے۔"

"نہیں، یہ جگہ آپ کے لئے زیادہ مناسب ہے" میں نے کہا

"نہیں بھئی ادھر آجایئے" موسیقار نے کہا۔

لڑکی ٹھٹک کر رہ گئی۔ اُس کے رخساروں کے چاند دمک اُٹھے۔ ہونٹوں کی لالی گہری ہوگئی، اور کاجل کی لکیریں پلکوں کی چلمن میں ہانپنے لگیں۔

"ادھر آجایئے —" شاعر نے بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہیں ادھر آجایئے"

"نہیں ادھر"

"حسن کا قدرداں تو صرف شاعر ہے" اور شاعر نے اپنا سر اُس کے قدموں میں رکھ دیا۔

حیرت زدہ لڑکی نے اپنا پاؤں بجلی کی سی تیزی سے ہٹا لیا۔

شاعر مسکرایا —

"دھوتا ہوں میں جو پینے کو اُس سیم تن کے پاؤں
رکھے ہے منہ سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں"

"شاعر ہے بے چارا، اس کی باتوں کا بُرا نہ مانیئے۔ اِدھر تشریف لے آیئے"

"نہیں ادھر آجایئے۔ یہ واُلمن آپ کے قدموں میں ہے۔ میرا ساز میری آواز موسیقار اعظم کی روح آپ کی مٹھی میں ہے"

لڑکی اور پیچھے ہٹ گئی۔

"چھوڑیئے ان پاگلوں کی باتیں۔ آیئے آپ کو ایک کہانی سُناؤں — خوب صورت چہرہ"

"نہیں، میری نئی نظم سنئے — چاند"

"نہیں، میرا واُلمن سنئے۔ میں نے ایک دُھن ترتیب دی ہے سننے کی چیز ہے"

لڑکی سہم کر اور پیچھے ہٹ گئی۔

پھر شاعر نے سرگوشی کے لہجے میں ہم دونوں سے مخاطب ہو کر کہا :
"عورت ایک حسین بدن ہی تو ہے آؤ ہم اسے تقسیم کر لیں"
"نہیں میں تو اس کی پوجا کرنا چاہتا ہوں" موسیقار نے کہا۔
"میں اس سے شادی کر کے تمہارے چاند میں ہنی مون منانا چاہتا ہوں" میں نے کہا۔
اور جب ہم پلٹے تو لڑکی جا چکی تھی ــــ اور ہم ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔
اتنے میں دروازے پر پھر دستک ہوئی۔
دستک میں چوڑیوں کی جھنکار شامل تھی۔
ہم تینوں لپک کر باہر آ گئے۔
وہی لڑکی سہمی ہوئی کھڑی تھی ــــ
اور اس مرتبہ ہم اسے تقسیم کرنے ہی والے تھے کہ بولی ــــ "معاف کیجئے گا ــ میرے والد کی حالت بہت نازک ہے انہیں جلد از جلد کسی ڈاکٹر کی ضرورت ہے"
"ڈاکٹر ــ ؟" ہم تینوں نے دہرایا، اور ایک دم خاموش ہو گئے۔

یہ تندرستی - یہ توانائی - ہمیں تلو ہی سے ملتی ہے

بچے تندرست اور توانا ہی اچھے لگتے ہیں۔ یہ تندرستی اور توانائی اچھی غذا کا کرشمہ ہے۔
ہر ماں جانتی ہے کہ اچھی غذا میں غذائیت کے وہ سارے اجزا شامل ہونے چاہئیں جو
بچوں کے بڑھتے اور بنتے ہوئے جسم کیلئے ضروری ہیں۔
مثلاً وٹامن **اے** جو جراثیم سے بچاتا ہے۔ بینائی کو برقرار رکھتا ہے اور صحت مند بناتا ہے۔
وٹامن **ڈی** جو ہڈیوں اور دانتوں کو مضبوط کرتا ہے اور اعصاب کو سکون پہنچاتا ہے۔
تلو ان سب خوبیوں کا خزانہ ہے۔ آپ بھی اپنے بچوں بلکہ پورے گھرانے کی صحت و
تندرستی کیلئے تلو سے اپنے کھانوں کو غذائیت سے بھرپور بنائیے۔

TULLO
A VEGETABLE PRODUCT
تلو

اماں تلو میں پکاؤ ہمیں صحت مند بناؤ

TB 122/25E

PRESTIGE

آپ میری
پسند کا رنگ
لائے تھے...
لیکن یہ تو
کچّا نکلا
اگر اے بی سی اون خریدی ہوتی
تو کبھی ایسا نہ ہوتا
کتنے سال بعد
واقعی تم سچ کہتی تھیں! یہ اے بی سی اون
کے سوئٹر اتنی دفعہ دھلنے کے بعد بھی نئے کے نئے ہیں!
ABC
hand knitting wool
سال گزر جاتے ہیں اے بی سی اُون کی خوبیاں قائم رہتی ہیں
کیڑا لگنے سے محفوظ - پختہ رنگ - دھلنے سے نہ سکڑتی ہے اور نہ جڑتی -
NATIONAL 628 C

ٹریٹ کی دسویں سالگرہ
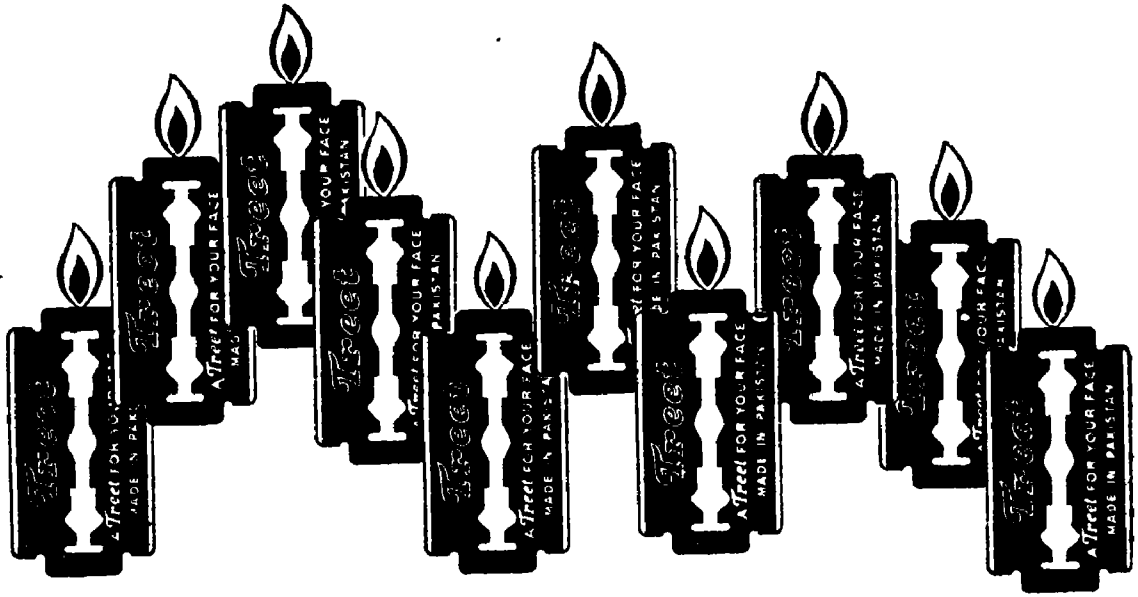
سبقت کے 10 سال

اب سے دس برس پہلے پاکستان میں پہلا ریزر بلیڈ تیار ہوا۔ اس کا نام تھا **ٹریٹ** — **ٹریٹ** بلیڈ کی روداد وہیں سے شروع ہوتی ہے جس کا ہر ورق محنت، مستعدی اور مستقل مزاجی سے عبارت ہے۔ ان دس برس میں مسلسل تحقیق اور ان تھک کوشش کے نتیجہ میں **ٹریٹ** کے انجینیئر شیو بنانے والوں کیلئے بہتر سے بہتر بلیڈ پیش کرتے رہے۔ **ٹریٹ** بلیڈ کی بال سے بھی باریک دھار عمدہ، ملائم اور آرام دہ شیو بنانے کیلئے مشہور ہے۔ بلیڈ سازی کے میدان میں جب سے ابتک **ٹریٹ** ہمیشہ پیش پیش رہا ہے اور یہ سبقت اب تک قائم ہے۔ اس صنعت میں بہتر بلیڈ بنانے کیلئے جب بھی کوئی نئے گر ایجاد ہوئے تو یہ بہتر بلیڈ سب سے پہلے **ٹریٹ** ہی پیش کریگا۔
تحقیق کا عمل، ترقی کی منزلیں دونوں لامحدود ہیں اور اسی صورت **ٹریٹ** کی کاوش اور کامیابیاں بھی۔

رضیہ فصیح احمد

ٹھیکریوں کا شہر

اسٹیشن پر ہُو کا عالم، اکا دکا دیہاتی اُترے اور دیکھتے دیکھتے اپنے ڈنڈے اور دھوتیاں سنبھال تتر بتر ہوگئے۔ وہ اسٹیشن سے باہر نکلے تو ریل سے گھوڑے کا ایک تانگا کھڑا تھا۔

"تانگا بابوجی؟" تانگے والے نے پھرتی سے پوچھا۔

"تانگا لے لیں؟" شعنو نے کہا۔

"ارے نہیں، پیدل چلیں گے۔ ہا، کیا ٹھاٹھ دار موسم ہے" تارہ نے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔ "نہیں بھئی تانگا نہیں چاہئے" شعنو نے بھی شاید اس سڑے ہوئے تانگے سے اپنی ٹانگوں کو بہتر سمجھا۔ البتہ ٹفن کیریر اسے تکلیف دے رہا تھا، جسے وہ بے چینی سے کبھی اس ہاتھ میں کبھی اُس ہاتھ میں پکڑ رہا تھا۔ تانگے والا حسرت سے ان لوگوں کو دیکھتا تانگا لئے آہستہ آہستہ چلنے لگا کہ شاید یہ اپنا ارادہ بدل دیں، مگر جب وہ آس پاس کے سرسبز درختوں، کھیتوں اور ان کے درمیان لگے ہوئے پوست کے سفید، نارنجی اور کاسنی پھولوں کی خوب صورتی میں کھو گئے تو وہ گھوڑا تیز کر کے آگے بڑھ گیا۔ اور وہاں سے چند دیہاتیوں کو بٹھا کر ہوا ہوگیا۔ رفتہ رفتہ دھوپ میں تیزی آنی شروع ہوئی اور ہوا گرم ہونے لگی۔ کوئی ایک فرلانگ چل کر شعنو نے کھیتوں میں پانی دیتے ہوئے آدمی سے پوچھا،

"ہڑپہ کے عجائب گھر تک یہی سڑک جاتی ہے؟"

"آہو جی ---" اُس نے کہا اور اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔

کوئی دو فرلانگ اور چل کر شعنو نے ایک دیہاتی سے پوچھا،

"ہڑپہ کا میوزیم یہاں سے کتنی دور ہے بھائی؟"

"اے کوئی چار میل"

"چار میل!" شعنو حیرت سے چلّایا۔

"چار میل" تارہ اور سارہ نے سانس روک لیا۔

شعنو نے پلٹ کر غصے سے انہیں دیکھا:

"اب چلو چار میل پیدل"

"کوئی تانگا وانگا نہیں ملے گا یہاں؟" سارہ نے دیہاتی سے پوچھا۔

"نہ جی ۔۔ تانگے گڈی دے ٹیم ٹیشن تے جاندے ہیں۔ ہُن تو کوئی نہیں۔"

"چلو پھر آہستہ آہستہ چلتے ہیں اور کیا کریں" سارہ نے کہا۔

شفو کے ماتھے کا بل اب نکلنا مشکل تھا، مگر تارہ ہنستی کودتی اِدھر اُدھر دیکھتی مذاق کرتی چلی جا رہی تھی، جیسے چار میل اس کے لئے کوئی بڑی بات نہ ہو۔

کوئی ایک ڈیڑھ میل چلنے کے بعد سارہ پر تھکن سی طاری ہونے لگی۔ اور اس نے بیٹھنے کا خیال ظاہر کیا۔ سب چھوٹی سی پُلیا پر پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی، سرسبز سایہ دار درخت اور حدِ نظر تک سبز ہی سبزہ۔ تارہ جانے کہاں کہاں کے قصے تُک مزاح لگا کر سناتی رہی۔ شاید وہ شفو کا موڈ درست کرنا چاہتی تھی۔ آخر دھوپ میں تیزی زیادہ ہوتے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور آہستہ آہستہ کرتے پھر چل دیئے۔ پہلے اپنے گرم کپڑے اتار کر کندھوں پر ڈالے۔ مگر پھر تو بغیر گرم کپڑوں کے بھی گرمی لگنے لگی۔ چار میل چلنے کا تصور اس گرمی کو اور آنچ دے رہا تھا۔

تارہ نے رائے دی کہ سڑک پر بالکل سناٹا ہے کیوں نہ دوڑ لگائی جائے۔ اس طرح فاصلہ جلد کٹ جائے گا، اور مقابلے کے جوش میں بوریت کم ہو جائے گی۔

شفو کی طرف اُس نے اپنے خیال کی تائید میں تعریفاً دیکھا تو وہ منہ بنا کر بولا:

"شرم تو نہیں آئے گی سڑک پر بھاگتے ہوئے، لوگ سیدھے گیدو بندر پہنچا دیں گے۔"

"بس بھئی تو ہر وقت گیدو بندر ہی یاد آتا ہے، معلوم ہوتا ہے ضرور وہاں رہے ہو۔ ہر وقت دنیا سے ڈرتے رہنا، یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ تم گھسٹتے رہو، ہم تو جاتے ہیں۔"

تارہ نے سارہ کا ہاتھ پکڑا اور زبردستی گھسیٹنے لگی۔ کچھ دیر گھسٹنے کے بعد وہ بھی بھاگنے لگی، مگر کب تک۔ آخر دونوں کا سانس پھول گیا اور ایک درخت کے نیچے بے دم ہو کر گر پڑیں۔ جس وقت شفو اپنی متانت بھری چال سے وہاں پہنچا اُن کے سانس بمشکل قابو میں آئے تھے۔ وہ پھر شفو کے ساتھ ہو لیں۔ معلوم ہوتا تھا اب ٹفن کیریئر شفو کو بے حد تکلیف دے رہا ہے۔ اس لئے سارہ نے کچھ دیر کے لئے اُس سے مانگ لیا۔ پھر اپنا پرس سارہ کو تھما کر تارہ نے لیا، اور اسے پرس کی طرح جھلاتی ہوئی چلتی رہی۔ اس کا اس طرح چلنا شفو کب تک برداشت کرتا۔ کچھ دیر تو تارہ کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر بغیر کچھ کہے سنے ٹفن کیریئر اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

اسی طرح دھوپ سینکتے، قدم بہ قدم منزل کی امید میں وہ آگے بڑھتے رہے اور جس وقت دور سے انہیں درختوں میں گھری ہوئی ایک زرد عمارت نظر آئی۔ اس وقت ان کا دل خوشی سے ناچنے کو چاہا، مگر وہ اتنا تھک چکے تھے کہ ناچنا تو ایک طرف قدم بھی تیز ہونے کے بجائے سست پڑ گئے کہ چلو اب تو آخرکار پہنچ ہی گئے ہیں۔ میوزیم کے پیڑ اور لان انہیں جنت نشان معلوم ہوئے اور بجائے اس کے کہ وہ عمارت میں داخل ہو کر ہزارہا سال کی پرانی چیزوں کو دیکھتے ایک طرف لگے ہوئے بڑے سے سایہ دار درخت کے نیچے ہو بیٹھے۔ اس وقت شفو نے کہا "ذرا کھول کر دیکھا جائے کیا مال مسالہ ہے ٹفن کیریئر میں"

کچھ قیمہ اور شامی کباب تھے۔ ایک خانے میں دہی تھا۔ گرمی اور ہلانے جھلانے سے مکھن اکٹھا ہو کر اوپر آ گیا تھا، اور نیچے صرف چھاچھ رہ گئی تھی۔

"بھئی ابھی کھانا وانا نہ کھولو ورنہ مجھے بھوک لگنے لگے گی" تارہ نے کہا۔

"جی ہاں ابھی دس بجے ہیں خیر سے" شفو نے جلدی جلدی ڈبے پھر اپنی جگہ پر جما کر ڈھکن کیریر بند کر دیا۔ "کیا اس جیپ کے پیچھے بیٹھتے ہی آپ لوگ آئی تھیں"

آخر کپڑے جھاڑتے ہوئے وہ تینوں اُٹھ کھڑے ہوئے اور میوزیم کے اندر چلے گئے۔ وہاں نہایت سنجیدگی سے گائیڈ کی رہنمائی میں پانچ ہزار سال پرانی چیزیں دیکھتے رہے۔ مٹی کی ہانڈیاں جن پر بڑا عمدہ روغن تھا اور بالکل آج کے سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ مٹی کے خوبصورت کھلونے، بڑے بڑے قدِآدم گھڑے، مونگے موتی کے زیور، بائٹ سکے شیشے کے کیسوں میں سجے ہوئے تھے۔ پانچ ہزار سال پہلے کے باسیوں کے جمع کئے ہوئے جلے ہوئے اناج کے ڈھیر۔۔۔ ان چیزوں کو دیکھتے دیکھتے یکایک تارہ کو جانے کیا سوجھی کہ جھٹ آ کر سارہ کی پسلیوں میں زور سے کہنی مار دی

"اُوئی۔۔۔ کیا ہے؟"

"بلبلا کیوں رہی ہو۔ وہ تو دیکھو۔ اس جنگل میں ایک اور بن مانس علاوہ شفو میاں کے موجود ہے۔"

سارہ نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ایک لمبے تڑنگے صاحبزادے سوٹ بوٹ ڈاٹے، دھوپ کا چشمہ لگائے تختوں پر رکھی ہوئی چیزوں کو بغور دیکھ رہے تھے۔

"ماشاءاللہ" اب کے تارہ نے زور کا ٹھنڈا سانس لیا۔ "اوہ کس قدر تیز دھوپ ہے اس کمرے میں۔"

سارہ سمجھ گئی کہ یہ ان صاحبزادے کے دھوپ کے چشمے پر طنز ہے۔ سارہ نے اسے گھور کر دیکھا، مگر وہ دل و جان سے گائیڈ سے کسی چیز کے بارے میں پوچھنے لگی۔ یہ مٹی کی گول خاصی بڑی سی چکنی پرات تھی۔ جس کو گائیڈ اس زمانے کی میز کی ٹاپ بتا رہا تھا اور نیچے کا اسٹینڈ بھی اس نے مہیا کر دیا تھا اور کرسی کے طور پر استعمال ہونے والا اسٹول بھی۔

تارہ اس سے پوچھ رہی تھی۔ "آپ کو کیسے معلوم کہ یہ چیز بطور میز استعمال کی جاتی تھی۔ ممکن ہے اس زمانے میں اس کا بالکل دوسرا مصرف ہو۔ وہ اس پر روٹیاں بیلتے ہوں یا عورتیں اس پر روٹیاں بیلتی ہوں۔ اور اس اسٹول پر بچوں کی حجامت بنائی جاتی ہو!"

گائیڈ کو یہ بات بہت ناگوار گذری۔ وہ تو طوطے کی طرح رٹ کر بولنے کا عادی تھا۔ ساری تقریر ختم ہونے کے بعد دو بار سلام کر کے حقِ خدمت لیتا اور اللہ اللہ خیر سلا۔ وہ اس قسم کی جرح کیا جانے، بگڑ کر بولا۔

"اجی یہ ہماری گورنمنٹ نے ہمیں بتایا ہے۔ وہ بہت پڑھی لکھی ہے۔ جاہل اَن پڑھ نہیں ہے"

"تمہاری طرح" شفو نے تارہ کو چڑایا۔

سارہ نے دیکھا کہ سوٹ بوٹ والے صاحب نے دھوپ کا چشمہ اتار لیا ہے اور ایک طرف بڑے اطمینان سے کھڑے ان کی جھڑپ سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

یہاں سے وہ کھنڈروں کی طرف روانہ ہوئے۔ اب دھوپ میں اور بھی تیزی آ گئی تھی۔ ٹھیکریوں کے ٹیلے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان پر سے ہوتے ہوئے کھنڈروں تک پہنچے جہاں منہدم مکانات کے آثار تھے۔ پکی نالیاں، تالاب اور چبوترے وغیرہ بنے ہوئے تھے۔ ان سب کو دیکھتے ہوئے وہ دور نکل گئے۔ جہاں ایک سفید پتھر کی بے حد طویل قبر تھی جس پر سبز جھنڈے لگے ہوئے تھے۔ وہاں کے مجاور نے بتایا کہ یہ کسی بزرگ کی قبر ہے جو نو گزے تھے۔

"لمبے تو نو گزے تھے اور قبر کی چوڑائی سے ظاہر ہوتا ہے کہ چوڑے عام انسانوں کی طرح تھے۔ پھر تو وہ چلتے ہوئے پنکھے کی طرح کانپتے

بھول گئے" تارہ نے کہا۔

مجاور کا منہ بن گیا۔

اس قبر کے نزدیک بن چکی کے پاٹ سے بھی کئی گنا بھاری ایک پتھر تھا جس کے درمیان ایک سوراخ تھا۔ مجاور نے بتایا کہ یہ ان بزرگ کی انگوٹھی ہے جو وہ چھنگلیا میں پہنا کرتے تھے۔ اس سے ذرا فاصلے پر اینٹوں سے بنی ہوئی ایک شکستہ سی عمارت تھی۔ مجاور نے انکشاف کیا کہ یہ مسجد ہے۔

"کیا یہ مسجد بھی پانچ ہزار سال پرانی ہے؟" تارہ نے پوچھا۔

اور شفو نے اُسے گھور کر دیکھا۔

"نہیں جی، یہ تو ابھی پچھلے سال بنائی تھی، بارشوں میں گر گئی۔"

اس مسجد کی حالت واقعی اتنی خستہ تھی کہ پانچ ہزار سال کے پرانے کھنڈر اس کے آگے نئے نظر آ رہے تھے۔ اس کھنڈر سے مٹی کے مرغولے اڑاتا کوئی ڈھلائی پہ اترتا ہوا آیا اور نیچے پہونچ کر بے تحاشا پیر پٹخ کر اپنے جوتے جھاڑنے لگا۔ پھر ان لوگوں کو دیکھ کر اس نے اپنی اس حرکت کی معافی مانگی۔

شفو نے بڑی بے دلی سے کہا "کوئی بات نہیں"۔

اور وہ لعنت ملامت دیکھ کر ایک طرف کھسک گیا۔ یہ وہی آدمی تھا جو انہیں میوزیم میں ملا تھا۔

"کوئی جُونا مارکیٹیا ہے" تارہ نے اعلان کیا۔

"جُونا مارکیٹیا کیا؟" سارہ نے پوچھا۔

"یعنی وہ جو جُونا مارکیٹ کے کباڑی بازار سے پرانے کوٹ پتلون پہن کر صاحب لوگ بن جاتے ہیں۔"

شفو نے اُسے بگڑ کر دیکھا۔ "تمیز بھی ہے تمہیں کپڑے کی۔ بہترین قسم کے کپڑے کا سوٹ پہنے ہوئے ہے فارن انگلش۔"

"فارن مال ہے تب تو ضرور ہی جونا مارکیٹ کا ہوگا۔ آج کل انگریزی کپڑا ملتا کہاں ہے بھلا۔"

"تم نے کبھی کپڑا دیکھا ہو تو پہچانو بھی۔" شفو نے رحم کھا کر کہا۔ شفو کے سامنے کپڑوں کے اور وہ بھی مردانہ کپڑوں کے بارے میں بول لینا ہمت کا کام تھا۔

جب وہ واپس ہوئے تو معلوم ہوا کہ میوزیم سے بہت دور نکل آئے ہیں اور اب تپتی ریت کے کئی ٹیلے اور ٹھیکریوں کے بہت سے پہاڑ انہیں سر کرنے ہیں۔ دھوپ اور بھوک سے وہ پہلے ہی نڈھال ہو رہے تھے۔ اس فاصلے کو دیکھ کر اور دل بیٹھ گیا۔ اس پر لڑکیوں کے جوتوں نے اب صاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ فاصلہ بھوکے پیاسے کیسے طے ہوگا۔ اس پر شفو نے یہ کہہ کر اور دم نکال دیا کہ ذرا تیزی سے چلو زیادہ وقت نہیں ہے۔ کھانے کے بعد چارسل اسٹیشن تک بھی جانا ہے۔ گاڑی چھوٹ گئی تو رات کو بھی یہیں رہنا ہوگا۔ اور وہ سالارِ قافلہ بن کر آگے آگے چل دیا۔

تھوڑی دور چل کر تارہ نے جوتے اتار کر ہاتھ میں لے لئے اور سارہ کو بھی اشارہ کیا۔ اور چارو ناچار دیکھ کر اس نے بھی اپنے سینڈل ہاتھ میں لے لئے اور دونوں ہی تارہ کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ اس وقت شفو کا موڈ اچھا تھا، اور بغیر پیچھے دیکھے کچھ گنگناتا ٹیلے پر ٹیلا اتر رہا تھا۔ تارہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اپنے پرس سے کوئی چیز نکالتی۔ اور جھٹ سے اسے ریت یا ٹھیکریوں میں چھپا دیتی۔ سارہ نے نزدیک جا کر دیکھا

کہ یہ کیا کر رہی ہے۔ معلوم ہوا وہ گھر سے کچھ موتی مونگے۔ مٹی کے ٹوٹے ہوئے کھلونے اور پتھر کے نکونے ٹکڑے اٹھا لائی ہے جو وہاں اس لئے چھپا رہی تھی کہ ممکن ہے یہ چیزیں کسی کے ہاتھ لگیں اور پانچ ہزار سال پرانی قرار دے کر میوزیم میں رکھی جائیں۔

گرم ریت ان کے تلووں کی اچھی خاصی سنکائی کر رہی تھی اور وہ دوبارہ جوتے پہننے کا ارادہ کر رہی تھیں کہ دفعتاً شعو نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور دونوں کو جوتے ہاتھ میں لئے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس وقت اُس نے ایسا بُرا منہ بنا رکھا تھا جیسے علاقے کی ساری گرد اس کے منہ میں گھس گئی ہو اور ساری ٹھیکریاں اُس کے سر پہ برس کر لوٹ گئی ہوں۔

"جوتے کاٹ رہے تھے اور ان کی ایڑیاں ریت میں دھنس رہی تھیں" سارہ نے نزدیک پہونچ کر صفائی پیش کرنے کے انداز میں شعو کو سنایا۔

"تو کس نے کہا تھا کہ سینڈل پہن کر چلو معلوم نہیں تھا کہ سیر کرنے جا رہی ہیں کوئی واکنگ شو پہن لیں"

"جی ہاں، ہم نے تو آپ کی خاطر پہنے کہ شعو کے ساتھ جا رہے ہیں تو ذرا بن ٹھن کر چلیں"

اس بات پر شعو کو ہنسی آگئی "جی، یہ آپ بن ٹھن کر چلی ہیں۔ ذرا صورت آئینے میں دیکھی ہے۔ پورے بارہ بجے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جو کپڑے رات کو پہن کر سوئی تھیں وہ ہی لادے ہوئے ہیں۔

"مگر دیکھو۔ جوتے وہ نہیں ہیں جو رات کو پہن کر سوئے تھے۔ یہ تمہاری خاطر بدلے اور یہیں دھوکا کھا گئے"

"اچھا۔ آپ آئندہ میری خاطر کوئی کام نہ کریں"

"بہت بہتر" تارہ نے فرماں برداری سے کہا۔

خدا خدا کر کے میوزیم آیا اور ان کی جان میں جان آئی۔ اندر گھسے تو ایک سفید کتا جس کی سُرخ آنکھیں اور پپوٹے بعید گھناؤنے تھے انہیں کچھ مشتبہ نظروں سے دیکھتا ہوا ہونٹ چاٹ رہا تھا۔ شعو نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا اور پتھروں کے پیچھے چھپائے ہوئے ٹفن کیریر کو لینے چلا گیا۔ فوراً ہی وہ خالی ہاتھ لوٹا۔ وہاں ٹفن کیریر نہیں تھا۔ شعو گھبرا کر اندر بڑھا۔ اسے دیکھ کر پہلے گائڈ نے پرانے گڑھے میں سے ان کا ٹفن کیریر برآمد کر کے شعو کو تھما دیا۔ اور بولا۔

"آپ کا ٹفن کیریر کتے نے گرا دیا تھا جس سے وہ کھل گیا۔ کچھ سامان تو اس نے کھا لیا، جو کچھ بچا تھا، وہ میں نے واپس رکھ دیا ہے"

اس وقت اس کا چہرہ بالکل سنجیدہ تھا۔ پھر بھی یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بے حد خوش ہو کہ پڑھی لکھی گورنمنٹ کو جاہل رکھنے والوں کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے اور وہ قطعی اس قابل ہیں کہ کتے کا جھوٹا کھائیں ـــ پیپل کے درخت کے نیچے ٹفن کیریر کھول کر وہ سب اس کے آگے یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے جیسے پردیس میں یکایک مر جانے والے کسی عـــزیز کی نعش لئے بیٹھے ہوں۔

یکایک نظر جو اٹھی تو میوزیم کے گیٹ کے عین سامنے سڑک پہ زرد رنگ کی ایک ڈبل بیڈ کی سی لمبی چوڑی شیو کار بڑی متانت سے کھڑی تھی۔ اور اگلی سیٹ پر وہی شخص جسے تارہ نے "جونا مار کیشیا" کا خطاب دیا تھا، بیٹھا تھا۔ کار کے پچھلے دونوں دروازے کسی منتظر عاشق کی باہوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ اور کار کا ریڈیو بڑی ہی میٹھی آواز میں گا رہا تھا ؎

آ، انتظـــار ہے تیرا
دل بے قرار ہے میرا

یہ کتنا عجیب سا منظر تھا۔ جلتی دھوپ میں چمکتی ہوئی پانچ ہزار سال پرانی ٹھیکریاں اور ریت میں ملے ہوئے چمکدار ذرے تھے زرد رنگ کی وہ نئی عمارت تھی جو اتنی پرانی چیزوں کو آغوش میں سمیٹے تھی۔ تین بے بس، بھوکے، نڈھال سیر و تفریح کے مارے تھے۔ جنہیں یہ احساس تھا کہ ابھی انہیں چار میل اور ٹانگیں توڑنی ہیں اور جدید ترین ماڈل کی ایک بے مذوب صورت کار تھی جو کسی ریڈیو اسٹیشن سے انتظار یہ گانے سنوا رہی تھی ؎

آ، لوٹ کے آجا میرے میت
تجھے مرے گیت بلاتے ہیں...

آخر اس کو کس کا انتظار تھا جو وہ اسٹیرنگ وہیل پر مزے سے ہاتھ رکھے سگریٹ پی رہا تھا۔ کار کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔ دراصل جلدی نہیں تھی، کیوں کہ اس کی کار یہ چار میل کا فاصلہ اتنی دیر میں طے کر سکتی تھی جتنی دیر میں یہ نڈھال مسافر اپنے کپڑے جھاڑ کر ور برتن سمیٹ کر صرف میوزیم کے گیٹ سے باہر نکل جاتے، اور پھر اسے اسٹیشن جانا بھی نہیں تھا کیوں کہ اس کے پاس اپنی کار تھی، اپنا وقت تھا۔

مگر سوال یہ تھا کہ اُسے کس کا انتظار تھا؟

سب سے پہلا اس کا جواب تارہ نے ڈھونڈا۔

"اب کب تک ان کہنیوں کا ماتم کئے جاؤ گے، اٹھو، اس جُونے مار کٹیئے سے کہو کہ ہمیں اسٹیشن تک لے جائے؛ ورنہ یوں بھوکا پیاسا ہی سے چلا جائے گا۔ دیکھو وہ اتنی دیر سے پہلا ہی انتظار کر رہا ہے۔"

شفو کا رنگ جس طرح زرد ہوا۔ پھر سُرخ ہوا، پھر اس کی پیشانی پر ناگواری کی لہریں ابھر آئیں اور اس کے کان سُرخ دہکتے انگارے ہو گئے۔ اس سے انہیں اندازہ ہوا کہ تارہ کی بات اسے کس حد تک ناگوار گذری ہے۔ شفو کے کان بقول تارہ کے اس کے مزاج کا تھرمامیٹر تھے۔ جتنے زیادہ سرخ ہوں سمجھو اتنا ہی اس کا پارہ چڑھا ہوا ہے۔ سارا کھانا ایک کونے میں ڈالا جسے پھر چندھی آنکھوں والے کتے نے لیا۔

گھڑی پر نگاہ ڈال کر شفو نے جلدی جلدی ٹفن کیریر بند کیا اور اپنی پتلون کا پچھایا جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دونوں بھی بادلِ نخواستہ کھڑی ہوئیں۔ شفو نے گیٹ سے باہر نکلنے کے بجائے شارٹ کٹ کیا اور سوکھی جھاڑیاں کانٹے الانگتا پھلانگتا چلا۔ مجبوراً انہیں بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔

جب وہ خاص سڑک پر پہونچ کر چند گز آگے بڑھ گئے تو وہ زرد کار اسٹارٹ ہوئی۔ اور زن سے ان کے پاس سے گذر گئی۔ مگر کچھ جا کر رُک گئی اور وہی حضرت دوسرا سگریٹ سلگاتے نظر آئے۔ اس وقت کار کی پچھلی سیٹ پر ڈرائیور بھی بیٹھا ہوا تھا۔

"دیکھو، اب بھی مان جاؤ شفو، ایک دفعہ نکل گیا تو سر پکڑ کر روؤ گے، کسی سے نہیں چلا جائے گا اس وقت۔"

"دیکھو تارہ۔۔۔،" شفو یکایک رُک گیا۔ اُس کا لہجہ دھیما تھا۔ اس وقت اس میں غصے سے زیادہ غم کی جھلک تھی۔ ایک عجیب ٹھہراؤ ایک عجیب عزم تھا۔۔۔ "تم چاہو تو کار میں جا سکتی ہو۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ مگر میں خود کسی سے کہوں گا نہ بیٹھوں گا۔ ہاں اور اگر وہ اسٹیشن چھوڑنے کے بجائے کہیں اور لے جائے تو......"

وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا اور خاموش ہو گیا۔

"مجال ہے کسی کی ۔" تارہ بولی ۔ "زیادہ سے زیادہ یہ کہ اگر وہ منٹگمری کی طرف جارہا ہوگا تو ہمیں گھر پر چھوڑ دے گا"

"اگر اتنی ہمت نہیں تھی تو گھر سے نکلی ہی کیوں تھیں ۔ انسان کو ہر مہم اپنے ہی بل پر سر کرنی چاہیئے ۔"

"فلسفہ مت بگھارو ـــــ اگر ہم کار میں بیٹھ کر چار میل چلے گئے تو کار گھس نہیں جائے گی ۔ کوئی بہت معقول آدمی ہے بے چارہ بات کرتے ہوئے ڈرتا ہے مگر برابر روک روک کر چلا رہا ہے ۔"

"وہ چاہتا تو ہم سے پوچھ سکتا تھا ۔ اس میں کوئی برائی نہیں تھی ، مگر اس کے یہ انداز مجھے بھا نہیں رہے ۔"

زن سے کار ان کے پاس سے گذر گئی ۔ اور نورجہاں کی آواز میں اس نغمے کی لہر بجی ۔ ع

تمام رات قیامت کا انتظار کیا

جلد ہی کار ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی ۔ اور تارہ شفو کو کوستی رہ گئی ۔ اس وقت تک سب کے موڈ بگڑ چکے تھے ۔ ایک تو صبح کا آدھا ادھورا ناشتہ کئے ہوئے ، پھر زخمی پاؤں اور منزل دور ، ـــــ شفو کا بس نہ چلتا تھا کہ کھڑکھڑاتے ہوئے خالی ٹفن کیریر کو نہر میں بہا دے ۔ تارہ نے پرس بغل میں دبا لیا تھا ، اور سر ایک طرف ڈالے ایسی بے دلی سے چل رہی تھی جیسے مریل گدھا اینٹوں کے بوجھ تلے گھسٹتا ہے ۔ سارہ کی حالت اس سے بھی کچھ بدتر تھی ۔ وہ برابر سوچ رہی تھی کہ شفو نے ٹھیک کیا یا تارہ ٹھیک کر رہی تھی ـــ

دور ہی سے انہوں نے دیکھا کہ گاڑی آرہی ہے ۔ پہلے تیز چلے ، پھر بھاگے ـــ پھر اور تیز بھاگے ـــ مگر جس وقت اسٹیشن پر پہونچے گاڑی ذرا دیر رک کر دوبارہ چل دی تھی ۔

غصے میں شفو نے ٹفن کیریر زمین پر ٹپک دیا ۔ تارہ نے سارہ کو اور سارہ نے تارہ کو بڑی بے بسی سے دیکھا ـــ اب کوئی گاڑی نہیں ہے ۔ ان جان جگہ ، ان جان لوگ ، کیا کریں گے آخر .....

"تم یہیں ٹھہرو ۔ میں ابھی آتا ہوں" اسٹیشن ماسٹر سے مل کر آتا کہہ کر شفو چلا گیا ۔

اب ان دونوں میں کھڑے ہونے کی طاقت نہیں تھی ۔ وہ پلیٹ فارم پر پڑی ہوئی بینچ پر بیٹھ گئیں ۔ کوئی پندرہ بیس منٹ بعد شفو آیا ، منہ تھوتھائے ، چہرہ لال بھبوکا ، اور کان سرخ انگارہ ـــ

تارہ نے چپکے سے سارہ سے کہا ـــ

"پارہ خطرناک حد تک چڑھا ہوا ہے ، خدا خیر کرے ۔"

"چلو ـــ"

شفو نے جیسے لٹھ ان کے سر پر دے مارا ۔

"کہاں چلیں ـــ ؟" تارہ نے کہا ۔

شفو نے اس استفسار کا کوئی جواب نہیں دیا ۔ اور لمبے لمبے قدم رکھتا اسٹیشن کی عمارت کی طرف لوٹ گیا ـــ وہ بھی پیچھے ہو لیں ۔ اسٹیشن کی عمارت سے نکل کر انہوں نے دیکھا کہ ـــــــ وہی زرد شیورلیٹ سڑک پر کھڑی ہے ۔ ـــــــ دونوں مرد اس کے باہر کھڑے ہوئے تھے ـــــــ کار کے دروازے شفو کے ہونٹوں کی طرح بھینچے ہوئے تھے ـــــــ اور اب ریڈیو پر کسی اور اسٹیشن سے طربیہ نغموں کے ریکارڈ بج رہے تھے ۔

ڈاکٹر ست پرکاش سنگر

درد سوا ہوتا ہے

"میں اس بات کو کہے بنا نہیں رہ سکتا کہ ملک کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے" لالہ گردھاری لال نے لفافے میں سے برفی نکال کر اسے طشتریوں میں رکھتے ہوئے کہا۔ لفافہ ردی کاغذوں سے بنا تھا اور سیاہی کے داغ برفی پر بھی لگ رہے تھے۔ لالہ جی نے برفی چار طشتریوں میں رکھی۔ ایک بڑے دونے میں سے گلاب جامن نکال کر دوسری طشتریوں میں رکھے۔ ایک لفافے میں سے سموسے نکال کر ایک ہی طشتری میں ڈال چٹنی کی پیٹ اس کے پاس رکھ دی۔ پھر بولے :

"پروفیسر صاحب شروع کیجئے"

سترہ گھنٹے کی بس یاترا کے بعد میں اس شہر میں لیکچر دینے کے لئے پہنچا تھا۔ وہاں پہونچتے ہی میزبان نے مجھ سے کھانے کے لئے پوچھا ہندوستانی معاشرت کے مطابق میں نے ایک بار اس لئے انکار کیا کہ وہ دوسری بار اصرار کریں گے۔ لیکن انہوں نے صرف مجھے آرام فرمانے کے لئے کہا۔ اور چلے گئے۔ ایک چھوٹے قصبے میں ڈاک بنگلے کا وجود معمولی بات نہ تھی۔ لیکن یہ بنگلہ انگریزی سرکار کی برکت کا نتیجہ تھا۔ چوکیدار بھی تھا پنکھے تھے۔ بجلی تھی۔ نواری پلنگ تھا بستر میں لے نہیں گیا تھا وہاں سے ملنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔ سر کے نیچے تولیہ اور پیٹ پر سفری پاندہ میں سو گیا۔ لیکن اتنی سخت تکان کے بعد نیند بھی غائب ہو گئی یا اسی وجہ سے نہیں آ رہی تھی، یا شاید بھوک کے کارن غائب تھی۔ جالی کا دروازہ بند نہیں ہو سکتا تھا۔ باہر کھیلتے ہوئے چھوٹے بچے اس چڑیا گھر کے نو وارد جانور کو دیکھنے کے لئے جھانکنے لگے۔ پورے پانچ بجے میزبان صاحب تشریف لائے اور بولے :

"چائے تیار ہے"

"میں بھی تیار ہوں" میں نے کہا۔

"چلئے"

"کہاں؟"

"چائے پینے"

"کہیں باہر؟"

"ہاں سیٹھ نگر لالہ گردھاری لال مہاجن کے ہاں"

لیکن ہم ان کے ہاں نہیں، اُن کی دُکان پر گئے۔ باہر ان کے نام کا بورڈ تھا۔ گردھاری لال ایل بی لے — اس کے اوپر ایک بڑا بورڈ تھا جس سے ظاہر

ہوتا تھا کہ وہ ایک سیمنٹ کمپنی کے ایجنٹ ہیں۔ دکان کے اندر ایک طرف گدے بچھے تھے اور اس پر گاؤ تکیے لگے تھے بائیں دیوار کے ساتھ ایک بنچ پڑا تھا سامنے میز رکھی تھی اور اس کے ارد گرد کرسیاں تھیں۔ پرانی مڈل اور جدید تہذیب کی کیا خوب آمیزش تھی۔ وہ خود کالے رنگ کے تھے۔ لیکن سفید بش شرٹ پہنے تھے۔

ہمارا استقبال کرنے کے بعد انہوں نے لڑکے سے چائے لانے کو کہا لیکن چائے کی بجائے وہ مٹھائی اور سموسے لے آیا۔ یہاں بھی مٹھاس اور نمکین، کالی گلاب جامن اور سفید برفی کی آمیزش تھی۔ مجھے ان تینوں چیزوں میں سے کوئی بھی پسند نہیں۔ گلاب جامن اور برفی دانتوں کے لئے اور سموسے پیٹ کے لئے مضر ثابت ہوتے ہیں بلکہ حکیم صاحب کا یہی مشورہ ہے کہ میں ان تینوں سے پرہیز کروں لیکن بھوک کی شدت اور حکیم صاحب کی عدم موجودگی نے مجھے پرہیزگاری سے ہٹا کر ان کی طرف توجہ کے لئے آمادہ کیا۔

"حالات ٹھیک نہیں" مہاجن صاحب کی آواز میرے کان میں پڑی۔

"شاید نہیں ہیں۔ اس لئے تو مجھے پانچ بجے تک بھوکا رہنا، اور اب ان تینوں ممنوعہ اشیاء سے پیٹ بھرنا پڑا۔"

"امیر امیر اور غریب غریب ہوتے جا رہے ہیں"

"یہ بات تو میں نے پہلے بھی سن ہے" میں نے رومال سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"سبھی سمجھدار لوگ ایسا کہیں گے" وہ بولے "ارے لڑکے چائے لا"

"شاید وزیر اعظم نے بھی ایسا کہا تھا"

"سبھی سمجھدار لوگ ایسا کہیں گے"

"لیکن ایسا کیوں ہو رہا ہے؟"

"اس لئے کہ آپا دھاپی مچی ہے۔ کوئی کام نہیں ہو رہا۔ کوئی ترقی نہیں ہو رہی۔"

"ایسا مت کہئے" میں نے ازراہ احتجاج کہا: "اتنے کارخانے بن رہے ہیں۔ فولاد کے کارخانے، سیمنٹ، کھاد کے کارخانے، کپڑے کے کارخانے اور نہ جانے کن کن چیزوں کے کارخانے بن رہے ہیں۔ دیش ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور آپ اس سے منکر ہیں۔"

"اجی صاحب کوئی ترقی نہیں ہو رہی۔ ہم جہاں تھے، وہیں ہیں۔ جو حالت انگریز کے زمانے میں تھی، اب اس سے بدتر ہے۔ لے آئے چائے؟ لاؤ، یہاں رکھو، میرے پاس"

"انہوں نے ان دقیانوسی سفید پیالوں میں کالی کالی چائے انڈیل دی۔ سب کی طرف پیالے بڑھائے اور میرے میزبان مسٹر دریا لال شرما سے مخاطب ہوئے:

"کیوں شرما صاحب! آپ کا کیا وچار ہے؟"

"میں تو آپ سے سو فی صدی رضامندی کا اظہار کرتا ہوں، اور یہ پہلی بار نہیں"

انہوں نے چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

"آپ ہی شروع کیجئے پروفیسر صاحب"

میں نے پیالی کو منہ سے لگایا اور چائے کا گھونٹ بھرا۔ دل نے کہا، حلق میں لے جانے کی بجائے اسے باہر تھوک دو۔ یا اندر سفید چاندنی پر تھوک دو۔ چائے کی پیالی دیوار پر دے مارو۔ لیکن اپنے دل کو مجھ سے بڑھ کر دوسرا کوئی نہیں جانتا۔ ہمیشہ ..... بچپن ہی سے غلط مشورے دیتا

رہا ہے۔ اس لڑکی کو پسند کرو، اُس آدمی سے نفرت کرو۔ اور جب جب میں نے اس کے مشورے پر عمل کیا ہمیشہ تکلیف اٹھائی۔ اس کے مشورہ دینے کا ڈھنگ ایسا عجیب ہوتا ہے کہ کئی بار اسے مان جانے اور اس پر عمل کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ اور اگر خدا وند تعالیٰ نے دل کے پاس پاسبانِ عقل کو نہ رکھا ہوتا تو نہ جانے یہ کیا آفت ڈھا دیتا۔

دل کی بات کو نظر انداز کر، میں نے چینی میں پٹی ہوئی چائے کا ایک گھونٹ بھرا۔ چائے کیا تھی، جوشاندہ تھا۔ لیکن اس بھی زیادہ کڑوی باتیں سننے کے لئے مجبور تھا۔ گردھاری لال جی بولے،

"پروفیسر صاحب! آخر وجہ کیا ہے کہ آج حالت اتنی خراب ہے؟"

میں نے کہا: "میرے خیال میں ہندوستان ترقی کر رہا ہے۔ پلانوں کی وجہ سے ملک میں کارخانے کھلے ہیں۔ پیداوار بڑھی ہے۔ ہر چیز پہلے سے زیادہ ہے لیکن ہم نے آبادی کو قابو میں کرنے کے لئے کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھایا۔ پیداوار کی افراط کے ساتھ کھانے والوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ اس لئے معاملہ وہیں کا وہیں رہ جاتا ہے۔ دوسرے پیداوار کی تقسیم کا خاطر خواہ انتظام نہیں۔ اس کے لئے گورنمنٹ کافی کوشاں ہے۔ انکم ٹیکس کا ڈھانچہ تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ گورنمنٹ نے انشورنس بزنس کو ہاتھ میں لے لیا ہے۔ ٹرانسپورٹ بھی کافی حد تک پرائیویٹ لوگوں اور کمپنیوں کے ہاتھ سے لیا جا رہا ہے۔ لیکن ابھی تک آمدنی کی تقسیم مناسب طریق سے نہیں ہو رہی۔۔۔۔۔"

"آپ سمجھتے ہیں۔ آپ چائے پیجئے نا۔ کہ آمدنی کی مناسب تقسیم ممکن ہے؟ دوسرے کیا ایسا ہو جانے سے ہمارے مسائل کا از خود حل نکل آئے گا! پروفیسر صاحب! بیماری کی تشخیص آپ نہیں کر سکے۔"

"میں حکیم ہوں نا وید۔ ڈاکٹر ہوں، وہ بھی ہنسپتی۔"

"میں کون سا حکیم یا وید ہوں؟ ہنسپتی ڈاکٹر بھی نہیں۔ لیکن پھر بھی تشخیص کر سکتا ہوں۔ آپ چائے کیوں نہیں لیتے!"

"دراصل ..... دراصل ..... میں چائے کم ہی پیتا ہوں۔" میں نے سفید جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"اور آپ جانتے ہیں میری تشخیص؟" اور مجھے بولنے کا موقع دیئے بغیر فرمانے لگے۔ "وہ ہے بے ایمانی۔"

"بے ایمانی؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"جی جناب، بے ایمانی۔" انہوں نے میز پر مکہ مارتے ہوئے کہا۔ وہ بھول گئے تھے کہ میز پر پیالیاں ہیں اور پیالیوں میں چائے ہے اور مکہ مارنے سے چائے کا اچھلنا لازم ہے۔ انہوں نے ناچتے ہوئے پیالوں اور چھلکتی ہوئی چائے کی طرف سے دھیان ہٹا کر ساری توجہ میری طرف مبذول کرتے ہوئے کہا: "بے ایمانی ہی ہماری سب سے بڑی اور خطرناک کمزوری ہے۔ اسی وجہ سے پیداوار بڑھ جانے کے باوجود ملک میں غربت کا دور دورہ ہے۔ اسی وجہ سے اتنی ترقی کے بعد ترقی کے آثار معدوم ہیں۔ چاروں طرف بے ایمانی کا دور دورہ ہے۔"

"اسے دور کرنے کے لئے گورنمنٹ پوری طرح کوشاں ہے۔"

"وہ کوشاں ہے؟ پروفیسر صاحب! آپ کیا کہتے ہیں؟ اگر کوشاں ہوتی آج یہ حالت نہ ہوتی۔ مجرم کو سزا کہاں ملتی ہے۔"

"جرم کا پتہ لگ جانے پر سزا کیوں نہیں ملتی؟"

"اسے آپ سزا کہتے ہیں؟"

"اور کیا؟"

"سزا ایسی سخت اور عبرت ناک ہونی چاہئے کہ نہ صرف مجرم کی بلکہ دوسروں کی بھی ہمت نہ پڑے کہ پھر کبھی کسی جرم کا ارتکاب کر سکیں۔ ان

مجرموں کے پبلک میں کوڑے پڑنے چاہئیں ۔ سنگ زنی ہونی چاہئے ۔ زمانۂ قدیم اور وسطیٰ میں ایسا ہی ہوتا تھا۔"

"لیکن ایسی سزاؤں کے ملنے پر اُن زمانوں میں جرم کم ہوگئے ہوں ، ایسا بھی نہیں ۔ میں نے کہا۔

"واہ پروفیسر صاحب! آپ کیسی بات کر رہے ہیں؟ سخت سزا ملنے پر جرم کا اعادہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیوں شرما صاحب؟"

لیکن شرما صاحب اس وقت مرچ والا سموسہ نگل چکے تھے اور بیچارہ اپنی آنکھوں کو رومال سے پونچھ رہے تھے۔ ان اہم معاملات کی طرف متوجہ ہونے کے سبب ان کا دھیان ملکی مسائل سے ہٹ گیا تھا۔ بولے،

"کیوں نہیں ، کیوں نہیں؟"

"کیوں نہیں کیا؟" گردھاری لال جی نے پوچھا۔

"آپ کیا فرماتے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا۔

میں تو اس بات کے حق میں ہوں۔ سیٹھ جی انہیں نظرانداز کرتے ہوئے بولے ۔" کہ جب تک مجرم کو پبلک میں عبرت ناک سزا نہ دی جائے گی ۔ بے ایمانی جیسے خطرناک مرض کا علاج ایک دم ناممکن ہے ۔ پھر آنا ۔ ابھی جاؤ ۔" انہوں نے ہوا میں ہاتھ گھماتے ہوئے ، دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے گردن گھما کر دیکھا ۔ دروازے میں دو اشخاص کھڑے تھے ۔ دیہاتی قسم کے ، سروں پر پگڑیاں رکھے ، کالر والی کھدر کی قمیص پہنے ، اور تہمد باندھے۔

"میں نے کہا ، پھر آؤ ۔ چلو ۔ چلو ۔"

وہ چلے ضرور ۔ لیکن باہر جانے کے بجائے وہ کمرے کے اندر آگئے ۔ اور بیچ پر بیٹھ گئے ۔ سیٹھ جی نے انہیں نظرانداز کر کے اپنی تھیوری کی الاپ لگائی۔

"اس بے ایمانی نے ملک کا بیڑہ غرق کر دیا ۔ چاروں طرف رشوت اور خیانت کا بول بالا ہے ۔ کنبہ پروری اور اقربا پروری کا دور ہے اور اس کا علاج ایک ہی ہے بے ایمان افسران کو سنگین سزا دی جائے ۔ انہیں پبلک کے سامنے عبرت ناک سزا ملنی چاہیے۔"

"سیٹھ جی! ہمیں جلدی ہے۔"

"پھر آنا۔"

"یہ نہیں ہوگا۔ ہم ابھی لے کر جائیں گے۔"

"اچھا ایک گھنٹہ رک جاؤ۔"

"ہمارے پاس وقت نہیں۔"

"اچھا آگے آؤ۔" پروفیسر صاحب معاف کرنا ۔" ہاں ، کہاں ہے درخواست؟"

"یہ رہی۔"

"تو ابھی دو بوریاں دے دیتا ہوں۔"

"ہمیں بیس چاہئیں۔"

"اچھا تین لے لو۔"

"ہمیں بیس چاہئیں۔"

"بیس نہیں دے سکتا"

"ہمیں پرمٹ ملے چار ماہ ہو گئے۔ اس کے بعد کھیلا گاؤں کے نمبردار کو آپ نے پچیس بوریاں دیں۔ منادان خورد کا زمیندار آپ سے تیس بوریاں لے گیا۔ جاجل کلاں کے بنئے کو پچھلے ماہ چالیس بوریاں دیں ــــ یہ سب بوریاں کہاں سے آگئیں ــــ؟ بعد میں پرمٹ لینے والے ہم سے پہلے کیسے نپٹائے گئے؟"

"ان سب باتوں سے تمہیں کوئی واسطہ نہیں"

"یہی تو آپ کی بھول ہے اور ہم اس بھول کو دور کرنے آئے ہیں"

"لیکن میرے پاس ابھی بوریاں نہیں۔ اگر آپ کو بہت ضروری چاہئیں تو میں کسی دوسری جگہ سے دلوانے کی کوشش کر سکتا ہوں، لیکن شاید دام زیادہ دینے پڑیں گے"

"خیر ہم آپ سے اتنی گذارش کرنے آئے ہیں کہ ہم ابھی ڈی سی صاحب کے پاس جا رہے ہیں، اور انہیں سارے معاملے سے آگاہ کریں گے"

"ابھی جائیے سیٹھ گردھاری لال ایسی باتوں سے نہیں ڈرتا"

"تو جے کرم جی کی"

اور دونوں جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا۔ اچھا۔ ذرا رکو۔ بیٹھو"

"لالہ جی۔ اب بلیک مارکیٹ والا معاملہ نہیں چلے گا۔ نئے ڈی سی تک ہماری بھی رسائی ہے۔ وہ ہماری ہی برادری کا ہے"

"کون چودھری بنواری لال؟"

"جی چودھری بنواری لال"

"اچھا۔ اچھا۔ رکو۔"

پھر وہ پوری سنجیدگی سے مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔

"اچھا۔ پروفیسر صاحب۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ آپ جیسے پڑھے لکھوں سے بحث کرکے بہت لطف آتا ہے"

پھر وہ کرسی پر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

مجھے بھی اٹھنا پڑا۔

انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ مصافحہ کے لئے میری طرف بڑھایا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے ان کی تقلید میں ایسا کرنا پڑا۔

"اچھا نمستے!" انہوں نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اور فوراً ہی اسے رہائی دیتے ہوئے کہا۔ "اب میں ذرا بزنس کی طرف بھی توجہ دے لوں۔ آپ جیسے لوگوں سے بحث کر کے دماغی قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے ــــ اچھا نمستے!ــــ" انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

جاسئے ادھوری چھوڑ کر میں مشرا صاحب کے ساتھ باہر نکل آیا، اور سڑک پر آ کر اپنی دماغی قوت کا اندازہ لینے لگا۔ اس میں اضافہ تو نہیں ہوا تھا۔ ہاں معلومات کا خزانہ پہلے سے بڑھ گیا تھا!

فیض انصاری

کالی مٹی — سفید بیل —

یہ کہانی —
ایک بہت بڑے
دیش کے
ایک بہت چھوٹے
گاؤں کے
اُس کسان کی ہے
جس کے کروڑوں بھائی
لاکھوں گاؤں میں
رہتے بستے اور
جیتے مرتے ہیں
اِن میں کروڑوں ہیں
جن کو —
پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا
کروڑوں ہیں
جو تن بھر کپڑا نہیں پہن سکتے
کروڑوں ہیں
جن کے سروں پر
سائے نہیں ہیں
اور جو گرمی، سردی، برسات
برسوں سے
آسمان کی چھت
اور درختوں کی چھاؤں میں
گذارتے چلے آرہے ہیں
کروڑوں ہیں —
جن کے پاس زمین ہے — !
لیکن ہل نہیں ہے — !
ہل ہے لیکن بیل نہیں ہیں — !
بیل اور ہل ہے
لیکن زمین نہیں ہے
زمین بیل اور ہل ہیں
اناج کا بیج نہیں ہے
زمین بیج ہل اور بیل ہے
تو بے رحم آسمان سے
بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے

○

لہکا۔ اس کالی مٹی کے کھیت کا مالک ہے۔ جو گاؤں بھر میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ یہ تو لہکا بھی نہیں جانتا کہ اس کے پروج کب اور کہاں سے آئے تھے۔ صرف اسے اتنا ہوش ہے کہ جب اسے سوجھ بوجھ پیدا ہوئی تھی تو اس کے گاؤں میں کل دو گھر تھے ایک اس کے پتا کا اور دوسرا اس کے ماما کا۔ اس کے گھر میں تین افراد تھے۔ ایک اس کا باپ ایک اس کی ماں اور ایک خود وہ — دوسرے گھر میں چار جانیں تھیں ایک اس کا ماما ایک اس کا لڑکا، ایک اس کی مامی اور ایک پنیا۔ جو اب اس کی بیوی ہے۔ لیکن آج اس گاؤں میں پورے بیس گھر ہیں۔ جو سب کے سب بانس کی اور گھاس پھوس کے ہیں۔ ان میں اب سب ملاکر پچاس کے اوپر انسان رہتے ہیں۔ اور یہ سب چھوٹے چھوٹے کسان ہیں۔ ذات تو ان کی گونڈ ہے۔ مگر پٹواری جو پاس کے ایک بڑے قصبے میں رہتا ہے اور اپنے آپ کو علاقے کا راجہ کہتا ہے۔ سفید دھوتی کھادی کا کرتا اور کھادی کی ٹوپی پہنتا ہے۔ لہکا اور لہکا کے گاؤں والوں کو "آدی واسی" لکھتا ہے۔ اور بڑا نیچ سلوک کرتا ہے۔ لگان ایک دن بھی دیر سے نہیں لیتا اور لگان لینے سے پہلے اپنا نذرانہ پہلے وصول کر لیتا ہے۔ پھر جب بھی گاؤں میں آتا ہے لہکا کو اس کے لئے ایک مرغی ضرور کاٹنی پڑتی ہے۔ لہکا کے یہاں جتنی بھی مرغیاں ہیں وہ سب کی سب اس کی لڑکی سلکارو کی ملکیت ہیں۔ اور سلکارو کو پٹواری سے سخت نفرت ہے۔ اس لئے نہیں کہ اس کے لئے ہر بار ایک مرغی دینا پڑتی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ جب بھی اس کے گھر آتا ہے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے سلکارو کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے کوئی پکے آموں کو توڑ لینے کی نیت سے دیکھے

سلکارو لہکا کی اکلوتی لڑکی ہے۔ جو اسے بڑے دیوتے بڑی منتوں اور مرادوں سے دی ہے اور پھر بڑے دیوتے اس کو لہکا کی آرزو کے عین مطابق اس کالی مٹی سے بنایا ہے۔ جو سارے گاؤں میں صرف اس کے کھیت میں ہے —— اور یہ کھیت اتنا دھان پیدا کرتا ہے کہ پورے گاؤں میں کوئی بھی کھیت اس کی برابری نہیں کرتا۔ لہکا کو اٹھارہ برس کے بعد بھی... برسات کی وہ دوپہر اب تک یاد ہے۔ جب برسات کی پہلی بارش ہو رہی تھی اور وہ اپنے جھونپڑے میں پنیا کو پاس لئے بیٹھا اس کا سنگیت سن رہا تھا۔ اور خوشیوں بھری نظروں سے اپنے کھیت میں گرتی ہوئی پانی کی ان بوندوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو موتیوں کی مانند بکھر رہی تھیں، اور چاندی کی مانند پگھل رہی تھیں۔ اور اس کے کھیت کی کالی مٹی اس کے پرت کے نیچے ایسی چمک رہی تھی۔ جیسے کالی ناگن اپنی کینچلی کے اندر چمکتی ہے

—— اسی وقت لہکا نے پنیا سے کہا تھا۔

"پنیا۔ دیکھ رہی ہے اپنے کھیت کی کالی مٹی —— !"

"ہاں۔ پورے پندرہ برس سے دیکھتی آ رہی ہوں" پنیا نے اپنے ننگے بازو پر سے کالے گھنے بالوں کی لٹیں پیچھے پھینکتے ہوئے جواب دیا اور تب ہی لہکا کی نگاہیں اس کے گداز سینے سے ٹکرا گئی تھیں۔

"مگر ایک نظر آج بھی دیکھ —" لہکا نے پنیا کو اپنے مضبوط بازو میں سمیٹ کر اس کا چہرہ کھیت کی طرف کرتے ہوئے کہا تھا —"جانتی ہے کیوں"

"بھلا کیوں —— ؟" پنیا نے لہکا کے گال سے گال ملا کر پوچھا تھا۔

"اس لئے کہ تو ایک ایسی لڑکی کو جنم دے جس کا رنگ بھی اس کھیت کی کالی مٹی کی طرح ہو !"

اور پنیا لہکا کی اس بات پر کنول کے پھول کی طرح کھل اٹھی تھی اور لہکا نے اس پھول کو اتنی بار چوما تھا کہ وہ مرجھا کر بے سدھ ہو گیا تھا

اور جب پھر پنیا نے لہکا کو باپ بننے کی خوشخبری دی تھی تو لہکا نے گاؤں میں پوٹلو کا اعلان کروا دیا تھا۔ اور اس دن بڑے دیو کے سامنے اس نے ایک سوّر بھی چڑھایا تھا۔ اور چپکے سے بڑے دیو کے کان میں کہا تھا ـــــ دیوتا ـــ لڑکی دینا جس کا رنگ میرے کھیت کی مٹی کے جیسا کالا ہو ـــــ!

اور پنیا کو بھی لڑکی ہی پیدا ہوئی اور اس کا رنگ ٹھیک ٹھیک لہکا کے کھیت کی چکیلی کالی مٹی کی مانند تھا!

اور آج جب وہ لڑکی اٹھارہ ویں بہار میں قدم رکھ چکی ہے تو سارے گاؤں کی نگاہیں اس کے سڈول جسم کے سیاہ نمکین رنگ پر اس طرح جم جاتی ہیں۔ جس طرح لہکا کے کھیت کی چکیلی کالی مٹی پر۔ جو محنت کم لیتی ہے اور اناج پورا دیتی ہے پھر چاہے جو دھان ڈالو سب کی پیداوار یکساں ہوتی ہے اور یہی اس کھیت کی مٹی کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ مگر سلکارو کی فطرت کھیت کی مٹی کے بالکل برعکس ہے گاؤں کا کون سا دھڑکتا ہوا دل ہے جو سلکارو کے قدموں کے نیچے بچھنے کو تیار نہیں رہتا ہے لیکن سلکارو کے بے رحم جرم ہیں کہ ایک لائن سے سب کو کچلنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ وہ کبھی کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ کبھی گاؤں کے ریلے میں شریک نہیں ہوتی۔ کسی میلے ٹھیلے میں نہیں جاتی مگر جس راہ سے گزرتی ہے ہزاروں بجلیاں گراتی ہے جس طرف نظر اٹھاتی ہے دیکھنے والوں کے دلوں کو چھلنی کر کے رکھ دیتی ہے

لہکا پچھلے کتنے دنوں سے سوچنے لگا تھا۔ کہ اب سلکارو کا بیاہ کر دینا چاہئے۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گاؤں کا کونسا لڑکا سلکارو کو پسند ہے۔" آدی واسیوں کی ریت ہے کہ جب تک لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے اس وقت تک ان کی شادی نہیں ہوتی اور یہ بات وہ ان کے میل ملاپ سے معلوم کر لیتے ہیں۔ مگر سلکارو کا میل تو کسی سے بیٹھ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لا رہی تھی۔

ایک دن جب لہکا صبح سویرے سو کر اٹھا تو اس نے پنیا سے کہا ـــــــــــــ

"رات بڑا دیو سپنے میں آیا تھا ـــــ!"

"اچھا ـــ!" پنیا جیسے خوشی سے اچھل پڑی۔

"جانتی ہے کیا کہہ رہا تھا ـــ؟ لہکا نے تن کر کہا۔

"جا نہیں بتاتا کیا کہہ رہا تھا ـــ!" پنیا کی آنکھیں مسکرائیں اور جھک گئیں

"اب کے لڑکی نہیں ہوگی۔ لڑکا آئے گا" پچاس برس کا بوڑھا جوانی کی شرارت آنکھوں میں بھر کے بولا۔

"جھوٹ ـــ!"

"دیوتا جھوٹ نہیں بولتے پنیا" لہکا اپنی بڑھیا پر جھک کر بولا "دیوتا نے کہا ہے۔ لڑکا آدھی برسات گزر جانے کے بعد اس وقت آئیگا جب ہمارے کھیت میں دھان نکل آئیگا ـ!"

"کیا آکاش سے ٹپکنے والا ہے لڑکا ـ؟" پنیا کو شاید اپنے پیٹ کا خیال آ گیا تھا جو دھان کی خالی ڈھولی کی طرح ویران تھا اور لہکا کھکھلا کر ہنس پڑا ـــ اور جب سنجیدہ ہوا تو بولا ـ بات تیرے لڑکے کی نہیں کہہ رہا ہوں پنیا۔ اس لڑکے کی کر رہا ہوں۔ جسکو بڑا دیو ـ اپنی سلکارو کے لئے بھیجنے والا ہے "

"سچ ـــــ" پنیا بولی

"ہاں ـ اور اس کا رنگ بھی اپنے کھیت کی طرح کالا ہوگا۔ وہ ہمارے ہی گاؤں میں رہے گا۔ اور گاؤں میں آتے ہی پنیا سے بیاہ کرے گا

ساری بات لہکا ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔ اور بینیا کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ سلکارو پانی کا گھڑا اٹھائے سامنے سے آتی دکھائی دی اور بینیا کی بات منہ کے منہ میں رہ گئی لیکن نگاہیں سلکارو کی بھرپور جوانی کے پیچ و خم میں الجھ گئیں۔ ایسی جوانی تو بینیا نے کسی کی بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ بھی تو جوان تھی اس کا جسم بھی تو گدرایا تھا۔ بھرے بھرے بازو ابھرے ابھرے گال تنا ہوا سینہ مٹکاتی آنکھیں۔ ہرنی جیسی چال۔ ناگن جیسی بل کھاتی کمر اس کو اپنی ایک ایک ادا یاد آ گئی۔ لیکن اس کی لڑکی ہر بات میں اسکو مات دے رہی تھی۔ اور بینیا شرما سی گئی جیسے سچ مچ ہار گئی ہو

اور برسات ——— جیسے اب کے برس پڑنے ہی والی نہ ہو مہرگ ٹھہر گیا۔ پانی کی ایک بوند نہیں گری۔ سورج اسی طرح تمتماتا رہا جس طرح بھرپور گرمی میں آگ اگلتا ہے۔

ہل کیسے چلیں گے ———؟

جانور کیسے جئیں گے ———؟

تالاب سوکھ گئے ———!

کنویں اتر گئے ———!

اور جانور بن پانی اور چارے کے مرنے لگے۔

ایک ساتھ بے شمار سوال کسانوں کے دماغوں میں اٹھتے، صبح سے شام تک کتنی بار ان کی نگاہیں آسمان کی طرف جاتیں اور مایوس ہو کر لوٹ آتیں دور دور تک آسمان پر ابر کا کوئی ٹکڑا نظر نہ آتا۔ راتوں کو بے شمار تارے چمکتے۔ چاند مسکراتا تاروں کی چمک اور چاند کی مسکان نشتروں اور برچھیوں کی طرح کسانوں کے سینوں میں اتر جاتیں۔ وہ گاؤں جو ایسی حسین راتوں میں رنگین ہو جاتے مسان کی طرح بھیانک دکھائی دینے لگے۔ نہ کہیں کوئی بانسری کی لے پر پریم گیت گاتا نہ کسی چوپال سے ڈھول کی تھاپ سنائی دیتی نہ کہیں رام ستھا کی چہل پہل ہوتی نہ کہیں رہلا ناچ کا ہنگامہ برپا ہوتا سرِ شام ہی لوگ اپنے بستروں پر چلے جاتے اور مسکراتے ہوئے چاند تاروں کو یوں سہمے سہمے دیکھتے جیسے یہ رنگینیوں کے پیامی نہ ہوں اداسیوں کے افسانہ خواں ہوں اور جب گاؤں کے آوارہ کتے بھونکتے دلدوز آوازیں نکالتے اور پھر ایک ساتھ ملکر رونے لگتے تو ہر طرف ہو کا عالم چھا جاتا دل بیٹھنے لگتے نیندیں اڑ جاتیں بچے ماؤں کے سینوں سے چمٹ جاتے کنواریوں کے سُندر سپنے ٹوٹ جاتے اور سہاگنیں لرزتے ہاتھوں سے کان بند کر لیتیں۔

ایسی ہی ایک رات میں لہکا ہڑبڑا کر اپنی بانس کی کھاٹ سے اٹھا اس نے نیند میں کسی کے گرنے کی آواز سنی تھی بینیا سلکارو کے قریب زمین پر بے سدھ سو رہی تھی اور سلکارو جوانی کی نیند میں چاند کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھی لہکا کھاٹ سے اچھلا اور اس اچھال میں کمزور کھاٹ پر اس کا بھرپور وزن پڑ گیا۔ کھاٹ ٹوٹ کر زمین پر آ پڑی اور اس کی آواز نے بینیا اور سلکارو کو بیدار کر دیا دونوں نے دیکھا کہ کھاٹ ٹوٹی پڑی ہے اور لہکا غائب ہے۔

لہکا دوڑ کر بیلوں کے کوٹھے پر پہونچ گیا تھا اور اب بھرائی آواز میں بینیا کو پکار رہا تھا ——— بینیا ——— اری بینیا"

لہکا کا ایک بیل زمین پر گرا پڑا تھا۔ اور دوسرا بیل مرے بیل کے منہ کو چاٹ رہا تھا۔

پچھلی کئی راتوں سے گاؤں بھر کے بیل بن چارے اور پانی کے مر رہے تھے۔ لیکن لہکا اس نقصان سے بچا ہوا تھا۔ اس کے پاس چارہ تھا۔ مگر پانی ——— پانی دور دور تک کہیں نہیں تھا گاؤں کا تالاب کبھی کا سوکھ چکا تھا۔ ایک کنواں انسان کو پانی دیتا یا جانوروں کو اور

وہ بھی اتنا اتر گیا تھا کہ گاؤں کے لوگوں کو بھی مشکل سے پانی ملتا تھا۔ دو تین دن سے جانوروں کو پانی نہیں مل رہا تھا۔ تالاب بھرا گیا جا رہا تھا مگر پانی نیچے ہی اترتا چلا جا رہا تھا۔ صبح سے شام تک گاؤں بھر کے جانور تالاب کی گیلی مٹی چاٹتے پھر بھی ان کی پیاس نہ بجھتی اور وہ وہیں پڑے رہ جاتے لہکا اپنے بیل جاکے لے آتا ۔ ان سے اتنا ہی پیار تھا جتنا اپنے کالی مٹی کے کھیت سے پھر بھی سفید بیل زندگی کا سہارا ہوتے تین سال پہلے جب اس کی بھرپور فصل ہوئی تھی۔ چھ کوڑی دھان دے کر اس نے یہ بیل اس دھن گر سے خریدا تھا۔ جوڑی لے کر اس کے گاؤں آیا تھا اور سیدھے لہکا کے پاس۔ جیسے اس دھن گر کو بھی بڑے دیو نے بھیجا تھا۔ اور پھر یہ بیل سچ مچ بڑے دیو کی دین ثابت ہوئے کچھ ہی دنوں میں ان کا روپ رنگ ایسا نکھرا کہ گاؤں بھر کی نظریں انکو لگنے لگیں۔ بنیا نے کالے دھاگے پر و کر ان کے گلے میں باندھ دیئے تھے۔ مرچوں سے ان کی نظر اتاری تھی اور پھر اس دن سے اکثر نظر اتار دیا کرتی تھی۔

لہکا تو جیسے آنسوں ٹپکا کر خاموش کھڑا رہا مگر بنیا سے یہ غم نہ سہا گیا وہ چیخ کر بیل سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی سلکارو کی بھی آنکھیں بھر آئیں وہ بھی ماں سے لپٹ گئی حالانکہ اسکو ان بیلوں سے کبھی پیار نہ ہوا تھا جس دن یہ جوڑی اسکے باپ نے خریدی تھی اس دن اس نے ماں سے کہا تھا "کالی مٹی میں سفید بیلوں کے قدم اچھے نہیں ہوتے ماں" اور ماں نے سلکارو کو یوں دیکھا تھا۔ جیسے وہ اس کی بیٹی نہ ہو دشمن ہو۔ کالے اور سفید میں جنم جنم کا بیر ہوتا ہے۔ جیسے کالے چمڑے پر کوڑھ کے سفید داغ اور یہ بات ماں سے زیادہ شاید بیٹی کو معلوم تھی۔

اور پھر صبح ہو گئی۔

ایک کے بعد ایک خبر آنے لگی۔ جھلما کی گائے مر گئی۔ شکور کا پلیا (بھینس) تالاب میں مرا ملا۔ مرکا کے دونوں بیل دم توڑ رہے ہیں کلیارو کا ایک بچھڑا بگوا اٹھا لے گیا۔ دور یچھ گاؤں کے کنوئیں پر رات بھر پڑے رہے۔ بوڑھے برگد پر بسیرا کرنے والی ابابیلیں ٹپ ٹپ گر رہی ہیں۔ اور لہکا کو ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے سنسار بھر کے سارے تالاب ساری ندیاں سارے جھرنے سارے کنوئیں اور پانی کے سارے سوتے خشک ہو گئے سوکھ گئے

اور سورج کے چڑھنے سے پہلے گاؤں کے سارے لوگ پھر ایک بار تالاب پر جمع ہو گئے۔ تالاب کی کھدائی شروع ہو گئی پھر تالاب کا سینہ گہرا ہونے لگا۔ گیلی مٹی نکلتی گئی اور پیاس سے نڈھال جانور اس مٹی پر یوں لوٹنے لگے۔ جیسے گدھ مردار پر لوٹتے ہیں۔

مگر لہکا نے آج کدال نہیں اٹھائی وہ دور کھڑا گاؤں والوں کو یوں دیکھنے لگا۔ جیسے وہ پہاڑ کھود کر دودھ کی نہر نکالنے جا رہے ہوں، انکے پیشانیوں سے ٹپکنے والے پسینے کی ہر بوند اسے خون کی بوند نظر آنے لگی جو وہ ایک ایسی دھرتی پر ٹپکا رہے تھے جس کی پیاس شریانوں کا سارا لہو دینے پر بھی نہیں بجھ سکتی۔ اور بالآخر سورج کی بڑھتی تمازت کے ساتھ گاؤں والوں کے بازو ڈھیلے پڑنے لگے کدالیں چھوٹنے لگیں پھاوڑے ٹھہر گئے سبل جم گئے اور تھکے ہارے محنت کش اپنی محنتوں کا بدلہ حاصل کئے بغیر گھروں کو لوٹ پڑے۔

"اب ہماری مدد بڑے دیو کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔!

سر شام۔ چوپال پر گاؤں کی پنچائت کی سردعات کرتے ہوئے لہکا نے کہا۔ لہکا گاؤں کا پٹیل بھی تھا اور پجاری بھی ہر سنکٹ کے وقت اس کو گاؤں والوں کی رہنمائی بھی کرنی پڑتی تھی، اور دیوتا کو پرسن (راضی) کرنے کا جتن بھی انسانی طاقت دھرتی کے سینے سے پانی حاصل کرنے میں ناکام ہو چکی تھی۔ اب ایک ہی مارگ تھا کہ دیوتا کے آگے سس نوائے جائیں اور

اس نے برے وقت میں کام آنے کی پرارتھنا کیجائے۔

"کل ہم لوگوں کو پولو کرنا چاہیئے اور صبح سویرے ہی دیوتا کے چرنوں میں پہونچ جانا چاہیئے۔ بھائیو۔۔آپ لوگوں کا کیا خیال ہے۔؟" لہکا نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

مگر اب بڑی قربانی کے بغیر دیوراضی نہیں ہوگا۔" یہ گاؤں کا ایک معزز آدمی تھا جو ایک کونے سے بولا۔ اور پھر اس کی اس آواز پر پنچایت میں سناٹا چھا گیا۔ بڑی قربانی کون دے گا۔ شاید سب کے دل میں ایک ساتھ ہی ایک سوال اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ برسوں سے چلی آئی روایات کے مطابق برسات شروع ہونے سے پہلے ہی گاؤں والے دیوتا کے چرنوں میں جانوروں کا خون دے دیا کرتے ہیں۔ اور وہ خون یہ دے چکے تھے۔ ظاہر تھا کہ دیوتا کو یہ قربانی قبول نہیں ہوئی تھی۔ ورنہ اب تک پانی ضرور پڑ گیا ہوتا۔ اور بڑی قربانی کا مطلب تھا انسانی جان کی بلی۔ پھر دیوتا آدی واسیوں کی قربانی ذرا کم ہی قبول کرتا ہے۔ غیر آدی واسی کی تلاش مشکل بھی تھی اور قانون شکنی بھی۔ لہکا بھی گہرے سوچ میں پڑ گیا۔ کافی دیر تک پنچایت میں سکوت چھایا رہا۔ سوائے کھانسنے اور کھنکارنے کے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی آخر یہ سکوت لہکا کو ہی توڑنا پڑا۔

بھائیو۔ بڑی قربانی کا فیصلہ یکایک نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے دیوتا کی مرضی معلوم کرنا ضروری ہے اگر اس کی مرضی ہوئی تو ہم بڑی قربانی دینے سے بھی منہ نہیں موڑیں گے۔ اس لئے میری رائے ہے کہ ہم کل پولو کریں اور چھوٹی قربانی دیں اسی وقت ہم دیوتا کی مرضی بھی معلوم کریں گے۔"

پنچایت ختم ہوگئی لوگوں نے لہکا کی تجویز مان لی تھی۔ لیکن لہکا کا جو قدم بھی گھر کی طرف اٹھ رہا تھا۔ ایک من کا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اپنی قوم سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس کی قوم کے دل میں جو بات ایک بار بیٹھ جاتی ہے وہ پھر نکالے نہیں نکلتی وہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ آج کی پنچایت میں میری قوم بڑی قربانی دینے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اور کل دیوتا سے بھوگ کے بعد مجھے بھی کہنا پڑے گا۔ کہ دیوتا بڑی قربانی چاہتا ہے۔ اور اگر میں نے ایسا نہیں کیا تو اس کا نتیجہ بڑا بھیانک نکل سکتا ہے۔

لہکا جب گھر پہونچا تو اس کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ پنیا سے کچھ کہے بغیر جو کھانے پر اب تک اس کا انتظار کر رہی تھی اسی ٹوٹی کھاٹ پر لیٹ گیا جس کے انجر پنجر صبح ہی ڈھیلے ہو گئے تھے اور جس کو پنیا نے جوں توں ٹھیک کر لیا تھا۔

پنیا کچھ دیر تک انتظار کرنے کے بعد خاموشی سے سلکارو کے پاس جا کر لیٹ گئی اس کا من بھی تو بھاری تھا بیل کی موت سے اسکو وہی صدمہ ہوا تھا۔ جو ایک ماں کو اپنے بیٹے کے مرنے سے ہوتا ہے کافی رات گئے تک وہ بھی نہ سو سکی لہکا تو بار بار کروٹ بدلتا رہا اور اس کی ہر کروٹ کے ساتھ ٹوٹی کھاٹ کی آواز گونج اٹھتی اور اس کی ہر گونج سے لہکا کے خیالات میں ایک نیا طوفان اٹھ کھڑا ہوتا۔ پانی کا قحط گاؤں والوں کی منشا بڑی قربانی بڑا جرم۔ پولیس داروغہ۔ ہتھکڑیاں، جیل پھانسی۔ پنیا اور سلکارو۔ جس کا بیاہ اسے بیچ برسات میں کرنا تھا۔ دیوتا اسے سپنے میں بتا چکا تھا کہ سلکارو کو اس کے جیسا ہی بر بیاہنے آنے والا ہے۔ اور جب وہ خیالوں کے ان طوفانوں سے گھبرا جاتا تو کھاٹ پر سیدھا لیٹ کر کھلے آسمان کو نہارنے لگتا جس پر ان گنت تارے مسکرا رہے تھے۔ چاند ہلکے ہلکے گزر رہا تھا اور اس کے قریب چکوری چکر کاٹتی تھی اور پھر یہیں اسے پچھلے برس کا موسم یاد آ گیا کتنا کتنا ابر چھایا رہتا تھا۔ کیسے گھنگھور بادل امڈ امڈ کر آتے تھے کیسی زوردار بجلیاں کڑکتی تھیں اور پھر کیسی تیز برسات ہونے لگتی تھی۔

لیکن اب کے برس۔ اور لہکا ایک دم کروٹ ہو جاتا۔ جیسے اسے آسمان سے نفرت ہو۔ چاند ستاروں سے نفرت ہو چکوری اور اسکے پیار سے نفرت ہو۔ اور اس وقت گاؤں کے دوسرے کنارے پر تالاب کے میدان میں اکٹھا کتوں کے رونے کی آواز آنے لگی۔ اس کے کان میں پہونچتے ہی لہکا آنکھیں خود بخود بند ہو جاتیں۔ اور پھر وہ پوری طاقت لگا کر پلکوں کو آنکھوں کے اندر گڑا لیتا۔ دونوں ہاتھوں سے کان بند کر لیتا۔ اور بدن کو سکیڑ کر گٹھری ہو جاتا۔

اسی کشمکش میں رات کا ایک بڑا حصہ گزر گیا۔ پنیا صدمے سے نڈھال ہو کر گہری نیند سو گئی۔ اور سلکارو جوانی کے میٹھے سپنے دیکھنے لگی۔ کبھی کبھی اس کے منہ سے ہلکی سی آواز نکل جاتی جیسے وہ کسی سے بات کر رہی ہے۔ ایک ایسی ہی آواز لے لہکا کچھ زیادہ کروٹ بدل کر پلٹا۔ سلکارو بڑبڑا رہی تھی۔ اطمینان کی سانس لے کر اس نے بادل نخواستہ آسمان پر ڈالی اس کی نظر چاند کے پاس جا کر جم گئی۔ چاند سے کچھ ہی دور پر ایک کالا کالا ابر کا ٹکڑا لہرا رہا تھا۔ اس کے ارد گرد بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے۔ جو آہستہ آہستہ اس بڑے ٹکڑے کے پاس آ رہے تھے۔ لہکا نے ایک بار سارے آسمان کا جائزہ لے ڈالا۔ ان گنت ستارے اب اتنے رہ گئے تھے۔ کہ لہکا انہیں آسانی سے گن سکتا تھا۔ مگر ابر کے ٹکڑوں کا شمار اب مشکل ہو گیا تھا۔ اس شمار و قطار میں لہکا کو پچھم کی سمت بجلی چمکتی نظر آئی۔ اور اس نے سب طرف سے نظریں ہٹا کر پچھم کی سمت دیکھا۔ ایک کے بعد ایک ان گنت بجلیاں چمکنے لگیں اور انہیں کے ساتھ لہکا کی آنکھیں بھی چمک اٹھیں۔

دیکھتے دیکھتے چاندنی چاندنی سمٹ کر بادلوں کی گھنگھور گھٹا بن گئی۔ جہاں دودھ کا اجالا بکھرا ہوا تھا وہاں کالے کالے ناگ لہرانے لگے۔ لہکا اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے ایک ساتھ پنیا اور سلکارو کو جھنجھوڑا۔ دونوں گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ ابھی انہوں نے آنکھیں بھی پوری طرح نہیں کھولی تھیں کہ بادل زور سے کڑکا اور موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔

پنیا تو جلدی سے اٹھ کر چھپر کے نیچے چلی گئی۔ مگر سلکارو وہیں بیٹھی رہی۔ جیسے زمین نے اسے پکڑ لیا ہو۔ بوندیں تیز ہو گئیں تھیں سلکارو کا سارا بدن بھیگ گیا تھا۔ تب ہی لہکا جو ٹوٹی کھاٹ کو سنبھال کر چھپر میں رکھ رہا تھا۔ وہیں سے چیخا۔ ”اری اندر آ جا ——— بھیگ کیوں رہی ہے۔“

مگر سلکارو پھر بھی نہیں اٹھی۔ جیسے اس نے سنا نہ ہو۔ وہ کمبل بھی بھیگ گیا جس پر وہ سو رہی تھی۔ لہکا دو ڈگ مار کر سلکارو کے پاس پہونچ گیا۔ اور اسے پکڑ کر اٹھایا وہ یوں اٹھی۔ جیسے بہت پی لی ہو۔ لڑکھڑاتی ہوئی چھپر میں چلی گئی۔ لہکا نے بھیگا کمبل اٹھا لیا۔ اس کے نیچے کی زمین سوکھی تھی۔ اور وہاں سے ایسی گندھ اٹھ رہی تھی۔ جس کو سونگھنے کے لئے ہر کسان کی زمین پورے بارہ ماہ انتظار کرتی ہے۔ چند سانسوں کے لئے لہکا کے قدم بھی وہیں جم گئے مگر پانی کی تیز بوندوں نے اسے وہاں سے چلے جانے پر مجبور کر دیا۔ اور لہکا جب چھپر میں آکر اپنی کھاٹ پر بیٹھا تو اس کی ناک مٹی سے اٹھتی ہوئی سوندھی سگندھ سے بدمست ہو رہی تھی لہکا اس شرابی کی طرح جھومنے لگا۔ جیسے برسوں کے بعد اس کی من بھاتی شراب مل گئی ہو۔ اور پھر اسی ترنگ میں نہ معلوم کیا کیا گانے لگا۔

پنیا اور سلکارو گیلا کمبل الٹا بچھا کر لیٹ گئے۔ پنیا تو لہکا کی مستانی ترنگوں میں کھو گئی۔ اور وہ دکھ بھول گئی جو اسے بیل کے مرنے سے ہوا تھا۔ لیکن سلکارو بیٹھتے ہی پھر سپنوں کے سنسار میں کھو گئی۔ شاید وہ بھی اپنے باپ کی طرح اس لڑکے کا سپنا دیکھ رہی تھی جو اسکو بیاہنے آدھی برسات میں آنے والا تھا۔ اسی طرح کا کالا تندرست۔ الھڑ۔

اب برسات اپنے پورے شباب پر تھی۔ بادل گرج رہے تھے بجلیاں چمک رہی تھیں۔ اور گھنگھور گھٹائیں برس رہی تھیں۔ یوں لگ

رہا تھا کہ یہ سلسلہ اب کبھی ختم نہ ہوگا۔

معاً لہکا کے دماغ کو ایک زور کا جھٹکا لگا۔ جیسے اس کے سر پر کسی نے ہتھوڑا مار دیا۔ سینے میں سوئی چبھو دی ہو۔ اور پھر اس کے دل کی ساری خوشیاں الاؤ کا دھواں بن کر اڑ گئیں۔ اس کے منہ سے نکلنے والے آنسو بھرے بول الٹی سانس کے ساتھ اس کے سینے میں یوں قید ہوگئے جیسے کسی نے اپنی مضبوط ہتھیلی اس کے ہونٹوں پر رکھ دی ہو۔ اور وہ اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اپنی اس زمین کو کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ جس کے سینے پر اب پانی کی دبیز چادر پھیل چکی تھی۔ جسکے چوڑے چکلے سینے کے بیچوں بیچ بہتا ہوا ایک چھوٹا سا نالہ ندی کی ایک بڑی دھار بن گیا تھا۔ اور یہی وہ دھار تھی جو ایسی ہی تیز برسات میں اسکے کھیت کے لئے بلا بن جاتی ہے۔

لہکا نے اپنی پھٹی آنکھوں کی پتلیوں کو پھیر دیا۔ آکاش پر گھٹائیں برابر امڈتی چلی آ رہی تھیں۔ اور دور تک کہیں سفیدی کا نشان نہیں تھا۔ بادل ویسے ہی گرج رہے تھے۔ بجلیاں ویسی ہی کڑک رہی تھیں۔ اور بوندیں اس تسلسل کے ساتھ گر رہی تھیں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس ڈھونکنی کی طرح جو اس کے گاؤں کا لوہار بکر کی پاسیں گرم کرتے وقت دھونکتا ہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا لہکا نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لئے۔ جیسے وہ دل کو مضبوطی سے پکڑ لینا چاہتا ہو۔ مگر دل بے قابو ہو چکا تھا۔ لاکھ کوششوں پر بھی لہکا کے قابو میں نہ آسکا۔ دھڑکتا ہی چلا گیا اور اس وقت تک دھڑکتا رہا جب تک بادل گرجتے رہے بجلیاں کڑکتی رہیں اور گھٹائیں امڈ کر برستی رہیں

رات کے پچھلے پہر گاؤں کے کسی مرغ نے بانگ دی اور لہکا کا دل جیسے تھم سا گیا اس نے آکاش کی سمت نگاہ اٹھائی وہاں اب کالی گھٹائیں نہیں تھیں بادلوں کی گرج بند ہو چکی تھی۔ بجلیوں کا کہیں نشان نہیں تھا۔ اور پھر اس نے اپنے کھیت کیطرف نگاہوں کو کر دیا وہ دھندلا دھندلا سا نظر آنے لگا تھا۔ لیکن کالی زمین کا کہیں بھی پتہ نہ تھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی دکھائی دے رہا تھا۔ ٹھہرا ہوا حد نظر تک پھیلا ہوا۔

لہکا کو کچھ سکون سا محسوس ہوا اس کے دل کی دھڑکن اپنی رفتار پر آگئی۔ اور وہ قریب اطمینان کی سانس لے کر آہستہ سے اپنی ٹوٹی کھاٹ پر لیٹ گیا۔ نیند تو پہلے ہی اس کی آنکھوں سے اڑ چکی تھی۔ وہ محض اپنی پیٹھ کی ہڈی سیدھی کرنے کے لئے لیٹ گیا تھا پاس کی چھال سے بنی ہوئی کھاٹ کی ننگی پیٹھ پر لیٹتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ برف کے تودے پر لیٹ گیا ہے۔ لیکن یہ برف بھی اس وقت اسے روئی کا گالا معلوم ہو رہی تھی۔ اس لئے کہ اس کی بوڑھی ہڈیاں پچھلے بیس بائیس گھنٹوں سے مسلسل محنت کرتی چلی آ رہی تھیں لگاتار بیٹھنا بھی تو ان ہڈیوں کے لئے ایک محنت ہی تھی اور پھر کچھ ہی دیر میں برف کے تودے کی سردی گرمی میں بدل گئی۔ اسکی سوکھی چمڑی سے دن بھر کی گرمی پھوٹ پڑی تھی۔ اور اس سردی اور گرمی نے لہکا کی آنکھوں میں خواب کا نشہ بھر دیا۔ جیسے اس نے ٹھنڈی تاڑی اور مہوے کی گرم گرم شراب ملا کر پی لی ہو۔

اور پھر جب اس کے گھر کے مرغ نے بانگ دی تو لہکا نے بڑبڑا کر کروٹ بدل لی مرغ مسلسل بانگیں دیتا رہا۔ اور اس کی ہر بانگ پر نیند میں لہکا اسے ایک موٹی سی گالی دیتا۔ حالانکہ آج سے پہلے اس مرغ کی پہلی بانگ پر لہکا تڑپ کر اٹھ بیٹھتا تھا۔ لیکن آج اسی کو وہ کوس رہا تھا۔ اور پھر شاید لہکا کی گالیاں مرغ کے کانوں تک پہونچ گئیں اور وہ یکدم چپ ہو گیا۔ مگر لہکا کے نصیب میں تو آج کی رات کا آرام محروم ہو چکا تھا۔ اور پھر اسے ایک ایسی صبح دیکھنی تھی۔ جو اس نے پوری زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی اور نہ آئندہ دیکھنے والا تھا۔

مرغ کو چپ سادھے ابھی چند ہی لمحے گزرے ہونگے کہ سپیدۂ سحر نمودار ہوا اور اسی کے ساتھ ایک دلدوز چیخ فضا میں بلند ہوئی۔ اس کے کان میں پڑتے ہی لہکا کی نیند کوسوں دور بھاگ گئی۔ اور وہ بجلی کی سی تڑپ سے اٹھا مگر اس سے پہلے کہ وہ کھاٹ سے کود کر چیخنے والے کو تلاش کرتا۔ کھاٹ کے پچھلے پائے ٹوٹ کر زمین پر پھیل گئے۔ اور کھاٹ کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے لہکا نے نیم خوابیدہ آنکھوں سے کھاٹ کے ٹھیک سامنے ایک سیاہ ناگ پھن پھیلائے بیٹھا پایا۔ اس پر نظر پڑتے ہی لہکا کی آنکھیں گویا پھٹ گئیں۔ سانپ تو اس نے بے شمار دیکھے اور مارے تھے مگر ایسا بھیانک سانپ اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ اس کے سیاہ پھن پر سیاہ رنگ کا ہی ایک تاج تھا۔ اور پورے جسم پر بڑے بڑے سیاہ بال کھڑے تھے۔ اس کی آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اور منہ سے ایک ساتھ کئی زبانیں باہر آ جا رہی تھیں۔

یہ وہ منظر تھا جسے دیکھ کر بڑے سے بڑا حوصلہ مند آدمی بھی حواس کھو سکتا تھا۔ اور تھوڑی دیر کے لئے لہکا ہکا بکا رہ گیا۔ اور یہ بھول گیا کہ جس چیخ سے وہ بیدار ہوا وہ کس کی تھی۔ کدھر سے آئی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ لہکا اپنے حواس درست کرتا سانپ نے پھن ڈال دیئے اور آہستہ سے مڑ کر چھپر کے نیچے پانی میں اتر گیا۔

سانپ کے نظر سے اوجھل ہوتے ہی لہکا اس طرف مڑا جہاں پنیا اور سلکارو سو رہے تھے۔ وہاں سلکارو تو لیٹی ہوئی تھی اور پنیا اس کے سینے پر بے ہوش پڑی تھی۔ سلکارو کے منہ سے ہرا پانی جا رہا تھا۔ اور اس کی بڑی بڑی پتلیاں آنکھوں کے حلقوں سے باہر نظر آ رہی تھیں پہلی ہی نظر میں سب کچھ سمجھ گیا۔ سانپ سلکارو کو ڈس چکا تھا۔ اور سلکارو دور بہت دور جا چکی تھی لہکا نے ٹوٹی کھاٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی اپنا سر نیچے جھکا لیا بالکل اسی انداز سے جس انداز سے بڑے دیو کے سامنے بڑی قربانی دینے کے بعد پجاری کو جھکانا پڑتا ہے۔ لیکن سر نیا ترخم کر دینے کے بعد بھی لہکا کے دماغ کے کسی گوشے میں وہ سپنا اب بھی لا نچل بنا ہوا تھا کہ نصف برسات کے بعد ایک لڑکا سلکارو کو بیاہنے آئیگا جو اس کی طرح کالا ہوگا۔ اور اسے فوراً بیاہ کر لے جائے گا۔

الیاس احمد گدی

وہ کون تھی؟

رات منگل چاچا کا دیہانت ہو گیا ۔!

صبح جب بڑی بہو نے سب سے چھوٹے بچے کا پوتڑا دھوکر اپنے بوڑھے سسر کو جگانے گئی تو اس نے دیکھا کہ بوڑھے کا منہ کھلا ہوا ہے اور اس پر مکھیاں بھنک رہی ہیں ۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن الٹ کر پتھرا سی گئی تھیں ۔ بڑی بہو اس سے پہلے اپنے دو بچوں اور ایک دیور کو مرتے ہوئے دیکھ چکی تھی لہٰذا یہ سمجھنے میں اسے دیر نہ لگی کہ بوڑھا سنسار سے ناتا توڑ چکا ہے ۔ گھبرا کر پانی کا لوٹا وہیں زمین پر پٹک کر وہ چیخی ۔ دیکھتے دیکھتے سارا گھر اکٹھا ہو گیا ۔ رونے اور چلانے کی آوازیں ابھریں اور ساتھ ہی محلے کے لوگ دوڑ پڑے اور ذرا سی دیر میں ساری بستی میں خبر ہو گئی کہ رات منگل چاچا کا دیہانت ہو گیا ۔

بڑی بہو کو اس گھر میں آئے کوئی پندرہ برس گزر چکے تھے ۔ وہ تب آئی تھی جب کارخانے کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا ۔ آج جہاں بڑی بڑی چمنیاں دکھائی دیتی ہیں جہاں پکے کوارٹر ہسپتال اور اسکول ہیں وہاں حد نظر تک دھان کے کھیت ہی کھیت تھے ۔ کہیں کہیں کوئی پوکھر تھا ۔ ایک طرف ایک اونچی سی زمین تھی جہاں شام کے وقت لوگ کبڈی کھیلتے تھے ۔ کرما کا میلا لگتا تھا اور جب دھان کٹتا تھا تو میں کھلیان بھی لگتا ۔ رات رات بھر جاگ کر لوگ پہرہ دیتے ۔ کانوں پر ہاتھ رکھ کر جھومر گاتے ۔

بھئی گیلو گے دھانی نیناں کجر لور بہئی گیلو!

(سکھی آنکھوں کا کاجل آنسوؤں میں بہہ گیا ہے)

اور پھر ڈھولک کی تھاپ تھی ۔ دل کی دھڑکن تھی ، اور دھان کی خوشبو اور کہیں کسی الہڑ سی لڑکی کے پیروں کی بجتی ہوئی جھانجھ ...!

یہ سب باتیں کسی طویل کہانی کی طرح بڑی کے ذہن میں محفوظ تھیں ۔ اسے اپنی بارات بھی یاد تھی ۔ پھر شادی کی وہ پہلی رات بھی یاد تھی اور پھر اپنے سسر کا وہ دلار بھی یاد تھا کہ چھ مہینے تک وہ محض گھر کے آنگن تک گھوم سکتی تھی ۔ جب بھی وہ کھیت پر جانا چاہتی بوڑھا اسے روک دیتا ۔

۔بیٹی ابھی ذرا آرام کر لے ۔ کام کرنے کے لئے تو سارا جیون پڑا ہے ۔

اور پھر وہ ننھے منے دیور تھے جن سے دن بھر ہنسی ٹھٹھا ہوتا رہتا ۔ تب گوپال کے من میں اتنا بھید بھاؤ نہ تھا ۔ نہ اسے آنکھیں لال پیلی کرنی ہی آتی تھیں ۔ یہ سب تو بہت بعد میں ہوا ۔ جب چھوٹی آئی اور گوپال کو منتر سکھلانا شروع

کیا۔ کہتے ہیں چھوٹی نے اسے پان میں کچھ کھلا کر اس کا من اپنے بس میں کر لیا تھا۔ کم از کم منگل چاچا کا تو یہی خیال تھا اسی لئے جب سے وہ آئی تھی اور جب سے گوپال کے تیور بدلے تھے اس نے گھر کے معاملات میں دخل دینا ہی چھوڑ دیا تھا۔ البتہ کبھی کبھی اپنی چھوٹی اور کنواری لڑکی سنتو کو ڈانٹتا تھا جو چھوٹی کے ساتھ بہت زیادہ رہتی تھی۔ اس کے بوڑھے دماغ نے کئی بار سوچا تھا کہ آخر چھوٹی کا کیا ٹھیک۔ کہیں اسے بھی کچھ کھلا کر اس سے نہ چھین لے۔ یہ ڈر یہ خوف، یہ اندیشہ بوڑھے کی زرد آنکھوں میں ہر وقت جھلکتا تھا۔ آج بھی جب بڑی نے اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں دیکھی تھیں تو اس وقت بھی وہی خوف نمایاں تھا۔ بے بسی، درد، خوف اور کمتری کا ایک ایسا امتزاج اس کی آنکھوں میں تھا کہ ان کی طرف دیکھتے ہی خوف محسوس ہونے لگتا تھا لیکن بڑی نے ان کی آنکھوں سے کبھی ڈر محسوس نہ کیا کیونکہ وہ آنکھوں کی اس کیفیت سے آگاہ تھی۔ اسے تو صرف اتنا معلوم تھا کہ کبھی یہ آنکھیں روشن تھیں۔ ان میں زندگی کی چمک اور مسرت کی روشنی تھی۔ پھر کڑی مشقت اور کھیتوں کی کڑی دھوپ ان آنکھوں میں زردی گھولتی گئی اور اب وہ آنکھیں اتنی پیلی تھیں جیسے کسی بیمار کی آنکھیں ہوں۔

ان آنکھوں میں ایک پوری کہانی دفن تھی۔ ان آنکھوں نے چھپن برس کی طویل مدت میں اس دنیا کو اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا تھا ان آنکھوں نے وہ منظر بھی دیکھا تھا جب وہ لڑکوں کی ایک ٹولی بنا کر زمیندار کے باغ کے امرودوں پر شب خون مارا کرتا تھا اور رکھوالے گالی بکتے ان کے پیچھے دوڑتے تھے اور زمیندار انہیں بندھوا کر پٹوایا کرتا تھا۔ پھر وہ زمانہ بھی آیا جب وہ دن بھر کھیتوں میں ہل چلاتا۔ چڑیاں اڑاتا۔ خلائی کرتا اور رات بھر اپنی نئی نویلی دلہن کی ناز برداری کرتا۔ پھر اس کا بڑا لڑکا رجو آدھمکا۔ پھر رامو۔ پھر گوپال۔ پھر سنتو اور سب کو خوش رکھنے کی خواہش میں شدید محنت اور رجو کی ماں کی موت بھی یاد تھی۔ کیسے وہ کھانس کھانس کے مر گئی۔ کہتے ہیں اسے ٹھنڈ لگ گئی تھی اور وہ جسم کیا سوکھ گیا تھا جیسے کسی بانس میں کھال منڈھ دی گئی ہو۔ اس نے رجو کی ماں سے بیشمار لڑائیاں لڑی تھیں بے شمار دفعہ اسے پیٹا بھی تھا۔ اس کے بال بھی نوچے تھے۔ اسے ماں بہن کی گالیاں بھی دی تھیں اور پھر اسے پیار بھی کیا تھا اور پھر تیس سالہ سال کی رفاقت کو۔ محبت کو۔ چتا پر لٹا کر خود اپنے ہاتھوں سے آگ بھی دکھائی تھی۔ اس روز وہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں سے لپٹ کر کتنا رویا تھا۔ کتنا رویا تھا جیسے بیچ ساون کی گھڑی ہو۔ پھر وہی محنت تھی۔ وہی کھیت تھے۔ وہی دھوپ تھی۔ اور رجو کی ماں کی یاد کسی سنہرے خواب کی طرح اس کے ذہن کے کسی بہت اندرونی گوشے میں دبک گئی تھی۔

پھر اس کے ننھے ننھے مریل بچے جوان ہوتے گئے۔ ان کے جسموں پر گوشت جمنے لگا ان کی مسیں بھیگنے لگیں اور اس کے دل پر سے غم اور تنہائی کی کینچلی اترتی گئی اور آخر اس نے اپنے بڑے لڑکے کا بیاہ کر دیا وہ ننھی گڑیا جیسی دلہن اس کے گھر آئی تو اسے لگا جیسے بیتے ہوئے دن لوٹ آئے۔ جھانجھ کی آواز سونے آنگن میں ایسے ابھرنے لگی جیسے کسی مدتوں کے اجاڑ کھیت میں قد آدم دھان کی بالیاں جھوم اٹھی ہوں۔ اسی روز وہ آنکھیں چھلکی تھیں پتہ نہیں خوشی میں یا غم میں۔ ایک کو کھونے کا غم ایک کو پانے کی مسرت۔ غم آمیز مسرت ایک عجیب بے نام سی کیفیت تھی اور اس کا دل آہستہ آہستہ ڈول رہا تھا۔

جیسے جیسے اس کے لڑکے بڑے ہوتے گئے ویسے ویسے اس کا اقتدار گھٹتا گیا۔ پہلے اس کے ہاتھ سے

بل گیا۔ پھر بیل گئے۔ پھر زمین گئی۔ پھر گھر کا سارا انتظام گیا لیکن اب بھی وہ بڑا پن باقی تھا جو ایک باپ کو ایک بیٹے کے گھر ملتا ہے۔ یہ بڑا پن تو اس وقت گیا جب اس کی دوسری بہو نے اپنا کلمُوں پاؤں اس آنگن میں رکھا پتہ نہیں اس نے گوپال کے کان میں کیا منتر پھونکا کہ وہ تو جیسے ایک دم ہی الٹ گیا۔ بیوی کے لئے بھاوج سے جھگڑا کیا۔ بڑے بھائی سے جھگڑا کیا۔ یہاں تک کہ ایک روز باپ پر بھی لاٹھی لے کر کھڑا ہو گیا۔ مجبور ہو کر منگل چاچا نے اسے آدھی زمین اور مکان کے دو کمرے دے کر الگ کر دیا اور خود بڑے لڑکے کے آنگن میں چارپائی ڈال کر پڑ گیا اور وہیں بڑی کے آنگن میں چارپائی پر پڑے پڑے ایک دن اس نے دیکھا کہ تین کاریں دھول اڑاتی۔ ہچکولے کھاتی اس اونچی زمین پر چڑھ گئیں جہاں کھلیان لگا کرتے تھے ان کاروں میں سے ڈھیر سے آدمی اترے۔ بہت دیر تک وہ گھوم پھر کر ساری زمین کو دیکھتے رہے۔ ندی کے کنارے بھی گئے۔ کتنی ہی تصویریں اتاریں گاؤں کے ننگ دھڑنگ بچے تماشہ سمجھ کر ان بابوؤں کے آس پاس منڈلانے لگے۔ بوڑھے اور جوان اپنی آنکھوں میں حیرت اور تجسس لئے انہیں یوں دیکھنے لگے جیسے وہ کسی دوسری دنیا سے آئے ہوں۔ تھوڑی دیر میں ساری بستی اونچے ٹیلے پر امڈ پڑی منگل چاچا نے بھی اپنی لاٹھی اٹھائی اور کھانستا ہوا ٹیلے کی طرف لپکا۔ پچھلے کئی مہینوں سے اسے دمے نے آدبوچا تھا اور تیز قسم کی کھانسی جیسے اس کے پھیپھڑے ادھیڑنے پر تیار تھی۔ راتوں کی نیند لٹ چکی تھی اور جسم آہستہ آہستہ پگھلنا شروع ہو گیا تھا۔

بستی کے دوسرے لوگوں کی طرح منگل چاچا بھی دوپہر تک یہ تماشہ دیکھتا رہا اور لوگوں کی طرح اس کی سمجھ میں بھی کچھ نہ آیا۔ البتہ شام کو جب اس کا بڑا لڑکا کھیت سے واپس آیا تو اس نے بڑی خوشی سے یہ خبر سنائی کہ اب یہاں ایک بڑا بھاری کارخانہ بنے گا۔ کس چیز کا کارخانہ بنے گا۔ کیسا کارخانہ ہوگا۔ اس کے اندر کیا کیا ہوگا۔ یہ سب اور کتنے ہی ایسے اور سوال تھے جن کا جواب اس کے بڑے لڑکے کے پاس بھی نہیں تھا لہٰذا ان تمام باتوں کو ایک مفروضہ سمجھ کر منگل چاچا نے اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔

کوئی ایک مہینے بعد ایک لمبا سا لفافہ ڈاکیہ دے گیا۔ پتے پر منگل چاچا کا نام جلی حروف میں لکھا تھا سالا گھر چکرا گیا۔ گوپال لفافہ لئے دوڑا دوڑا زمیندار کے یہاں گیا اور کوئی آدھ گھنٹہ بعد یوں گھبرایا ہوا لوٹا جیسے کوئی بہت بری خبر لایا ہو۔

"سرکار ہماری زمین لینا چاہتی ہے۔" اس نے اپنے باپ کو اطلاع دی۔ "یہ سرکاری خط ہے۔"

"زمین۔ ہم زمین نہیں دیں گے!" منگل چاچا نے فیصلہ کن انداز میں کہا

"لیکن اس میں لکھا ہے کہ اگر ہم زمین نہ دیں گے تو سرکار زبردستی ہماری زمین چھین لے گی۔"

منگل چاچا پر سکتہ طاری ہو گیا۔ بڑی دیر بعد بولا

"لیکن زمین تو زمیندار کے پاس بھی ہے۔ ہمارے پاس تو تھوڑی سی زمین...."

"سب لوگوں کی زمین لی جا رہی ہے۔ زمیندار کی بھی اور ساری بستی والوں کی بھی سنا ہے دوسرے گاؤں کی بھی زمین لی جائے گی۔"

مگر اتنی زمین - ؟ منگل چاچا حیران سوچتا رہ گیا ۔

زمین دینے کے بعد منگل چاچا کی جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی ۔ پہلے تو وہ اپنی لاٹھی کے سہارے کبھی کبھی منگو بخو اور گنگا دھر کے یہاں ہو آتا تھا ۔ کبھی کبھی پنڈتائین سے ہنسی ٹھٹھا بھی کر لیتا تھا لیکن اب تو ایسے گم سم ہو گیا تھا جیسے اس کے گھر ڈاکہ پڑ گیا ہو ۔ دن رات جھیلنگ چارپائی پر پڑا رہتا ۔ کبھی اس کروٹ کبھی اس کروٹ ہوتا اور کبھی چت لیٹ کر آسمان کو دیکھا کرتا ۔ وہی نیلگوں وسعت جسے اس نے سینکڑوں بار دیکھا تھا ۔ صبح کی دھند میں لپٹا ہوا بھی ۔ شام کی سیاہی میں کجلایا ہوا بھی ۔ کڑی دوپہر میں غبار آلود سا بھی اور ڈھلی ہوئی سہ پہر میں صاف و شفاف بھی اس وقت بھی جب اس کے حسن کو بادلوں نے چھپا لیا تھا اور اس وقت بھی جب اندر مہاراج نے سارے آسمان میں تاروں کے دیئے جلا رکھے تھے یہ آسمان اس کی ساری زندگی کا رازدار تھا ۔ اس کی محنت کا رازدار اس کی محبت اور نفرت کا رازدار !

منگل چاچا وہیں بڑی کے آنگن میں پڑا رہا ۔ جھیلنگ چارپائی کھنچتی رہی اور زمانہ ایک کے بعد دوسرا قدم اٹھاتا رہا ۔ منگل چاچا نے دیکھا ۔ بڑی بڑی مشینیں آئیں اور انہوں نے سارے کھیتوں کو ۔ کیاریوں کو اونچی نیچی زمین کو روئی کے گالے کی طرح دھنک کر رکھ دیا ۔ پھر اونچے ٹیلے پر جہاں کبھی کھلیان لگتا تھا ۔ جہاں برہا اور جھومر کی تانیں اڑتی تھیں جہاں کبڈی کا پالا بنتا تھا وہاں اینٹوں کا بھٹہ بن گیا ۔ دیکھتے دیکھتے اسکول بھی کھل گیا ۔ چھوٹی سی ڈسپنسری بھی قائم ہو گئی ۔ بیل گاڑیوں والا کچا راستہ کشادہ سڑک میں تبدیل ہو گیا اور قریب و دور کی ہزاروں عورتیں اور مرد اور بچے سندری پر اوڑ آئے اور ٹرکوں اور جیپ گاڑیوں کا تانتا سا لگ گیا اور دیکھتے دیکھتے سارا علاقہ ایسا ہو گیا کہ پہچاننا مشکل تھا ۔

زمین چھن چکی تھی اور زندہ رہنا ضروری تھا اسی لئے گوپال دو روپے روز پر ایک ٹرک پر نوکر ہو گیا ۔ بڑا لڑکا اب ادھیڑ ہو چکا تھا اور اپنے آپ کو اس محنت کے لائق نہ سمجھتا تھا اس لئے بھٹے پر اس نے چائے پکوڑی کی ، ایک چھوٹی سی دکان کر لی اور زندہ رہنے کا ایک دشوار گزار ہی سہی راستہ نکال لیا ۔

شہر سے بھی بے شمار لوگ آئے تھے اور اپنے ساتھ فیشن لائے تھے ۔ مختلف ایسی چیزیں بھی جو آج تک کسی بستی والے کے جسم سے نہ چھو سکی تھیں ۔ آمدنی بڑھی تو آرائشی چیزوں کا شوق بھی بڑھا نتیجہ اس تنگ چادر سا ہو گیا کہ اگر سر ڈھک لو تو پاؤں باہر نکلتا ہے اور اگر پاؤں چھپا لو تو سر کھل جاتا ہے ۔ اس تنگی کا اثر سب سے زیادہ گوپال پر پڑا ۔

چھوٹی ۔ بڑی کی طرح سادہ طبیعت کی نہ تھی ۔ بقول منگل چاچا بڑی تو گائے تھی گلے ۔ لیکن چھوٹی تو ایسی شیرنی تھی جسے اگر خون کی چاٹ لگ جائے تو اپنی جان پر کھیل جائے گی ۔ لہٰذا ادھر جب سے گوپال نے ٹرک پر نوکری کر لی تھی اسے شدید محنت کرنی پڑتی تھی اور وہ اتنا تھک جاتا تھا کہ بستر پر پڑتے ہی خراٹے بھرنے لگتا ۔ ادھر چھوٹی کو نت نئی آرائشی چیزوں کی چمک دمک نے شہر سے آنے والے لڑکوں کی فقرے بازی نے اس قدر ابھارا کہ وہ چہرے پر پاؤڈر تھوپنے اور سر میں خوشبودار تیل ڈالنے لگی ۔ آمدنی کم ۔ شوق زیادہ خوب لے دے

رہتی۔ گوپال اسے آدھی رات کو خوب پیٹتا۔ گالیاں بکتا اور وہ کسی لڑاکا کتیا کی طرح بھوں بھوں کئے جاتی۔ بالآخر اس نے ایک دن اعلان کر ہی دیا کہ وہ کارخانے میں اینٹیں ڈھونے کی نوکری کرے گی۔ منگل چاچا نے سنا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی — تو اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مہتو کی بہوئیں کارخانے میں نوکری کریں گی اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ کم از کم میرے جیتے جی تو یہ نہ ہو سکے گا۔ رگھو نے سنا تو وہ چپ رہا۔ ویسے بھی وہ دوسروں کے معاملوں سے بہت الگ تھلگ رہتا تھا۔ بلکہ خود اس کے گھر میں کیا ہو رہا ہے اس میں بھی اس نے دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی۔ لیکن چھوٹی کے اس اقدام پر سارا گھر خلاف تھا۔

لیکن زمانہ منگل چاچا کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ وہ چلاتا رہا۔ گرجتا رہا۔ منع کرتا رہا — پھر بھی چھوٹی نے نوکری کر لی۔ شروع شروع میں گوپال بھی اس کے خلاف تھا۔ کئی بار مارا۔ پیٹا بھی لیکن آہستہ آہستہ چھوٹی کی کمائی اور اس سے آنے والی خوشحالی کو دیکھ کر وہ بھی چپ رہا اور چھوٹی برابر ڈیوٹی پر جاتی رہی۔

آمدنی بڑھی تو شوق بھی بڑھا۔ نوکری کر کے چھوٹی نے خوب پر پرزے نکالے۔ اب وہ کھیتوں میں کام کرنے والی مہتو گھرانے کی بہو نہ تھی۔ نہ اس کے جسم پر لال کور کی موٹی سی ساڑھی تھی۔ کھٹاؤ مل کی باریک ململ کی ساڑھی بلاؤز اور بلاؤز کے اندر جھلکتا ہوا ٹائٹ۔ پاؤڈر۔ سینٹ، اسنو، پھر مانگ میں سیندور کی لکیر پاؤں میں ساڑھے چار روپے کا چپل۔ گرتی ہوئی جوانی کو جیسے اوٹ لگ گئی تھی۔ ڈھلتے ہوئے شباب کو جیسے سہارا مل گیا تھا۔ آہستہ آہستہ ٹھیکیداروں اور کارخانے کے آفیسروں کی آنکھ پر چڑھتی گئی اور بڑے بڑے داؤں کھیلے۔ نوکری جو عارضی تھی مستقل ہو گئی۔ تنخواہ جو ڈیڑھ روپے روز تھی پچھتر روپے ماہوار بن گئی۔ اب کبھی کبھی گوپال بھی اسے پیار کر لیتا۔ وہ چھوٹی کی اس تبدیلی پر بہت خوش تھا۔

منگل چاچا کی بوڑھی بجھی آنکھیں یہ ساری تبدیلیاں دیکھ رہی تھیں۔ اس کا دل دکھ رہا تھا کہ سالہا سال کی پشتہا پشت کی عزت خاک میں مل رہی ہے لیکن اس شور میں اس کی آواز — وہ تو جیسے کسی ہاتھ سے اتاری ہوئی مہندی کی طرح تھا یا کسی چوسی ہوئی گنڈیری کی طرح بے کار اور بے مصرف۔ اسے اس کا اور زیادہ افسوس تھا کہ سارے گھر میں کوئی بھی آدمی اس کے خلاف نہ تھا۔ کوئی ایک آدمی بھی نہ تھا جو اسے روکتا۔ منع کرتا۔ سب جیسے بے حس ہو گئے تھے سب کی غیرت جیسے مر گئی تھی۔

چھوٹی کی اس چمک دمک کا سب سے زیادہ اثر منگل چچا کی سب سے چھوٹی لڑکی سنتو پر ہوا تھا۔ بچپن کی سرحد پار کر کے وہ جوانی کی حدود میں قدم رکھ چکی تھی۔ چہرے پر ایسی ملاحت تھی اور جسم اس قدر دل آویز تھا کہ اچھے اچھوں کا من للچا اٹھتا۔ مگر بے چاری کو نہ اچھی ساڑی ملتی نہ کوئی آرائشی چیز۔ یوں چھوٹی بھابی سے لے کر کبھی پوڈر لگا لیا۔ کبھی اس کی ساڑھی پہن لی تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ چھوٹی اسے بہت پسند تھی۔ کیسے کیسے خوب صورت کپڑے پہنتی ہے کتنے اچھے اچھے زیور تھے اس کے پاس کانوں میں بالے۔ گلے میں سونے کا چین، پھر چاندی کے زیور تھے اور اس کے اپنے پاس تو کچھ بھی نہ تھا۔ صرف گلے میں چاندی کی سکڑی تھی اور ہاتھوں میں چاندی کے کڑے۔ موٹے بھدے جیسے بوڑھیوں کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ کام وہ بھی

کرنا چاہتی تھی مگر کارخانے میں کام اب تھا ہی نہیں۔ اب وہ پہلے والی بات نہ تھی کہ کام آدمی ڈھونڈتا تھا۔ اب تو کام کو آدمی ڈھونڈتے اور کام نہ ملتا۔ پھر چھوٹی کی خوشحالی دیکھنے کے بعد اب کسی کو اعتراض بھی نہ ہو سکتا تھا۔ ایک منگل چاچا تھے جو اس کے خلاف جا سکتے تھے سو وہ اب اتنے بوڑھے اور کمزور ہو گئے تھے کہ ان سے چارپائی سے ہلا تک نہ جاتا تھا۔ سنتو بڑی کوشش میں تھی یا کم از کم چھوٹی نے اس سے یہی کہا تھا کہ وہ اس کے لئے بہت کوشش کر رہی ہے۔

ایک عرصہ سے چھوٹی اس فکر میں تھی کہ کسی طرح سنتو کو پرسنل آفیسر سے بھڑا کر کام نکال لے کیونکہ خود اس کی ترقی بھی رکی ہوئی تھی۔ اس کام کے لئے سنتو کو آمادہ کرنا ایسا کچھ مشکل نہ تھا۔ دو چار چکنی چپڑی باتوں تھوڑی لالچ اور تھوڑی سی آرائشی چیزوں سے اسے راضی کیا جا سکتا تھا لیکن منگل چاچا کی وہ بیمار مگر خوفناک آنکھیں — ؟ وہ آنکھیں تو جیسے سنتو پر کسی پہرے دار کی طرح گڑی ہوئی تھیں۔ سنتو ذرا قدم گھر سے نکالتی کہ بوڑھے کی مری ہوئی بلغم میں الجھی ہوئی آواز گونجتی۔

"سنتو، سنتو! سنتو کہاں گئی ہے؟" وہ اپنی بڑی بہو سے پوچھتا اور بڑی بہو کے جواب دینے سے پہلے چیخنے لگتا۔ "کہاں گئی ہے سنتو؟ میں کہتا ہوں اسے کس نے گھر سے باہر جانے کو کہا… !" پھر کھانسی اٹھتی۔ دمے والی مسلسل کھانسی۔ اور اس کی پیلی آنکھیں یوں ابل پڑتیں جیسے کسی کو کھا جائیں گی۔ چھوٹی کو انہی آنکھوں سے بڑا ڈر لگتا تھا۔

وہ بھادوں کی اندھیری رات تھی جب اچانک ایک گاڑی آکر سڑک کے دوسرے کنارے کھڑی ہو گئی۔ گاڑی کی آواز سن کر منگل چاچا نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ تیز طوفانی بارش میں اسے ایک عورت کا سایہ دکھلائی دیا جو تیز تیز قدم رکھتا ہوا گاڑی کے پاس گیا۔ دروازہ کھلا اور غڑاپ سے اندر ہو گیا۔ ایک لمحے کے بعد گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ ہیڈ لائٹ کی تیز روشنی بارش کے قطروں کو موتی کے دانوں کی طرح جگمگاتی گزر گئی۔

منگل چاچا بہت دیر تک سوچتا رہا — "وہ کون تھی؟"

تیز بارش میں دروازہ کھولے ایک پاؤں باہر کئے وہ بار بار اپنے آپ سے پوچھتا رہا۔ وہ کون تھی؟ وہ کون تھی…؟؟ لیکن اس کا اپنا آپ خاموش تھا جیسے سچی بات بتانے میں پس و پیش کر رہا ہو — نہیں، نہیں! اس نے اپنے شک کو جھٹلانے کے لئے کہا

پھر اس نے سوچا کہ وہ اندر جا کر سنتو کو دیکھ آئے مگر وہاں اس کا بیٹا اور بہو سوئے ہوئے ہوں گے وہ کیا سوچیں گے۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ یہیں سے چلا کر پوچھ لے لیکن آواز جیسے اس کے گلے سے الجھ سی گئی۔ پھر تیز اور مسلسل کھانسی کا دورہ اٹھا۔ تنفس ایک دم اختیار سے باہر ہو گیا۔

"نہیں۔ نہیں… ایسا کیسے ہو سکتا ہے…!"

اس کا دماغ سوچتا رہا۔ بارش اس کا دامن بھگوتی رہی اور دمے کی شدید کھانسی اور تنفس کی شدت اس کو بے حال کرتی گئی۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں کے سامنے گہری تاریکی چھا گئی۔ اس کا سر چکرایا اور دروازے کی چوکھٹ پکڑ کر وہ نیم جان سا ہو کر بیٹھ گیا۔ !

قاضی عبدالستار

گھِسّو

رام اوتار کے دوارے چار چار کوس کا آدمی ٹیٹا باندھے کھڑا تھا۔ رام اوتار کا ایک پاؤں باہر تھا تو ایک پاؤں بھیتر، جیسے بڑے بیٹے کا بیاہ رچا رہا ہو۔ کبھی وہ منجھلے لڑکے کو چلمیں بھرنے کا حکم دیتا اور کبھی چھوٹی بہو کو شربت گھولنے کا آدیش۔ پنسریوں گڑ گھل کر پانی ہوگیا، سیروں تمباکو جل کر راکھ ہوگیا لیکن دوار اسی طرح آدمیوں سے گونجتا رہا۔

گھسو کا تو گھر سے گھر ملا تھا۔ گومتی پاسی ایک بھینس کے ایک سینگ باندھ کر جب پلٹا تو اچھے بھلے مانک پور کی بزار کو جاتے ہوئے ڈگر ہی لائیکرا ٹکا اپنے گاؤں کی طرف گھوم پڑے۔ پھر یہ لین ڈوری رام اوتار کے دوارے بکھر گئی۔ جی تو اس کا بھی ادھر جانے کو چاہا، لیکن پیٹ میں آنتیں دنگل لڑ رہی تھیں اور منہ حقّے کے گھونٹ کا ذائقہ بھول گیا تھا۔ اپنے دروازے کا چھپر کا ڈھپا درکے پٹ ہٹا کر اندر آیا تو مرغیوں نے کڑکڑا کر پیشوائی کی۔ اور کونے میں نیم کے درخت کے نیچے بندھی ہوئی جمنا پاری بکری ممیانے لگی اور اس کے چھوٹے چھوٹے چاروں بچّے دودھ پینے کے لئے اچھل اچھل کر لڑنے لگے۔ گھسو نے پیٹھ پر بندھی ہوئی سیدھے کی گٹھریاں پلنگ کی ادوان پر پٹک دیں اور کندھے سے انگوچھا کھینچ کر پاؤں جھاڑنے لگا۔ اتنے میں رام اوتار اور اپنے گھر کے بیچ والی دیوار کے نیچے لگی ہوئی ناچی پر پاؤں رکھ کر اس کی دلہن اتر آئی۔ اور چھپر میں جھولتے چھینکے پر سے نیا بنا ہوا ڈولوا اتارتے ہوئے بولی۔

"رام اوتار چچا بھینس لائے ہیں کہ پورا ہاتھی!...... اتنا لمبا چوڑا چھپّر...... اور ایک بانڑی بھینس بندھی ہے۔ ...... تل دھرنے کی جگہ نائیں دکھائی دیت"

گھسو نے کلّی کرتے ہوئے لڑکوں کو پوچھا اور امید کے مطابق جواب ملا کہ وہ دونوں رام اوتار چچا کے دوارے بھینس کا میلہ دیکھ رہے ہیں۔ گھسو کے چہرے پر گمبھیرتا دیکھ کر گھسو کی دلہن بچوں کو پکڑنے چلی گئی۔ گھسو جوار کی کالی موٹی ٹھنڈی روٹی کے بڑے بڑے نوالے لہسن کی چٹنی کے سہارے اتارنے لگا۔ جب ذرا پیٹ کی آگ بجھی اور دونوں لڑکے کچّی میلی قمیضوں میں آدھے آدھے ننگے تالیاں بجاتے آکر اس سے چمٹ گئے۔ پھر باپ کے آگے بچی ہوئی روٹی لڑ جھگڑ کر کھانے لگے۔ گھسو نے دلہن کے ہاتھ سے چلم لے کر کنڈے کی آگ کو برابر کرکے دم لگایا تو جیسے بند کوٹھری کے سب دروازے ایک ساتھ کھل گئے۔ میلوں کے سفر کی تھکن دھوئیں کے بادل کی طرح اڑ گئی۔ دلہن دروازے کے پاس بیٹھی ناند میں جاکر بھگو بھگو کر ٹوٹا ہوا چھپر کا درست کرنے لگی۔ گھسو نے چلم جھاڑ کر طاق پر اوندھا دی۔ دھوپ دیوار پر چڑھنے لگی تھی۔ رام اوتا

کے دروازے سے آدمیوں کی آوازیں آ آکر اس کے کانوں سے جھول رہی تھیں۔ دروازے سے اس نے لڑکوں کو ڈانٹا۔ دونوں آدھے آنگن میں منہ پھلا کر جم گئے۔ گھسو بھی بھیڑ میں آکر کھڑا ہو گیا کھڑا رہا۔ رنگ برنگے کپڑوں اور چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں کی ہیلیں پہنے بھینس کھڑی تھی جیسے ہاتھی کی ٹانگیں کاٹ کر بدن کو بالشت بالشت بھر کے کھونٹوں پر کھڑا کر دیا ہو۔ اس کے زین ایسے تھے کہ معلوم ہوتا تھا من بھر آٹے کی گٹھری پھلی دونوں ٹانگوں میں بندھی ہے جو اب زمین پر گری اور اب زمین پر گری۔ کالے چوڑے ماتھے پر چھوٹا سا ٹیکہ بھی تھا گویا جمے ہوئے دہی کا ٹکڑا اڑ کر چپک گیا ہو۔ بالکل اس کی "منی" کی طرح جھوم جھوم کر ناند ابھی الجھ کر کھا رہی تھی۔ اس کی اپنی منی تھی اور اس بھینس میں ایک فرق تھا۔ منی کے سینگ بڑے خوب صورت تھے۔ بالکل گول مڑے ہوئے کیا مجال کہ دونوں سینگوں میں کوئی سوت برابر فرق بھی نکال دے۔ لیکن اس کا ایک سینگ تو ایسا تھا جیسے تلوار سونت کر اس کے سر میں گاڑ دی گئی ہو اور دوسرا...... جیسے ہاتھ بھر کا ڈنڈا مسٹک سے لپیٹ دیا گیا ہو۔ اس بھینس کا بھلا منی سے کیا مقابلہ! سینگ تو جانور کی شوبھا ہوتے ہیں...... جانور کا رعب ہوتے ہیں۔ اب یہ اپنے "سونا پور" کے ٹھاکر ہیں ان کے منہ پر مونچھوں کے علاوہ بھی کوئی چیز ہے بھلا! اب ان کی ایک مونچھ منڈوا نائی اپنی قینچی سے اتارے تو؟...... گھسو کی باچھیں کانوں تک چر گئیں۔

"چلم پیو گھسو بھائی۔"

رام اوتار کا بڑا لڑکا گیادین چلم بڑھائے کھڑا تھا۔ اور اس کی زندگی کی خوشیوں سے چمکی ہوئی آنکھیں ٹھینگے لگا رہی تھیں۔ گھسو اس خیال سے جھینپ گیا کہ اس سالے گیادین کے بچے نے اس کو ہنستے دیکھ لیا ہے۔ کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھا ہو کہ میں اس کی نئی "اماں" کے سینگوں پر ہنسا ہوں۔

"کیسی بھینس ہے گھسو بھائی؟" گیادین نے آخر پوچھ ہی لیا۔

"ہاں ہو گھسو تم بتاؤ...... تمری تو جندگی بیتی ہے بھینسیں دیکھت.... کون کھیت ہے یا!" رام اوتار نے کھٹیا سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

گھسو نے چلم کا ایک گھسیٹ کر دم لگایا۔ بھینس کو دیکھ کر ادھر ادھر دیکھا جہاں اب رام اوتار کے گھر والوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ پھر اس طرح بولا جیسے پنچایت کا پنچ حکم سناتا ہو۔

"بھینس لاکھ میں ایک ہے۔ نسل دار ہے، جوان ہے۔ سو بات کی ایک بات پوری مہارانی ہے..... مل تنی.."

"مل تنی کا؟" رام اوتار گرجا۔

"مل تنی یو کہ...... سینگ بگڑ گئے ہیں۔"

"او نہ سینگ...... سینگ کا دودھ دیت ہیں..... سینگ تو ہاتھی کے دانت ہیں۔ نہ کھائے مال نہ لگا دے مال.... خوب باتیں بنا دت ہو۔"

"او نہوں...... چاچا.... سینگ تو جانور کی مونچھ ہے۔ جب مونچھ نہ ہو تو سارا آدمی کا دھریا ہے دھریا۔"

گھسو یہ کہہ کر اپنی بائیں مونچھ چوستا ہوا چلا گیا۔ رام اوتار نے گیادین سے کہا۔

"بڑکو... گھسو کا مطلب ہے کہ ہم ان سے سینگ بنوالیں...... ہنہہ...... بڑے ڈاکٹر ہیں سسرے۔"

"ارے ہم ان کا ہاتھ نہ لگا دے دیبا۔"

سورج بیٹھنے کے بعد گھسو نے روٹی کھا کر اور چلم پی کر لیٹ رہا۔ جب دونوں لڑکے سو گئے تب اس کی دلہن چپکے سے اٹھی اور اس پر جھک کر بولی۔

"بہت تھک گئے تو پاؤں داب دیئی۔"

"نا۔۔۔۔ سونے دیو ہم کا۔"

یہ کہہ کر اس نے کروٹ لے لی اور آنکھیں بند کر کے جھوٹ موٹ سونا بن گیا۔ دلہن تھوڑی دیر کھڑی رہی پھر اپنی کھٹیا پر جا کر لیٹ گئی۔

اگر آنکھیں بند کر لینے سے دکھی دلوں کو نیند آجایا کرتی تو آکاش کے تارے اپنی تنہائی پہ رو رو کر اندھے ہی ہو جاتے۔ گھسو بھی ان گنت انسانوں کی طرح آنکھیں بند کیے جگ رہا تھا۔ وہ رام اوتار کے دوارے سے ایک ٹھا ڈ لگا لایا تھا جیسے کوئی کسی کے بیاہ میں جائے اور اپنی محبوبہ کو دلہن بنا دیکھ کر گھائل ہو جاتے۔ اس کی پیاسی آنکھوں کے سامنے بیتے دنوں کا تاڑی خانہ کھل گیا تھا اور گھسو معلوم نہیں کتنی یادوں کے گھبڑ چڑھائے نشے میں دھت پڑا تھا۔ اس کی عمر گھٹ گئی تھی۔ وہ تیس بتیس برس کا ادھیڑ آدمی نہیں رہا تھا۔ وہ دس بارہ برس کا چونچال لڑکا بن گیا تھا۔ نٹ کھٹ لڑکا۔ وہ صبح ہوتے ہی پلنگ سے سیدھا اٹھ کر باہر کے چھپر میں گیا جہاں رات کو خرید کر آئی ہوئی بھینس بندھی تھی۔ اس کا باپ پڑیا پکڑے بیٹھا تھا اور ماں بھینس دوہ رہی تھی۔ جب باپ نے کالی ریشمی پڑیا کو گود میں بھر کر اٹھایا اور آنگن میں لا کر چھوڑ دیا تو وہ بھی پڑیا کی طرح کلیلیں کرنے لگا۔ وہ اسے منی کہہ کر اس کے ساتھ کھیلنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے منی اس کا سایہ بن گئی۔ منی کو وہ اپنے حصے کی روٹی کھلاتا۔ اپنے حصے کا دودھ پلاتا۔ اپنے ساتھ تالاب میں نہلاتا۔ اپنے ہاتھ میں اس کی رسی لے کر باغوں میں چراتا گھومتا۔ اپنے پلنگ کے پائے میں باندھ کر سوتا۔ اپنے پیسے جوڑ جوڑ کر اس نے مسرکھ کے میلے سے منکوں، مونگوں، کنچوں اور گھنٹیوں کی ہمیلیں خریدیں اور اندھیریاں پہنائیں اور پیروں میں جھانجھیں باندھیں اور جھولیں اڑھائیں۔۔۔۔۔۔ منی جب پہلا بچہ دینے والی ہوئی تو راستہ چلتے چلتے لوگ رک جاتے ٹکٹکی باندھے لوگ دیکھا کرتے۔ دیکھنے والوں کی نظریں دیکھ کر گھسو کی ماں ڈر جاتی اور منی پر سے نمک مرچ اتار کر اپنے جی کا اطمینان لیتی۔ پھر گھسو کے باپ نے منی کو اندر باندھنا شروع کر دیا۔ جب منی نے دودھ دیا اور پوری دو بالٹیاں گلے تک بھر گئیں اور گاؤں والوں نے پوچھ گچھ شروع کی۔ تو گھسو کے باپ انو نے جھوٹ بول کر ٹال دیا۔ لیکن سارے گاؤں میں مشہور ہو گیا کہ انو لہتیا کی بھینس من بھر دودھ دیتی ہے۔ وہ مثل ہے کہ فلاں کے گھر میں دودھ کی نہریں بہتی ہیں تو منی نے سچ مچ انو لہتیا کے گھر میں گھی کی نہریں بہا دیں۔ پھر ایک دن انو لہتیا جو بھینسوں کے سینگ باندھنے بنانے میں دور دور تک جانے جاتے تھے قتل کے مقدمے میں پھنس گئے۔ جب کھیت پات۔ زیور گہنا، گھر گرہستی سب مقدمے کی بھینٹ چڑھ گئے۔ تب منی کا نمبر آیا۔ عزنی پور کے بازار میں رسید لکھ کر اور روپے گن کر بھی گھسو دیر تک منی کو بیٹھا دیکھتا رہا اور آنسو پیتا رہا۔ منی بھی بیچ دی فاقے بھی سہہ لیے لیکن انو پھنس کر رہے۔ جب بیس برس کی سزا پا کر وہ سیتاپور کی جیل سے فیض آباد کی جیل بھیجے جانے لگے تو انھوں نے اپنے روتے پیٹتے بیٹے کو سینگ باندھنے کا نسخہ بتا دیا جو پشتوں سے ان کے گھر میں چلا آتا تھا۔ چار چھ سال بعد فیض آباد جیل میں انو مر کر زندگی اور قید سے چھوٹ گیا۔ گھسو سینگ بناتا باندھتا رہا

اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتا رہا اور دوسری منّی لانے کے خواب دیکھتا رہا۔ ابھی وہ ننادسے کے پھیر ہی میں تھا کہ رام اوتار نے یہ بھینس خرید کر منّی کے دکھ کا بجھا ہوا الاؤ سلگا دیا۔ پھر بیلیں اینٹھنے لگیں اور گھسو اس میں دھڑ دھڑ دھڑ دھڑ جلنے لگا۔ کمزور پایوں پر رکھی ہوئی بانس کی جھولا چارپائی چرمرا رہی تھی۔ پھر گھسو کروٹ لیتے لیتے رہ گیا ایک بات نے اس کے گھاؤ پر پھاہا رکھ دیا۔ وہ تھوڑی دیر تک دم سادھے پڑا رہا اور اس اچھوتی بات کو پرکھتا رہا کہ آنگن کے کونے میں جھولے کے نیچے بند مرغے نے کڑکڑا کر بانگ دی اور گھسو کو مولوی صاحب کی بات یاد آگئی کہ قیامت سر پر آگئی ہے ورنہ مرغے کہیں آدھی رات سے بولنے لگتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد گاؤں کے دوسرے مرغے بھی بولنے لگے۔ ٹاپے میں بند بکری کے بچے ممیانے لگے۔ رام اوتار مہتیا کے گھر سے بھی اٹھا دھری کی آوازیں آنے لگیں۔ گھمر گھمر چکیاں چلنے لگیں۔ پسنہاریوں کے بول بجنے لگے جب اس کی دلہن بھی کلمہ پڑھ کر اٹھ پڑی تب گھسو کو صبح ہونے کا یقین آیا وہ رات کی چھوٹائی پر افسوس کرتا ہوا پلکیں جھپکاتا۔ دھوتی کی کاچھ باندھتا ہوا جھومتا ہوا باہر چلا گیا۔ گیا دین بھینس لگا رہا تھا۔ کنکھیوں سے گھسو کو دیکھا تو تیوریوں پر بس گھلنے لگا۔ اس لڑواہٹ سے گھسو کا منہ بھرنے لگا۔ جب گیا دین بھینس لگا کر اندر چلا گیا اور کرتے ہوئے پیٹی کوٹ پہنے دھوتی باندھے چھوٹی بہو پڑیا پلانے لگی تب وہ دتون کرتا ہوا بھینس کو گھورنے پہنچا۔ رام اوتار بھی ایک ہاتھ میں حقّہ پکڑے دوسرے ہاتھ سے منہ میں نے دبائے آگیا۔

”چاچا“

”ہاں“ رام اوتار نے دھواں گھونٹ کر کہا۔

”تم کہو تو اس کے سینگ بنا دیے جائیں۔“ اس کے لہجے میں بھکاریوں کی گڑگڑاہٹ تھی۔ رام اوتار نے اتنے بیے شبہ دم لگانا شروع کر دیے کہ منہ کو جواب کی چھٹی ہی نہ ملی۔ لیکن جب گھسو کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کو وشواش ہو گیا کہ یہ بنا کھرا جواب لیے ٹلنے والا نہیں تو رکھائی سے بولا۔

”بڑکو سے پوچھو۔“

کچی اینٹوں کے لال کھمبوں میں جڑے منیالے پھاٹک سے بڑکو نکلا اور گھسو کو دیکھنے کے بجائے بھینس کو دیکھ کر ٹل لہجے میں بولا۔

”نا بھائی۔۔۔ ہم بھینس نائیں چھوئے دیبا۔“

گھسو پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کا منہ دیکھ کر رہ گیا۔

پھر بڑکو نے اپنی دلہن کو کچھ اشارہ کیا۔ اس نے جلدی سے بیلوں کے منہ میں لوتی ٹھونسی اور سپ جھپ بھیتر گئی اور نیچے سنکوں کی ہیل کے پاس سات گانٹھوں والا وہ کالا تاگا باندھ دیا جسے خیرآباد کے میاں نے پڑھ کر دیا تھا اور بنا کر کہہ دیا تھا کہ جب تک یہ گنڈہ گردن میں ہے بھینس کو کسی کی نظر نہیں لگ سکتی۔ رام اوتار کی لس بھری رکھائی، گیا دین کا ٹکا ایسا جواب، اور اس کی دلہن کی تھوکتی ہوئی نظروں نے گھسو کو جیسے اندر سے توڑ دیا۔ وہ وہیں زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا اور مہتیا کی دکاسی بیڑی سلگانے لگا۔

تھوڑے دن گذرنے کے بعد شامیانے اور پالکی کی طرح بھینس کے چاؤ چونچلے بھی میلے ہو گئے۔ رام اوتار

مانک پور کی پردھان کے چناؤ کی تیاریاں کرنے لگا۔ اور نئے نئے داؤں پھینکنے لگا۔ چاروں لڑکے باپ کا ہاتھ بٹانے لگے بھینس بھی دوسرے جانوروں کی طرح عورتوں کے سر پڑ گئی۔ عورتوں کی آنکھیں نئی نئی دولت سے چوندھیائی ہوئی تھیں وہ بھینس کا گوبر پانی کرتیں یا سیتا پور سے آتے ہوئے بساطیوں اور پھیری والوں کے بھڑکیلے کپڑوں، چکیلی چوڑیوں اور سستے پوڈر سرخی سے جگمگاتے ڈبوں کے درشن کرتیں؟ جب ربیع کی "لوائی" شروع ہوئی اور کسانوں کا کام دگنا ہو گیا۔ تھکے ہوئے مردوں، الساتی ہوئی عورتوں، لمبی چوڑی تنخواہ پانے والے نوکروں کے لئے بھینس کی گھانس دو بھر ہو گئی تو وہ بھی سرجن پور کے دوسرے جانوروں کی طرح انگنو چمار کی گوڑھی میں شامل ہو کر چرائی پر جانے لگی۔ سرجن پور سے نکلتے ہی دھندھاری کا وہ جنگل شروع ہو جاتا ہے جس کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح تکھیم پور کھیری تک چلا جاتا ہے قرب و جوار کے تمام جانور اسی جنگل میں چرائے جاتے ہیں۔ کوئی چار میل جنگل کے اندر گھس کر گوروں کا وہ قبرستان ملتا ہے جس کی دیواریں ہاتھی برابر اونچی ہیں اور لوہے کی سیخوں کا پھاٹک ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ لیکن آدمی تو آدمی وہاں پرندہ بھی پر نہیں ملتا کیونکہ وہاں اس بے پناہ خوف کا پہرہ لگا رہتا ہے جسے بھولے بھالے دیہاتیوں کے خود اپنے وہم نے جنم دیا ہے۔ ان کا ایمان ہے کہ اس قبرستان کے اندر گورے بھوت اور گوری چڑیلیں رہتی ہیں جو بھولے بھٹکے راہگیروں کو پکڑ کر لے جاتی ہیں اور بھون کر کھا جاتی ہیں۔ انگنو چمار کا باپ اپنی گائے ڈھونڈتا ہوا اس شیشم کے پاس پہنچ گیا جو قبرستان سے کوئی فرلانگ بھر دور کھڑا ہے۔ وہیں موت نے اس کے کان میں کہا "چڑھ کر دیکھو شاید ادھر ادھر چرتی نظر آجائے" وہ بے چارہ شیشم پر چڑھ گیا۔ قبرستان پر نظر پڑی تو دیکھا کہ گورے بھوت ایک موٹے تازے آدمی کو بھون رہے ہیں اور چڑیلیں تالی رہی ہیں۔ بس وہ تڑ سے گر پڑا اور اپنی جان لے کر بھاگا۔ گرتا پڑتا گھر پہنچا اور یہ بتاتے ہی بتاتے ٹھنڈا ہو گیا۔

لیکن گھسو کے دل میں مٹی کی اس ہم شکل بھینس کی محبت اسی طرح جوان تھی۔ بلکہ اسے روز دیکھنے سے اور چمک گئی تھی۔ سینگ باندھنے اور بنانے کے ہنر میں استاد گھسو جب اس کے سینگ دیکھتا تو کلیجے پر گھونسہ لگتے جیسے آنکھیں بنانے والا اپنی محبوبہ کے اندھی ہو جانے پر رو دے۔ وہ سوچتا رہتا اور کڑھتا رہتا۔ اب اس نے بھینس کو تھان پر جا کر گھورنا بھی چھوڑ دیا تھا کیوں کہ جب تک وہ گھر رہتا کوئی نہ کوئی شیشے بھری آنکھوں کا جوڑا تبرکمان لئے چوکیداری کیا کرتا۔ ان دنوں میں اتنا ضرور ہوا کہ گھسو نے انگنو چمار پر میٹھے لہجے اور نمکین جملوں کی بارش شروع کر دی۔ پھر دھیرے دھیرے یہ ہونے لگا کہ اگر جنگل سے گزرتے گھسو کی انگنو سے مڈ بھیڑ ہو جاتی تو وہ باتیں کرنے کیلئے رک جاتا۔ ایک بیڑی سلگا کر انگنو کو دیتا دوسری اپنے ہونٹوں میں دبا کر بھینس کو تاکنے لگتا اور گردن تھپتھپایا کرتا جسے انگنو اپنی تانگ سے باندھے رکھتا تھا۔ گھسو اب چلم سے زیادہ بیڑی پینے لگا تھا اور اکثر اپنے دل میں سے چلم کے نقصان اور بیڑی کے فائدے کی باتیں کیا کرتا۔

ایک شام گھسو ارجن پور سے سینگیں باندھ کر آرہا تھا جب وہ شیشم کے برابر سڑک پر پہنچا تو اس نے انگنو کی گہار دہ چیخ اٹھی۔ اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا اور لپک کر انگنو کو جا لیا۔ انگنو نے گھگھیا کر بتایا کہ ایک بکری شیشم اور قبرستان کے بیچ میں چر رہی ہے اور وہ کوئی گھنٹے بھر سے چلا چلا کر بلا رہا ہے لیکن وہ ٹس سے مس نہیں

ہوتی۔ گھسو تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر جانک پور کے مولوی کی رٹائی ہوئی قرآن مجید کی سورتیں پڑھتا ہوا شیشم کے پیڑ کی طرف بڑھا۔ انگنو نے پہلے تو حیرت سے اسے دیکھا پھر اپنے ماں باپ اور اس کے ماں باپ دونوں کی ساتھ ساتھ قسمیں دینے لگا لیکن قاتل باپ کا بیٹا جنگل میں دھنستا چلا گیا اور قبرستان کے بالکل سامنے بکری کو ہانک کر لے آیا۔

وہ رات ایک دیوی کی طرح خاموش، گمبھیر اور پرسکون تھی۔ اس رات دیوی نے گھسو کو ایک منتر دان کیا تھا۔ ایسا منتر جسے پڑھ کر وہ اپنی مٹی کو دیکھ سکتا تھا۔ اس مٹی کو دیکھ سکتا تھا جس کے ساتھ اس نے اپنے گھر کی برکت بیچ دی تھی۔ اپنے گھر کی لکشمی بیچ دی تھی۔ جس کے جانے کے بعد اس کے گھر پر شمشان کا سناٹا چھا گیا تھا۔ وہ دیوی ہولناک تھی جو اپنے مقدس ہاتھوں سے باہر کی تھکن دھو دیتی۔ اس رات کی صبح ہندوستان کی آزادی کی صبح کی طرح بڑی دیر میں آئی۔ گھسو اپنی بیوی بچوں کو سوتا ہوا چھوڑ کر اٹھا۔ رضائی کو بٹا کر اوڑھا دادا کی بشیشی لے کر اندھیارے گھر سے نکل گیا۔ رام اوتار مہتیا نے جانوروں کے اس چھپر کے پھرکے کو آہستہ سے کھولا جس میں وہ بھینس بندھی تھی گوبر اور گناہ پر پڑے ڈاننے والے اندھیرے سے بھرے ہوئے چھپر میں گھسو نے محسوس کیا کہ وہ سلے ہوئے بوروں کی جھول پہنے ناند کے پاس سر ڈالے بیٹھی ہوئی ہے۔ سینگ پر ہاتھ لگتے ہی وہ بھڑکی لیکن گھسو کی مانوس خوشبو سونگھ کر اور گردن پر پیار بھرے ہاتھوں کی تھپکی سن کر وہ گھسو کی دلہن کی طرح چپ چاپ پڑی رہی۔ وہ سینگوں پر پانی ایسی دوا پوت کر سائے کی طرح باہر نکل آیا۔

دوسرے دن دوپہر میں انگنو اپنی گوڑھی سمیٹے کنوئیں پر بیٹھا چنے چبا رہا تھا۔ جگت پر بیتل کی لٹیا بھری رکھی تھی گھسو کو سڑک سے گذرتا دیکھ کر انگنو نے گہرا دیا آواز دی:

"کہاں سے گھسو بھائی ہو۔"

"اچھا انگنو ہیں۔۔۔۔ ہم تو بھائی ارجن پور سے ٹھاکر کی بھینس باندھ کر لوٹ رہے ہیں۔"

"تو آؤ پانی وانی پی لیو۔"

گھسو کو منہ کی مانگی مل گئی۔ اس نے ایک گٹھری کھول کر گڑ کا چھار نکالا اور ایک ٹکڑا توڑ کر انگنو کے انگوچھے پر رکھ دیا۔ پاس کھڑی بھینس نے گڑ کی صورت دیکھی تو ڈکرا کر اور قریب آگئی۔ گھسو نے تھوڑا سا گڑ اس کے منہ میں بھی رکھ دیا۔ اب تو وہ گھسو کے لس گئی۔ انگنو نے ڈانٹا بھی مگر وہ نہ ہلی۔ آخر گھسو نے ڈنڈا اٹھایا اور دھمکاتا ہوا دوسرے جانوروں کی مخالف سمت میں جھاڑیوں کی آڑ میں کر آیا۔ اور انگنو کے ساتھ بیٹھ کر گڑ کی سی میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا۔ جھاڑیوں میں گھسو کا یار رشیر علی مٹی کے ڈھیر کی طرح پڑا تھا۔ اس نے لپک کر بھڑکتی بھینس کے منہ میں بھنگ ملا گڑ رکھ دیا اور گھنٹیوں والی بہیل اتار کر وہیں زمین میں داب دی۔ پھر بھینس کو ٹہلاتا ہوا تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد گڑ کھلاتا ہوا اسی شیشم کی طرف چلا جو گوروں کے قبرستان کا سامنا کیے کھڑا تھا۔ گھسو وقت کا حساب لگا کر اٹھا۔ تھوڑی دیر سرمن پور جانے والی سڑک پر چلا پھر چکر کاٹ کر آندھی کی طرح چلتا ہوا شیشم کے نیچے جا کھڑا ہوا اور رشیر علی کے ساتھ بھینس کو ہانکتا ہوا گوروں کے قبرستان میں گھس گیا۔ اس قبر کے تعویذ سے باندھ دیا جس کے تین طرف جالی دار دیواریں کھڑی تھیں اور ان پر چھپر

طولان کالی چھت پڑی تھی۔ بھنگ ملے ہوئے گڑ کی اتنی بڑی مقدار بھینس کے پیٹ میں پہنچ چکی تھی کہ اس نے جاتے جاتے گردن ڈال دی۔ اس سردی میں بھی دو جوڑ پسینے میں لت پت ہاتھ سوکھی لکڑیاں جمع کرتے رہے۔ گھسو نے آگ جلا کر بیتیں کی لٹیا میں لکڑی کی طرح جمی ہوئی دوا کو پگھلایا اور سینگوں پر لیپ دیا۔

شیر علی پر تو معلوم نہیں کیا بیتی لیکن شام ہوتے ہوتے جب گھسو گھر پہنچا تو کوٹھری میں گھستے ہی پلنگ پر ڈھے گیا۔ دلہن کو پلنگ کے پاس ہی الاؤ جلانے کا حکم دے کر گھر میں جو کچھ تھا سب کچھ اوڑھ لیا۔ الاؤ کی لپٹوں میں ہاتھ ڈال دیئے لیکن سردی تھی کہ نس نس میں جم گئی تھی اور دل دھڑک رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ آٹے پیسنے والے انجن کی لٹیا بج رہی ہے۔ دلہن نے جو گھسو کا ہاتھ چھوا تو سمٹ کر رہ گئی۔ وہ جیسے توے پر چڑھے ہوئے کڑچھے کی طرح پھنک رہا تھا۔ وہ ساری رات گھسو کے سرہانے بیٹھی رہی اور ساری رات گھسو کے خوابوں میں گورے بھوت اور ...ری چڑیلیں خود اسے بھون بھون کر کھاتی رہیں۔

انگنو کے منہ سے بھینس کھونے کی خبر سنتے ہی رام اوتار بارود کی چرخی کی طرح بھڑک اٹھا۔ چاروں لڑکوں ...سو پچاس آدمی دے کر چاروں کھونٹوں پر روانہ کیا اور خود ادھے پر چڑھ کر تھانے پہونچا۔ تھانے دار کی جیب ...م کر کے بڑی دھوم دھام سے تفتیش شروع کرا دی۔

سرجن پور مانک پور کے زمین دار لالہ ... ادر کا گاؤں تھا۔ ادھر لالہ مرے ادھر زمینداری فیل ہوئی۔ پھر ...اتھا۔ رام اوتار کی چڑھ بنی۔ اس نے لالہ کی ساری شکمی زمین جو اس کی جوت میں تھی ہتھیا لی۔ اور مہرکہ میں ٹھکر کے ...ں کے لیے کانسا لگتے ہی گنے کی کھیتی شروع کرا دی۔ چار ہی چھ برسوں میں نوٹوں کا چھپر چھالیا۔ اب تو ناٹے قد کے پلے ہوئے رام اوتار لودھ نے زمینداروں کے چلن سیکھ لیے۔ ٹوٹے پھوٹے کچے مکان کو پھیلا کر ایک پکا درجہ پاٹ ...ا اور میلہ کچیلا ہاتھ لگا کر مہتیا بن بیٹھے۔ گھر کی جوان عورتیں پوڈر سرخی لگا کر ساریاں باندھنے لگی تھیں۔ مرد پان کھانے لگے ... کرتے اور بوٹ پہننے لگے تھے۔ اور سائیکلوں اور ادھوں پر سفر کرنے لگے تھے۔ رام اوتار کیا، آگے ہزار دو ہزار ... بیر ہی کیا تھے۔ لیکن پشتینی زمینداروں کی طرح وہ اس چوری کو اپنی ہتک سمجھ بیٹھا۔ اور علاقے کے گاؤں سرجن پور کو ... پڑی پر اٹھائے پھرتا تھا۔ لڑکوں کی طرح مہتیا بھی سب سے پہلے گھسو کے نام پر ہی چمکا لیکن انگنو نے ایسا پاؤ تولے رتی والا بیان دیا کہ تھانے دار تک کا دل گھسو سے صاف ہو گیا۔ پھر گھسو ایسا مٹی کا مادھو بھی نہیں تھا کہ رام اوتار مہتیا ... سوچے سمجھے اس پر ہاتھ ڈال دیتا۔ گھسو تھا تو قوم کا فقیر لیکن اس باپ کا بیٹا تھا جس کی لاٹھی درجن بھر آدمیوں کا خون پی چکی تھی۔ دور دور تک نام بجتا تھا اور اچھا اچھا آدمی لحاظ کرتا تھا۔ وہ تو رام اوتار تھا، وہ سرجن پور میں ...ا اپنے چار بیٹوں اور نوٹوں کی گڈیوں کے بوتے پر گھسو کو گھاس نہیں ڈالتا تھا ورنہ دوسرا کون تھا جو آنکھ ملا کر بات کرتا۔ پھر بھی دوپہر ڈھلتے ڈھلتے رام اوتار گھسو کو دیکھنے کے بہانے گھسو کو پڑھنے گیا۔ لیکن اس کا ...حال دیکھ کر ٹھنڈا ہو گیا اور جھوٹ موٹ کی لو چپو کر کے واپس چلا آیا۔ بھینس کی چوری کے ساتھ ساتھ یہ خبر بھی اڑ ...ی کہ انگنو کی بکری ہانکنے گھسو قبرستان کے سامنے چلا گیا تھا اب گورے چھاپے بیٹھے ہیں۔

اندھیرا بڑھتے ہی شیر علی گلے میں کالا تاگا باندھے، مک پاردل کی سلائی والا روئی کا کالا شلوکا پہنے کندھے

پر لٹھ رکھے جھومتا ہوا آیا۔ دلہن کوٹھری سے ہٹ گئی۔ گھسو اور شبیر علی دیر تک باتیں کرتے رہے۔

صبح تک پولیس کوئی درجن بھر آدمیوں کا بیان لے چکی تھی۔ انگنو نگرانی میں تھا۔ گھسو خوب اوڑھ لپیٹ کر نکلا اور شبیر علی کی سائیکل کے کیریر پر بیٹھ کر گنگا پور کے "نادت" ماتا پرشاد سے پریت جھجر دانے چلا گیا۔ دھندھاری پہنچ کر سائیکل گوردوں کے قبرستان کی طرف گھوم گئی۔ شیشم کے پیڑ کے نیچے گردن سے کی اونچی اونچی جھاڑیوں میں سائیکل چھپا کر دونوں قبرستان میں گھس گئے۔ شبیر علی نے عطر سے کی بوتل بانس کی نال میں، نڈیل دی پھر نال بھینس کے منہ میں خالی کر دی۔ گھسو آگ جلا کر ہاتھ پیر سینکنے لگا۔ جب بھینس پر خوب گھنگھور نشہ چڑھ گیا تب گھسو سینگ بنانے لگا۔

بھینس کی چوری کو کئی دن بیت چکے تھے لیکن پولیس کی وہی سمجھ تھی جیسے رام اوتار مہتیا کی بھینس نہیں بلکہ بچہ چرا لی گئی ہو۔ گھسو کا جاڑا بخار اڑنچھو ہو گیا تھا اور بھینس کے سینگ مٹی کے سینگوں کی طرح بٹ گئے تھے۔ کڑوے تیل کے چراغ کی میٹھی روشنی میں کالی دوا سے چمکتے ہوئے مڑے ہوئے سینگ ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے ابھی ابھی دوکان سے لا کر جڑ دیئے ہیں۔ گھسو نے اپنی عمر بھر میں اتنی محنت اور توجہ سے کسی کے سینگ نہیں باندھے تھے۔ وہ دیر تک بیٹھا ہوا دیکھتا رہا اور اس کا دل اس بے پناہ تسکین سے بھر گیا جو کسی فن کار کو اپنے شاہکار کی تخلیق پر نصیب ہوتی ہے۔ وہ سینگ دیکھتا رہا اور اپنی کامیابی کے نشے میں دھت بیٹھا رہا۔ پھر شبیر علی نے اس کے ہاتھ میں چلم تھما دی اور منہ میں بھرا دھواں چھاتی پر انڈیل کر بولا۔

"آج کل رونا پور کے بنجارے اپنے جانور لئے جہانگیر آباد کی بزار جا رہے ہیں۔ ہمرا کہا مانو اس کے تھوڑے تھوڑے کان کاٹ دیو۔ ..... وہاں گا کجر ماں دو چار مہینے رہ لے پھر رسید لکھوا کے اپنے دوارے باندھ لیو۔"

وہ شبیر علی کا دوستانہ مشورہ سنتا رہا اور چلم کے دم لگاتا رہا۔

اس رات گھسو نے خوب ہنک کر روٹی کھائی۔ کودو کے پیال پر گھوڑا بنا دونوں لڑکوں کو سواری کراتا رہا۔ جب وہ کھیلتے کھیلتے تھک کر سو گئے تب وہ دیر تک اپنی دلہن سے چہلیں کرتا رہا۔ پہرہ پڑنے لگا۔ کتے بھونکنے لگے اور ساری رات سو گئی تب اس نے بھی بچھونے سے کمر لگائی۔

شبیر علی نے لاکھ سمجھایا لیکن گھسو ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کا جواب اٹل تھا کہ اگر اس نے اس حرام کمائی سے کیا بھر لیا جو میں جل جاؤں گا۔ یہ روپیہ تو ایسا چھوت ہوتا ہے کہ حلال کے پیسے کو بھی کوڑھ لگ جاتا ہے۔ رہی بھینس تو اپنے شوق کی بات تھی۔ سینگ بن گئے۔ شوبھا بڑھ گئی۔ ہزار کی تھی تو بارہ سو کی ہو گئی۔ دیکھنے میں مزہ ملے گا۔ بندھے گی تو مہتیا کے دوارے۔ ل اس کا روپ تو اپنی آنکھوں میں بھی چمکے گا۔ اس سے زیادہ کی نہ پیاس ہے نہ لگن۔ اور بھائی سچ پوچھو تو اتنا لوتا بھی نہیں ہے کہ ساری کی سوچی ہاتھی ایسی بھینس ہضم کر کے بیٹھ رہیں۔ شبیر علی منہ لٹکائے بیٹھا رہا اور چلم گھسیٹتا رہا۔ گھسو رام اوتار مہتیا کے دوارے بھینس پہنچانے کی ترکیب سوچتا رہا۔ پھر آپ ہی آپ اچھل پڑا۔ شبیر علی نے چونک کر دیکھا اور چلم الٹ دی۔

"کا بات ہے گھسو بھائی؟"

"بات یا ہے ..... کہ بات بن گئی"

"کاکا"

"کاکے نام کا کوا۔۔۔بس سائیکل اٹھا دو"

سائیکل کی کھڑکھڑاہٹ سنتے ہی آنگن میں کھیلتے ہوئے دونوں لڑکے دوڑ آئے۔ چھوٹا جو ابھی چھے سات سال کا تھا گھسو کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ بڑے نے لپک کر ہینڈل پکڑ لیا۔ اور گھنٹی بجانے لگا۔ اتنے میں چولھے والے چھپر سے دلہن بھی نکل آئی۔ شیر علی اسے آتا دیکھ کر باہر نکل گیا۔ وہ اپنے منہ پر چھو نیا ڈالے ہوئے آئی اور موڑھے چھاپ بیڑی کا بنڈل اور دیا سلائی اسے پکڑا گئی اور جاتے جاتے جلدلوٹنے کی تاکید کر گئی۔ شیر علی کی سائیکل کے کیریر پر بیٹھے ہوئے اس نے دیکھا کہ دلہن، بچے دونوں، لڑکوں کے بیچ میں دروازے پر کھڑی ہے۔ گھسو کو یہ احساس ہوا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن اب وہ کیریر پر بیٹھ چکا تھا اور کیریر پر چڑھنا اترنا اس کے لئے آسان کام نہ تھا شیر علی پیڈل بھی مارنے لگا تھا۔

گھسو کو شیر علی کی سائیکل پر جاتا دیکھ کر کنوئیں پر کھڑا گیا دین چونک پڑا۔ آپ ہی آپ۔ پہلے تو اس نے اپنے جی کو یہ کہہ کر سمجھا لیا کہ جب سے گھسو بیمار پڑا ہے شیر اسے جھاڑ پھونک کے لئے لادے لادے پھرتا ہے مگر آج یہ بات اس کی دل کو لگی نہیں۔ اس نے پانی پیتے بیلوں کو ایک نوکر کے حوالے کیا اور چارہ کاٹنے والی مشین سے لگی چیکلو کی وہ سائیکل گھسیٹ لی جس کے فریم پر لال چھینٹ کا غلاف چڑھا تھا۔ وہ کچی سڑک دو آدمیوں سے لدی سائیکل کے پہیوں کے گہرے نشانوں پر آنکھیں گڑوئے چلتا رہا۔

شیشم کے درخت کے نیچے کروندے کی جھاڑیوں میں سائیکل دبا کر دونوں قبرستان کی طرف چلے۔ شام چھانے لگی تھی۔ پچھم میں یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی لالی نے گوروں کے قبرستان کی سفید دیواروں کو چمکا دیا تھا۔ سلاخوں کے پھاٹک کو دھیرے سے کھول کر شیر علی نے اپنی لاٹھی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ گونجتے ہوئے بھیانک سناٹے سے سہما ہوا مرے ہوئے پتوں کی لاش کو کچلتا ہوا بھینس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ گھسو نے اس کے بل کھائے چکیلے سینگوں پر ہاتھ پھیرا جیسے وہ اپنی دلہن کے کنگھی چوٹی کئے ہوئے سر کو سہلا رہا ہے۔ پھر اس نے قبر کے تعویذ سے اس کی زنجیر کھولی اور پھاٹک کے سامنے کھلے ہوئے صحن میں لاکر کھڑا ہو گیا۔ دھندلی روشنی میں اسے دیر تک دیکھتا رہا یہاں تک کہ سینگوں کی آب مر گئی۔ جلد کی دمک بجھ گئی اور آنکھیں چمکنے لگیں۔ شیر علی نے بھینس کی سانی پانی کا سامان سمیٹ کر لاد لیا تھا اور گھسو کے لاڈ سے اکتایا ہوا بوجھ سے دبا ہوا کھڑا تھا۔ گھسو نے اس کی نگاہوں کا جواب دیا۔

"چلو روالے پیڑوں کے پاس تک پہنچائے دیں ای کا! وہاں سے اپنے چلی جیہے۔ رستہ جانا بوجھا ہے"

گھسو بھینس کی زنجیر پکڑے ہوئے کانٹے دار جھاڑیوں سے بچتا بچاتا شیشم کے پیڑ کے پاس آگیا

شیر علی نے اپنا لٹ کٹ جھاڑیوں میں دبا دیا اور سائیکل نکال لی۔ گھسو نے بھینس کی زنجیر اس کی موٹی چکنی گردن میں لپیٹ دی۔ اپنی اونچی بندھی ہوئی دھوتی کو کھینچ کر نیچا کیا۔ روئی دار شلوکے کی اندرونی جیب سے بیڑی کا بنڈل نکالا۔ بیڑیاں سلگاتے ہوئے پورب کے آسمان کی طرف دیکھا جہاں گوروں کے قبرستان میں کھڑے ہوئے اونچے اونچے درختوں پر پورا چاند ابھر آیا تھا۔ جیسے سونے کی پتنگ سدھ گئی ہو۔ اس نے چاند سے نگاہیں ہٹائے بغیر ایک بیڑی شیر علی کی طرف بڑھا دی۔ شیر علی نے بیڑی کا دم لگایا اور سائیکل کھڑکھڑاتا ہوا سڑک پر چڑھ گیا۔ گھسو نے بھی چونک کر بھینس کو دیکھا۔ بھینس کے خوبصورت سینگوں کو دیکھا اور اس کی گردن میں لپٹی ہوئی زنجیر میں ہاتھ ڈال کر سڑک پر چڑھا لایا۔
گھسو کا داہنا ہاتھ بھینس کی زنجیر میں لپٹا ہوا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ میں بیڑی چمک رہی تھی کہ ایک لالٹین والے نے اسے پیچھے سے دبوچ لیا۔ دوسرا لال صافہ شیر علی سے لپٹ گیا۔ گیا دین نے شیرے کے سینے پر بلم رکھ دیا۔ سپاہی نے جھٹ پٹ اسے باندھ کر گھسو کے رسی ڈال دی جو سپاہی کے بازوؤں میں مٹی کے مادھو کی طرح بھونچکا کھڑا تھا۔ گیا دین بلم چمکارتا ہوا گرج رہا تھا۔

"اب دیکھو دیوان جی دیکھو .... بھینس کے سینگ دیکھو.... بھلا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یا بھینس رام اوتار کی ہے؟ یا رونا پور کے میلے سے جہانگیر آباد چلی جاتی .... تم پنچ جندگی بھر ڈھونڈھا کرتیو کا پا ملتی؟"
گھسو دیوان جی کی ٹھوکر پر چونکا اور کالیوں میں لپٹے ہوئے حکم کے مطابق آگے چلتی ہوئی بھینس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

رفعت

تین ہٹی کا پُل

گہرے گلابی رنگ کے پلاسٹک کے تار اُس کی سانولی سانولی مضبوط اُنگلیوں میں تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ ناخن سے پھول کے کونے پر دباؤ ڈالتے ہوئے اس کا چہرہ بھی قدرے سخت ہو جاتا، پھر وہ ہونٹوں کو ڈھیلا چھوڑتے ہی مسکرا دیتی۔ یہ مسکراہٹ صاف چغلی کھا رہی تھی کہ من میں بھی ایسے ہی پھولوں پہ گرہ لگ رہی ہے ....

ممانی اماں نے "خاص کام" اور "ضروری مشورہ" کے لئے اماں کو بُلا رکھا تھا۔ اس سے پہلے تو مُمانی کو ہمیشہ اُن ہی سے کام پڑتا تھا۔ اماں تو کبھی کبھار سوسائیٹی جایا کرتی تھیں۔ ممانی نے تو اسے اپنی بیٹی بنا رکھا تھا..... اُسے پڑھانے پہ ممانی نے خاص زور دیا تھا بلکہ تعلیم کے سارے اخراجات اپنے ذمہ لے لئے تھے، ورنہ اماں آپا کہاں اُسے پڑھاتے، وہ تو اسد اور خالد کو ہی تعلیم کا خرچ نہ دے سکتے تھے، بھلا اس کی تعلیم کا بوجھ کیسے اُٹھاتے ...... ممانی کا خیال تھا کہ لڑکی دو چار جماعت پڑھ گئی تو کہیں کسی اچھے گھر میں کھپ جائے گی۔ اور خاندان ترقی کرنے لگے گا ...... ممانی کچھ غریب پرور قسم کی تھیں وہ اپنے سارے کام اپنے غریب اور مفلس عزیزوں سے کرواتیں، یوں عزیزوں کے رشتے کا بھرم بھی رہ جاتا اور ممانی کا کام سلیقے اور خلوص سے ہو جاتا۔

جب ممانی کے ہاں کوئی تقریب ہوتی۔ وہ اپنی لمبی سی کار لیکر آن پہنچتیں یہ علیحدہ بات ہے کہ ممانی ہمیشہ ایسا وقت دیکھ کر آتیں جب شمیم گھر پہ ہی ہو۔ یہ تو اس وقت کی بات ہے جب شمیم اسکول جاتی تھی، جب سے آٹھ جماعت پاس کر کے وہ گھر بیٹھی تھی ممانی بے کھٹکے چلی آتیں۔

جمیلہ آپا کے گلے ملتے ہی وہ سارے گھرانے کی خیریت نام لے لے کے پوچھتی چلی جاتیں، اور جمیلہ آپا دودھ، بیل اور پھول کے سنے ہوئے ہاتھوں سے اپنی قمیص کی اکڑی ہوئی شکنیں درست کرنے لگتیں، ڈرائیور فرِدَوس کی ٹوکری دروازے پر لٹکی ہوئی پرانی دری سے اندر کھسکا دیتا تو بچے شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے گرد چکر لگانے لگتے، باہر محلے بھر کے بچے گاڑی کی چمکتی ہوئی ہوئی سطح پہ اپنے میلے میلے ہاتھ پھیر کر اس کی خوبصورتی سے انتقام لینے لگتے، ڈرائیور کے بار بار دھمکانے پر بھی وہ بھاگتے بھاگتے آ کر، سیاہی بھری انگلی، ریت کی مٹھی گیلا گیلا کتھے لگا کاغذ کا پرزہ رگڑ کر گزر جاتے، شمیم دو ایک بار دری سے باہر نکل کر بچوں کو ڈانٹتی، اس ڈانٹ میں تنبیہ کم اور اندر دبی تمکنت اور اپنے بڑے پن کی وہ کھنک زیادہ ہوتی جو جھونپڑا مکان کے دروازے کے سامنے اتنی بڑی گاڑی کو کھڑا پا کر وہ اپنے اندر محسوس کرنے لگتی۔

ممانی دو ایک بار پہلو بدلتیں، ماحول کی جملہ ناگواری کو پورے تحمل سے برداشت کرتیں اور پھر کہتیں، "آپو، میں تو اپنی شمیم کو لینے آئی ہوں . . . . کل زاہدہ دلہن کی سالگرہ ہے ناں — یہ چل کے میرا ہاتھ بٹائے گی، شمیم میرے پاس ہو تو پھر میں اپنے آپ کو بڑا ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتی ہوں . . . . بس بس، جمیلہ آپو، چائے وائے کی ضرورت نہیں — ہمیں بازار سے بہت کچھ خریدنا ہے — . . . چل شمیم تیار ہو جا بیٹی . . . ."

شمیم جلد جلد صاف کپڑے پہن کر ممانی کے دیئے ہوئے پرانے کپڑوں میں اپنے ناپ کا لیا ہوا ریشمی جوڑا ساتھ لیتی ممانی کا دیا ہوا پھٹا ریشمی برقعہ بجز تقی صرف کوٹ پہنتی، اور نقاب ہاتھ ہی میں پکڑے پکڑے ممانی سے بھی قبل گاڑی میں جا بیٹھتی۔ اپنا محلہ گذرنے تک سر باہر نکالے دیکھے جاتی کہ کون کون اسے اس اتنی شاندار گاڑی میں بیٹھے دیکھ رہا ہے — ممانی کے ہاں میلاد شریف ہو یا ہانڈی رت جگا ہو یا آیت کریمہ کا ختم شمیم پیش پیش رہتی۔ چاندنی بچھا رہی ہے، گلاب پاش بھروا رہی ہے، عطر دان اور روئی کی پلیٹ سجا رہی ہے، چائے کی پیالیاں نکال رہی ہے۔ میز پر چھریاں کانٹے گن رہی ہے — اور ہر کام کرتے وقت اسمیں ایک غرور ہوتا احساس برتری کا جذبہ،

"اتنے بڑے گھر میں مجھے کسقدر اہمیت حاصل ہے۔ سچ . . . . ." اپنے اسی جذبے کے نشے میں ڈوب ڈوب کر اس نے ممانی کے ڈھیروں میز پوش، تکیے پھولوں سے سجا دیئے تھے، پائنچوں میں ڈوریاں بھری تھیں، دوپٹوں میں کنگورے ٹانکے تھے . . . .
صرف ایک بار اس کے دل کو صدمہ پہنچا تھا . . — . .

جازی میاں کا سوئیٹر بڑی محنت سے، ہاتھ دھو دھو کر ذرا سا بھی پسینہ آنے پر ہتھیلیوں کو شلوار یا قمیص سے رگڑ رگڑ کر اجلا اجلا ہی بنایا تھا . . .

جازی میاں نے ہاتھوں میں لیا تو نرم نرم اجلا، اجلا کام کی تے لگا . . . مگر جونہی سر ڈال کر گردن سے نیچے کیا تو سینے پر پھنس کر رہ گیا۔ اور شمیم کو یوں لگا جیسے اس کا دل بھی سکڑ گیا ہو۔

"یہ تو تنگ ہے بھئی۔ اسقدر پھنسا پھنسا سا۔ تمہیں میرا ناپ بھی یاد نہیں — ہیں۔"

"میں نے تو بڑی محنت سے بنا ہے پہلے تو یہی ناپ تھا . . —"

"مگر اب تو ڈھیلا ڈھالا کندھوں سے گرا ہوا۔ سینے پہ کھلا کھلا سا پسند کیا جاتا ہے . . . تم اپنی محنت کا فکر نہ کرو۔ تمہیں محنت کے روپے مل جائیں گے —"

"روپے — محنت کے روپے —" وہ چکرا سی گئی۔ (اس ریشمی ریشمی سی دنیا میں رہنے والے ایسے بیوقوف بھی ہوتے ہیں)
. . . "میں محنت کا کہہ رہی تھی روپوں کا نہیں" . . . . . اس نے بڑی ہمت سے کہا۔

"محنت بھی ضائع نہیں ہونی چاہئے، ڈرائیور کو ضرورت ہے۔ یہ اسے دیدوں گا . — — . . . . . میں بازار ہی سے خرید . . ."

ڈرائیور — . اس نے جی ہی جی میں سوچا، ڈرائیور کو سوئیٹر پہنے دیکھ کر میرے کندھوں کی دکھن بڑھ جائے گی، میری آنکھوں کی جلن کم نہ ہوگی — تم کیا جانو جازی میاں . . . ہا . . . . . وہ سوئیٹر کو تپائی پر رکھ کر دوسرے کمرے میں نکل آئی —

ممانی کے ہاں آن کر کمروں میں گھومنے کا اسے بہت شوق تھا، موٹے موٹے بھاری بھاری پردوں کو وہ ہاتھ لگا لگا کر دسیوں بار دیکھ چکی تھی . . . یہ موٹے موٹے کھدر کے پردے۔ وہ بھی دوہرے دوہرے سے مگر ان چمکتی دیواروں اور سجے سجائے

دروں میں لٹکتے یوں لگتے ہیں جیسے ریشم کے لچھے جھول رہے ہوں ــــ . . . . وہ ہر کمرے کو ہر بار جھانک کر ضرور دیکھتی ۔
یہ پھول دان ، یہ پلنگ کے خوبصورت بالکل اصلی پھول ، یہ قالین ، یہ رسالے یہ الماریوں اور دیواروں پہ سجے ہوئے کھلونے ، کپڑوں بھری الماریاں ، یہ پلنگ ، اور پلنگوں کا خیال آتے ہی اُسے نیند آنے لگتی ، کیسے نرم نرم گدے ، کیسے ملائم تکیے . . . جیسے ان میں روئی نہیں ریشم ، ولایتی اون یا سنبل ہی تو بھرا ہے ــــ یہاں کی ہر چیز اسقدر نرم ، ملائم اور چکنی ہے . . . . ایک اپنا گھر ہے ۔ ڈیڑھ کمرہ ۔ زنگ خوردہ زنگ لکڑی کے کھوکھوں پہ لگائے ہوئے کنستروں بھرے گدے اور تکیے ، ممانی کی پرانی قمیصوں اور غراروں سے بنائی ہوئی دولائیاں . . . تکیے اس قدر سخت جیسے ان میں کترنیں اور روئی نہیں پتھر کی سل رکھی ہے . . .
. . ممانی کے ہاں سے واپسی پر اُسے بہت سی چیزیں ملتیں ، پرانے کپڑے سارے گھرانے کے لئے ، پرانے پرس ، جوتیاں اور چپل وغیرہ پرس کو وہ اپنے طور پر لڑکیوں کے ڈریسنگ تھیلوں سے پھینکے ہوئے گھسے پرانے میک اپ کے سامان سے بھرلاتی ، مہنگی مہنگی ادھ ٹوٹی سنہری روپہلی خول کی لپ اسٹکیں قطرہ قطرہ بچے ہوئے سینٹ کی خالی خالی سی شیشیاں ، پوڈر ، آئی برو پنسلوں کے ننھے ننھے گھسے ہوئے ٹکڑے ــــ جمی جمی سی نیل پالش کی شیشیاں ، گاڑی میں بیٹھی وہ شہر کو حسرت سے دیکھے جاتی ، ممانی کے گھر سے جاتے ہوئے اس کا دل ڈوبنے لگتا ، سوسائٹی کی سڑکیں گذر جاتیں ، جہانگیر سینما روڈ پیچھے رہ جاتی . . . تین ہٹی کا پل لمحہ بھر میں گذر جاتا ، مگر شمیم جیسے پل پر آتے ہی دو ٹکڑے ہو جاتی . . . . ایک حصہ سوسائٹی کی طرف اڑنے لگتا ، جہانگیر سینما روڈ پر بھاگے چلا جاتا اور دوسرا حصہ فیڈرل ایریا ، کمرشل ایریا ، مارکیٹ سے ہوتا ہوا ۔ اپنے گھر کے سامنے جا کھڑا ہوتا . . . وہی ماحول ، وہی گندگی ، وہی غربت ، ہر چیز بے رونق ، ہر شے بے جان سی ، نہ وہ چمک ، نہ وہ زندگی نہ زندگی کی خوبصورتی ۔ یہ تین ہٹی کا پل . . . . یہ میری راہ میں کیوں آتا ہے ۔ یہ مجھے دو حصوں میں کیوں بانٹ دیتا ہے ــ . . . میں ممانی کے یہاں کیوں جاتی ہوں ــــ میرا گھر ــ میرے ابا میاں کے بل بوتے پہ ان کی حیثیت کا ہے ــــ ابا بیچارے ــ کراچی کی ان تیز ہواؤں میں سائیکل چلاتے ہیں . ـــ ساڑھے دس بجے دن سے گھروں کے دروازے کھٹکھٹا کر روٹی جی کی صدا لگاتے ہیں . وہ دفتروں میں بابوؤں کا کھانا پہنچاتے ہیں . پندرہ بیس گھروں سے انہیں چھ ، سات روپے فی گھر مل جاتے ہیں سائیکل کے کیریر پر دھرے ہیں . ہاٹ کیس ، ٹیفن باسکٹ ، ٹیفن کیریر ، اور ڈبے لاد کر وہ سارے شہر کی خاک چھانتے ہیں شام کو نکڑ کا پان والا بابا کے پاس آ بیٹھتا ہے . بڑا سیدھا سا جی بھی ہے بس یونہی دال روٹی چل رہی ہے ۔
ایک ممانی کا گھر ہے ماموں علیحدہ کماتے ہیں ان کے پاس گاڑی ہے جازی میاں الگ کام کرتے ہیں ان کی بھی اپنی گاڑی ہے ۔ . . . . نوید باجی زاہدہ آپا اپنی شان میں ہیں . . . . . . جب جی چاہے سینما جائیں ، کپڑے سلائیں ساڑھیاں خریدیں . . . . گھر لوٹ کر شمیم کی طبیعت خراب ہو جاتی رات بھر سخت تکیے اور پتھر ایسے بستر پہ اسے نیند نہ آتی . . . نیند آتی بھی تو جیسے جازی میاں چوٹی کھینچ دیتے ، کندھے پہ ہاتھ رکھ کر سختی سے دبا دیتے . ـــ ۔ جازی میاں چلتے چلتے خواہ مخواہ ہی کندھوں سے پکڑ کر اسے اپنے راستے سے ایک طرف کر دیتے ۔ کمر کو ناپ جاتے . . . . . . مگر دباؤ اور ہاتھوں کی سختی کا احساس اس وقت ہوتا جب وہ مسکرا کر کمرہ بھی پار کر جاتے ــــ ان کے ہاتھوں اور بازوؤں کی سختی بالکل صابن کے جھاگ ایسی ہوتی تھی جھاگ سے بھر جائے نرم نرم ملائم ملائم خنک سی اجلی جھاگ . . . مگر تہ میں وہی گدلا پانی ، . . . . اسی طرح جلن میں سنسناہٹ ابھارتی سختی کا تو بعد میں حال کھلتا ــ یا اسوقت جب وہ اندھیرے میں اپنے سخت سخت سے بستر پہ لیٹ کے جانے کیا کچھ ہوئی ان ہوئی سوچتی چلی جاتی ۔
ہیں کیسے شریر جازی میاں ــــ وہ ، وہ جب میں نوید باجی سے کہہ رہی تھی " آپ کے تکیے میں کیا بھرا ہے ۔ . . ایسا نرم

ایسا ملائم کہ بس اس پہ تو سر رکھتے ہی نیند آنے لگے ۔۔۔ بہت ہی نرم ہے سچی ۔۔۔۔۔"

"تم سے بھی زیادہ ——— "سمجھ لو اس میں بھی صحت مند خون اور اس پہ بھی تنی ہوئی چکنی جلد منڈھی ہے بس بالکل ۔۔۔"

اوئی اللہ ——— بے شرم، ایسی باتیں کیسے کھلے کھلے سب کے سامنے کر دیتے ہیں ۔ ——

سگرٹ کیسے پیتے ہیں ۔۔۔ جی چاہتا ہے اس کا خوشبودار اجلا اجلا دھواں سونگھتی رہوں ۔ ایک پیتے ہیں ہمارے ابا دو دن سے پتہ لگ جاتے کہ "ایک ٹیڈی پیسے میں ایک" مارکہ سگرٹ پیا جا رہا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ذرا طبیعت ٹھکانے آجاتی تو شمیم میک اپ کے سامان کو نکالتی درست کرتی ۔ دو چار آنے کی اسپرٹ ملا کر جمی ہوئی نیل پالش کو گھولتی، انگلیوں کی پوروں سے دبا دبا کر لپ اسٹک کی نوک نکالتی ۔۔۔ اور چہرہ سجالیتی ——— اور یوں اُسے ڈھکے چھپے سنگار کرتے اور رکے ہوئے دیکھ کر محلے میں نئی نئی افواہیں اڑنے لگتیں ۔

"اے میں نے کہا کوثری کی اماں ۔۔۔ رنگ ڈھنگ دیکھے ہیں جمیلہ کی چھوری کے ——— اے بوا ہمیں تو شک پڑ رہا ہے"

"ہم دیکھے ہیں بوا ——— ہم تو سب ہی جانیں ہیں بے ماں باپ ہی کھلے ہیں ۔۔۔۔۔"

"وہ تو کمائی کھاتے ہیں ۔۔۔۔۔ اے چاند کی بوا ۔ تم جانو ہمارے بھی بس اچھے رشتہ دار ہیں اسی کالونی میں ہی رہے ہیں انکے پاس بھی بڑھیا بڑھیا موٹریں ہیں ۔ مگر ہم جوتی بھی نہیں مارتے تم جانو جو سنکھ اپنے نیوبارے ———"

ان سب باتوں کو بار ہا سنایا گیا تھا اور ہر بار کمرے کے دروازے پہ پڑی دری کی اوٹ میں کھڑے ہو کر جمیلہ آپا نے "ہمارے امیر رشتہ داروں سے جلنے والو ——— اور ہم پہ الزام دینے والو" کو خوب خوب سنائی تھیں ——— ۔۔۔۔

اب تو ممانی نے خود ہی شمیم کی شادی کی بات شروع کی تھی، بقول ان کے انہیں شمیم کو دیکھ دیکھ کر ہول اٹھتا تھا، اور چاہتی تھیں شمیم کہیں قریب ہی رہے ———

گہرے گلابی رنگ پلاسٹک کے تار اس کے ہاتھوں میں لرزتے رہے ۔ "میرے قریب" ممانی کا مطلب کیا ہے ——— جگمگاتی ہوئی کوٹھی، سبزے بھرے لان، کمروں میں گونجتے ہوئے ریڈیو کے گانے، کسی مہمان کی خبر دیتی ہوئی کال بیل کی ٹن ٹن جو لہکاتی ہوئی ٹیلیفون کی گھنٹی، سجے سجائے کمرے ——— نرم نرم سے بستر ——— مگر جازی تو ——— جازی میاں تو مجھے چکنی چکنی جلد کی ملائم ملائم سی لڑکی کہتے ہیں ۔۔۔۔ نرم نرم بستروں میں ۔۔۔ چکنے چکنے جسم ——— اس نے تصوروں میں دیکھ کر آنکھیں بند کر کے ہونٹ سکوڑ لئے ——— ۔۔۔ لو یہ، جھلاہٹ میں بغیر کراس ہی کے پھول کی گرہ لگا کر اتنا بڑا سوراخ کر لیا ہے میں نے ——— اس نے جھنجھلا کر تاریں ادھیڑ لیں، جب سے کراچی میں پلاسٹک کے تاروں سے پرس، ٹوکریاں وغیرہ بنانے کا کام شروع ہوا تھا شمیم نے ممانی اور اس کی لڑکیوں کے لئے کتنی پرس اور ٹوکریاں بنا ڈالی تھیں رنگ برنگی، ایک رنگ کی، کنٹراوڈ ال کر زپ والے پرس، یہ پرس بھی تو ممانی کا تھا ۔ اور ممانی نے آج جمیلہ آپا کو خاص بات کے لئے بلایا تھا، جمیلہ آپا اور ماموں میاں کبھی کسی نسل میں ایک ننہیال سے تھے اب رشتہ تو باقی نہ تھا جو تھا وہ بھی غربت اور ماحول کی قطعی ناموافقت کے باعث بہت پیچھے کسی بزرگ کی قبر تک آن کر ختم ہو گیا تھا اب تو بس ممانی کی غریب پروری نے عزیزداری کا بھرم رکھا تھا ——— ۔۔۔ اور شمیم کی عادات اور سلیقہ نے ممانی کے دل کو جیت رکھا تھا ۔ اسی لئے تو شادی کی فکر بھی انہیں ہی تھی ۔

شادی کے بعد وہ یہ تین ہٹی کا پل پار کر جائے گی ——— یوں تو اب لیاقت آباد بی ون ایریا اور فیڈرل ایریا بھی ترقی کر گیا تھا مگر شمیم تو یہ سارا علاقہ ہی چھوڑ کر پُل کے اس پار چلی جانا چاہتی تھی جہاں اپنے ماحول کا سایہ تک نہ ہو ——— ۔۔۔۔۔

جمیلہ آپا آئیں تو خوشی چہرے پر رونق اور تازگی بن کے چھائی تھی۔ . . . کوئی بڑی بات تھی جو انہیں ہضم نہیں ہو رہی تھی، انہوں نے برقعہ کھونٹی پہ ڈالا، پھر وہاں سے بھی اتارا اور بکس میں بند کر دیا، گھڑے سے جا تڑپل کے پانی پیا، پان کی گلوری منہ میں دبائی اور دروازے کی دری تھام کر کھڑی ہو گئیں۔

"اے میں نے کہا کیا پکایا کوثری کی اماں، میں تو سویرے بھابی کنے گئی تھی سو سایئے . . . . ."

"بھابی کنے تم گئیں تھیں خالہ کی اماں، شمیم نہ گئی آج" کوثری کی اماں نے ٹاٹ کے سوراخوں سے جھانک کر پوچھا۔ ایک تیز رفتار گدھا گاڑی دھول اڑاتی سامنے سے گزر گئی۔ ماں کی خاموشی کا یہ لمحہ شمیم پر تلوار بن کے گزر گیا۔

"ہاں آج میرا کام تھا" اماں نے دھول کے چہرے سے پوچھنے کی کوشش بھی نہیں کی، بلکہ اور بھی باہر نکل کر بلند آواز میں بولیں —

"اے اپنی شمیم کی بات پکی کرنے گئی تھی —"

"شمیم کی بات؟" —— رجو کی اماں چھپر تلے سے نکل آئیں۔ . . کلثوم نے کھڑکی سے سر نکال لیا، بلقیس بھی دروازے پر پیک اگلنے کے بہانے باہر کو جھک آئی . . . . .

"بھابی بہت دنوں سے کہہ رہی تھیں . . . تم جانو شمیم کا انہیں خیال ہی بہت ہے . . . کئی بار زور دے چکی تھیں . . . ہمیشہ کہتی تھیں پڑھی لکھی لڑکی ہے اچھا گھر چاہیئے اس کے لئے . . — — ."

شمیم جیسے ایکدم پل پار کر کے بڑی بڑی سڑکوں کو پل بھر میں طے کر کے سوسائٹی پہنچ گئی، نرم نرم بستر . . . . پرسکون گھرانے۔ سڑکوں پہ زندگی۔

"بھابی کے بیٹے اعجاز احمد نے اپنی ماں پر زور دیا تھا۔ وہ علیحدہ کاروبار کرتے ہیں نا! تو اس کے پاس اپنا ایک بابو ہے اُسے دو سو روپے ماہوار تنخواہ دیتا ہے۔ بابو بڑا شریف ہے۔ بڑا نیک بچہ ہے۔ . . . . بارہ جماعت پڑھا ہے . . میری شمیم تو . — ."

حازی کا کلرک۔ وہ دُبلا پتلا سا حسین خاں، . . . . تین ہٹی کے پل کے اس پار ہوتے ہوئے بھی مانو اس کا گھر بالکل اسی نقشے کا تھا۔ مارٹن روڈ کے کواٹروں میں کسی سے لئے ہوئے دو کمرے، دروازے پر شطرنجی کا پردہ، اندر شور مچاتے ہوئے بڑے بھائی کے بچے، سہمی ہوئی ترسی جوان بہنیں، تھکی تھکی سی بوڑھی ماں۔ سخت سخت بستر اور بدبودار دھواں اگلتے صابن کی سخت بُو ایسے موہ . . .

زندگی میں کوئی تبدیلی کوئی نیا پن نہیں، . . . . اُس پار یا اس پار کچھ فرق ہی نہیں، . . . ہا —— زندگی . . . .

پلاسٹک کے تاروں کو سلجھاتے سلجھاتے شمیم کو یوں لگا جیسے حازی میاں کے سمنت سینے یہ سوئیٹر سکڑ گیا ہو۔ اور انہوں نے ریشم ایسے نرم سوئیٹر کو بڑی فراخدلی سے اپنے کلرک کو بخشش کر کے شمیم کی قیمت چکا دی ہو —— : ۔

رشید امجد

احساس کا تیر

حامد کو زرینہ سے پرستش کی حد تک محبت تھی لیکن اس کے باوجود وہ کبھی زرینہ کی مالی امداد نہ کرسکا، جو بیوہ ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کی کفالت کا واحد ذریعہ تھی۔ اس کی گذراوقات کا انحصار ان کپڑوں پر تھا جو اڑوس پڑوس سے سلائی کے لئے مل جاتے۔ کس مپرسی کی زندگی بسر کرتے ہوئے بھی زرینہ کے ماتھے پر کبھی بل نہ پڑا تھا۔ وہ بچپن ہی سے خواب دیکھنے کی عادی تھی۔ اس لئے اس نے اپنے دکھوں کا علاج بھی سپنوں ہی میں تلاش کرلیا تھا۔ اکثر پچھواڑے کے میدان میں کسی پیڑ تلے حامد سے اس نے کہا تھا۔

"رات اگر تاریک ہے تو کیا ہوا؟ سورج بھی تو آخر نکلے ہی گا نا!"

لیکن حالات کے ایک ہی جھٹکے نے اس کی کمر توڑ ڈالی۔ وہ جس مکان میں سکونت پذیر تھی، اُس کا کرایہ انہوں نے کبھی نہ دیا تھا، لیکن جب مکانوں کی منتقلی کے مرحلے میں ان کا مکان نیلام ہوگیا تو نئے مالک مکان نے کرائے کا نوٹس بھجوا دیا۔ بیس روپے مہینہ کرایہ زرینہ کے لئے تکلیف دہ نہ تھا لیکن پچھلے دس ماہ کے کرائے کی ادائی ناممکن تھی، اور اس سے بھی زیادہ روح فرسا تصور مکان کے خالی کرنے کا تھا۔ لے دے کر زرینہ کا ایک ہی آسرا حامد تھا۔ وہ نوٹس لے کر اس کے پاس بھاگی آئی۔

حامد نوٹس پڑھ کر چکرا گیا۔ اس کی آمدنی کا ذریعہ محدود تھی جس سے بمشکل اتنے پیسے ملتے تھے جن سے پیٹ بھرنے کو روٹی اور تن ڈھانپنے کو کپڑا مل جاتا۔ وہ اتنی بڑی رقم کے تصور ہی سے کانپ گیا۔ لیکن زرینہ کو تو بہرحال تسلی دینی ہی تھی۔

زرینہ کے جانے کے بعد وہ نیم تاریک برآمدے میں کھڑا خلا میں گھورتا رہا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس بے آسرا جہاز کی طرح ہے۔ جسے غم کی لہریں گھیر کر سمندر میں لے آئیں اور آنکھ مچولی کھیلنے لگیں۔

دو سو روپے کے لئے اُس نے ایک ایک دروازہ کھٹکھٹایا اور ایک ایک واقف کار کے آگے دامن پھیلایا لیکن کسی طرف سے کامیابی نہ ہوئی۔ ہر سمت سے مایوس ہوکر اسے سیٹھ شفقت کا خیال آیا جس کے پاس وہ اپنی تصویریں بیچا کرتا تھا۔

سیٹھ اس کی باتیں سن کر چند لمحے چپ رہنے کے بعد بولا "بھائی! تم بہت اچھے مصور ہو، میں مانتا ہوں ۔۔۔ لیکن ابھی تو تمہاری پہلی تصویریں ہی جوں کی توں رکھی ہیں۔"

"لیکن سیٹھ صاحب۔"

"بھئی تمہارا کہنا ٹھیک ہے۔ تم مجھے کوئی شاہکار بنا دو گے لیکن اس دور میں شاہکاروں کو پوچھتا ہی کون ہے۔ ہم تم پرانے تعلقات ہیں

میں تمہیں مایوس نہیں کرنا چاہتا ۔ ہاں ایک صورت ہے ..... "
"وہ کیا ۔؟"
"اگر تم کوئی ایسی تصویر بنا سکو ۔ میرا مطلب ہے جیسی ان دنوں لوگ پسند کرتے ہیں ۔ یعنی ذرا عریاں سی .... "
سیٹھ نے بات ادھوری چھوڑ دی ۔
"نہیں ۔ نہیں !"
وہ جلدی سے بولا ۔
"میں ایسی تصویر ہرگز نہیں بناؤں گا ۔ آپ جانتے ہیں میں نے کبھی عریاں تصویریں نہیں بنائیں ۔ آپ نہیں سمجھتے فن کار اور قوم کا کیا رشتہ ہے اور ۔ اور اگر دی ۔"
"یعنی میں نے تو ایک بات کی تھی تمہاری مرضی ۔ لیکن ایک بات یاد رکھو تم یہ جذبات اس قوم کے لئے رکھتے ہو جو تمہارے لئے ایک خوشی نہیں خرید سکتی ۔"
سیٹھ پہلے بھی کئی بار ننگی تصویروں سے متعلق کہہ چکا تھا ۔ لیکن اس کے ضمیر نے کبھی گوارا نہ کیا کہ ایسی تخلیق کو جنم دے جس کی رگوں میں خون کی بجائے زہر دوڑ رہا ہو ۔ اس نے فن کے لئے بہت سی قربانیاں دی تھیں ۔ کتنے ہی فاقے کئے تھے اور ان گنت راتیں فٹ پاتھ پر ٹھٹھر ٹھٹھر کر بسر کی تھیں لیکن تقدس کے اس پردے کو ہمیشہ قائم رکھا تھا ۔
وہ سیٹھ کو کوئی جواب دیئے بغیر باہر نکل آیا ۔ سرمئی شام اندھیرے کی گود میں دم توڑ چکی تھی اور سڑکوں پر چہل پہل بڑھتی جا رہی تھی وہ ماحول سے بیگانہ سڑکوں پر گھومتا رہا ۔ اس کے ذہن میں سیٹھ ، زرینہ اور لڑکوں کے خاکے بن بن کر بگڑ رہے تھے اور وہ ان بنتے بگڑتے خاکوں میں رنگ بھرتے ہوئے ذہنی الاؤ کو بجھانے کی ناکام کوشش کر رہا ۔
جوں جوں نوٹس کی آخری تاریخ قریب آ رہی تھی زرینہ کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا ۔ وہ حامد کی طرف دیکھتی اور اس کے چہرے پر منڈلاتی مایوسیوں کی پرچھائیاں دیکھ کر سر جھکا لیتی ۔ حامد اسے جھوٹی تسلی دیتا ، لیکن وہ خود بھی جانتا تھا کہ یہ تسلی ریت کی دیوار ہے جو ہوا کے ایک ہی جھونکے سے گر جائے گی !
نوٹس کی میعاد میں دس دن باقی رہ گئے اور روپے کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا ۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر حامد نے خود کو کمرے میں بند کر لیا ، زرینہ نے بھی مایوس ہو کر مطالبہ چھوڑ دیا ۔ دراصل وہ خود بھی زرینہ کا سامنا کرتے ہوئے گھبرانے لگا تھا ۔

سرد رات کے سیاہ آنچل سے لپٹے سورج کے زرد پتے چاروں طرف بکھر گئے تھے ، اور رات یوں لگ رہی تھی جیسے کالی آنکھوں میں اٹکا ہوا آنسو جو سرمئی پلکوں کی جنبش سے لرز رہا تھا ۔ حامد نے کھڑکی بند کر دی اور ذہنی پریشانی سے بچنے کے لئے ایزل کے سامنے آ بیٹھا ، اور بے مقصد برش اٹھا کر خط کھینچنے لگا ۔
سیاہ ماتمی خطوط بے ترتیبی سے ایزل پر چھا گئے ۔
چند لمحوں بعد اس نے چونک کر ایزل کی جانب دیکھا جو خطوط سے بھر گیا تھا ، اُسے یوں محسوس ہوا جیسے ماتمی خطوط زرینہ کا روپ ہیں ۔ سیاہ خطوط پہ رکھی زرینہ کی لاش آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھتی رہی ۔

وہ کچھ دیر ایزل کو دیکھتا رہا۔ پھر نئے عزم سے تصویر بنانے لگا۔ تصویر جیسے خود بخود بنتی چلی گئی ـــــ جب وہ تصویر مکمل کر چکا تو رات گہری ہو گئی تھی۔ اُس نے کھڑکی کھول کر سگریٹ سلگایا اور آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کو گھورنے لگا، جو آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ دفعتہً مینہ برس پڑا۔ اور اُسے یوں محسوس ہوا جیسے بارش کے یہ قطرے وہ التجائیں تھیں جو عرش کے بندو دروازوں سے ٹکرا کر پگھل گئی تھیں۔

بادل چیخ چیخ کر روتے رہے۔ وہ کھڑکی بند کر کے تصویر کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا، اور اسے دیکھنے لگا۔ چند لمحے وہ تصویر کو دیکھتا رہا۔ پھر باہر آ گیا اور کمرہ بند کر کے زرینہ کے گھر کی طرف چل پڑا۔ زرینہ کے گھر کے سامنے پہنچ کر وہ پریشان سا ہو گیا۔ وہ پہلے بھی کئی بار اسی طرح زرینہ کے گھر آیا تھا، لیکن اس وقت اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ کھلے دروازے سے اوپر چڑھ جائے۔ وہ کئی بار سیڑھیوں تک گیا اور لوٹ آیا اس کے ذہن میں تصویر گھومنے لگی۔

سگریٹ سلگا کر وہ تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا، پھر دبے پاؤں اوپر چڑھنے لگا۔ دروازے پر وہ رُک گیا۔ کمرے میں جیسے کوئی سسک رہا تھا۔ وہ دروازے پر دستک دینے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک آدمی کمرے سے نکلا۔ وہ آدمی اُسے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا لیکن پھر تیزی سے اس کی بغل سے ہوتا ہوا اندھیرے میں گم ہو گیا۔ وہ تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ اُس نے بتی جلائی اور لرز کر رہ گیا۔ زرینہ ہاتھوں میں نوٹ تھامے رو رہی تھی۔ اُس نے جلدی سے بتی بجھائی اور دوڑتا ہوا نیچے اُتر آیا۔

اپنے کمرے میں آ کر وہ کرسی پر گر گیا، اور ایزل کو دیکھنے لگا۔ ایزل پر جہاں رنگوں کے امتزاج سے روحانی خوب صورتی اُجاگر ہوا کرتی تھی، ایک رقاصہ کی ننگی تصویر ہنس رہی تھی۔ اس سے پہلے اس نے کبھی عریاں تصویر نہ بنائی تھی۔ لیکن حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے فن کے مقدس نقوش کو صلیب پر چڑھانا پڑا تھا۔ اور اسے یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے ان شہ پاروں کو بھی مار ڈالا ہے۔ جنہیں اس نے برسوں جاگ کر تخلیق کیا تھا۔

اُس کے چہرے پر لاش کی سی زردی تھی اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ایزل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے لیکن اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ اُٹھ کر ایزل تک ہی جا سکے۔ نیم تاریکی میں تصویر کو گھورتے ہوئے وہ سوچنے لگا تخلیق اچھی ہو یا بُری احساس کے ترکش سے نکلا ہوا وہ تیر ہے جو کبھی واپس نہیں آتا۔ وہ سوچتا رہا۔ ایزل پر ننگی رقاصہ ناچتی رہی ـــــ اور ناچتی ہی چلی گئی ـــــ!

عبدالغفار چودھری
ترجمہ
سید رضا کاظمی

لوحِ مزار

(بنگلہ کہانی)

فرگوسن کے متعلق کہانی لکھنے کی میری کوئی خواہش نہ تھی لیکن خود اسی نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں اس کے بارے میں کہانی لکھوں۔ لیکن نہیں یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ خود اسی نے مجھے مجبور کر دیا ہے کیونکہ اب وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہے اور صاحب پاڑہ کے پرانے قبرستان میں پختہ قبر کے اندر دفن ہے اور اس کی قبر کے ارد گرد لگی ہوئی پھولدار گھاس اس کی قبر پر لگی ہوئی صلیب کو چھو رہی ہے!

جب فرگوسن زندہ تھا تو اس نے متعدد بار ہنس ہنس کر مجھ سے کہا تھا: "تمہارے ملک میں کتنی خوبصورت گھاس اگتی ہے اور اس کے سفید پھول کتنے بھلے لگتے ہیں پھر تم لوگ قبر پر سنگ مرمر کا کتبہ کیوں لگاتے ہو؟"

شائد اسی لئے فرگوسن کی قبر پر کوئی کتبہ یا لوح نہیں ہے۔ اس کی موت ایک دردناک حادثے سے وابستہ ہے۔ اور آج بہت دنوں کے بعد صاحب پاڑہ کے قبرستان کے قریب سے گذرتے ہوئے معاً میری نظریں فرگوسن کی قبر پر ٹک گئی ہیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے اس کی قبر پر جھکی ہوئی گھاس کسی کتبہ سے زیادہ نمایاں نظر آ رہی ہے اور جھوم جھوم کر فرگوسن سے سرگوشیوں میں کچھ کہہ رہی ہے!

میرا دل اداس ہو گیا۔ اکثر میری ایسی ہی حالت ہو جاتی ہے ماضی کی یاد میرے لئے بڑی صبر آزما ہوتی ہے۔ حال مجھے اجنبی اور عجیب سا محسوس ہوتا ہے لیکن ماضی اپنا پرانا ساتھی معلوم ہوتا ہے۔ سکھ کے لمحے ہوں یا دکھ کی گھڑیاں۔ تمام احساسات کو ٹٹا کر احتیاط سے جمع کئے ہوئے موتیوں کی مانند ماضی دل کے فریم میں درخشاں رہتا ہے جگمگاتا رہتا ہے اور اسی لئے میرا دل اداس ہو جاتا ہے۔ دراصل اس کیفیت کو اداسی کہنا بھی درست نہیں ہے بلکہ اسے لطیف درد سے تعبیر کرنا چاہئے۔

لیکن فرگوسن کے متعلق میرے احساسات اس قسم کے نہیں ہیں جنہیں لطیف درد سے تعبیر کیا جا سکے۔ البتہ انہیں درد کا احساس جگانے والی دلچسپ یادیں کہنا صحیح ہوگا۔ ہر انسان زندہ رہتا ہے مر جاتا ہے لیکن اس کی یاد کسی کے دل و دماغ پر ہر لحظہ چھائی نہیں رہتی۔ البتہ من کے کسی گوشہ میں دبک کر بیٹھ جاتی ہے اور جب کبھی ابھرتی ہے تو من اداس ہو جاتا ہے دکھی ہو جاتا ہے۔ فرگوسن انگریز تھا اور ایک زمانہ میں قابل نفرت حکومت کی علامت سمجھا جاتا تھا لیکن اب وہ مر چکا ہے منوں مٹی کے نیچے دفن ہے۔

۱۹۴۲ء کی تحریک کے آخری دور میں فرگوسن فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کی حیثیت سے بنگال کے ایک مشہور ضلع میں تعینات کیا گیا تھا۔ وہ آئی سی ایس تھا اور بڑا سخت گیر قسم کا افسر تھا لیکن اس کے ہمراہ نہ تو نیم عریاں میم آئی تھی نہ کتے آئے تھے۔ اور اس پر مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی لیکن تعارف کے بعد ایک دن خود فرگوسن نے مجھے اس کا سبب بتا دیا تھا۔

"اس جنگ میں فتح ہماری ہی ہوگی کیلف لیکن اس فتح کو ہم فتح نہیں کہہ سکتے۔ جنگ کے بعد پینسٹھ فیصد انگریز خواتین کو امریکنوں یا ہندوستانیوں کے حوالے کر دینا پڑے گا فرانسیسیوں کو بھی سونپا جا سکتا ہے لیکن بیچارے ان کے ساتھ ساتھ فرانسیسی مرد بھی فتح ہو گئے ہیں۔"

نجانے کیونکر فرگوسن کو معلوم ہو گیا تھا کہ میرا نام احمد خلیفہ ہے۔ خاندانی پیشے کے اعتبار سے میں درزی ہوں لیکن ان دنوں میں صدر سررشتہ میں پیشکار تھا۔ اور اس طرح فرگوسن کا ماتحت تھا لیکن وہ میرے ساتھ دوستوں جیسا سلوک کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ایک دن میں نے ہمت کر کے اس سے کہہ دیا تھا۔ "میرا نام کیلف نہیں ہے سر۔ خلیفہ ہے۔"

یہ سنکر فرگوسن نے قہقہہ لگایا تھا اور اپنے چہرہ اور آنکھوں میں بیشمار سوالات بھر کر اس نے پوچھا تھا "تم کس نام سے پکارے جانے پر خوش ہو گے ——
کیلف یا خلیفہ؟" "خلیفہ۔ سر" میں نے بڑے ادب سے جواب دیا تھا۔

چند لمحے فرگوسن میری جانب عجیب نظروں سے گھورتا رہا تھا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا تھا "ہم لوگوں میں سب سے بڑا عیب کیا ہے۔ جانتے ہو؟ ہم لوگ غیر ملکیوں کے نام کے علاوہ وہاں کی چیزوں کے نام کا بھی صحیح تلفظ ادا نہیں کر سکتے اسی لئے خلیفہ کو کیلف اور کلکتہ کو کلکٹہ کہتے ہیں لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ تم لوگ بھی اس بگڑے ہوئے روپ کو پسند کرتے ہو۔ خیر۔ اب میں تمہیں تمہارے صحیح نام سے پکارا کروں گا۔ خلیفہ!"

لیکن دو دن کے بعد ہی فرگوسن کے لئے ایک نئی مشکل آ پڑی۔ اس کے خاص اردلی کا نام برکت تھا۔ فرگوسن نے برکت کو کنگ بابر کے نام سے پکارنا شروع کیا اس کی اس حرکت پر دفتر میں چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ نظارت کے اوم بابو نے جو پہلے سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لے چکے تھے ایک دن دفتر والوں کو اپنے پاس بلا کر کہا تھا۔

"تم لوگ سمجھتے کیوں نہیں۔ اس بدمعاش فرگوسن نے ہمارے بادشاہوں کا مذاق اڑانا شروع کر دیا ہے۔ معمولی اردلی کو شہنشاہ بابر کہہ کر بلاتا ہے۔ اس طرح ہمیں ذلیل کرنا چاہتا ہے۔"

"ذلیل کرنا چاہتا ہے؟" کئی آوازیں ابھری تھیں۔

"اور نہیں تو کیا؟ ہے کسی کی ہمت کہ اس کے قریب کھڑے ہو کر اپنے نوکر کو کنگ جارج کے نام سے پکارے؟ پھر دیکھو کہ فرگوسن خاموش رہ سکتا ہے؟"

"تو ہم بھی خاموش نہیں رہیں گے اوم بابو۔"

"پہلے ایک کپ چائے کا آرڈر دو پھر میں بتاؤں گا کہ تم لوگوں کو کیا کرنا چاہئے۔" کہکر اوم بابو نے اپنی آنکھیں موند لی تھیں۔

چائے پی کر اوم بابو نے جیب سے ناس کی ڈبیہ نکال کر ایک ایک چٹکی ناس اپنے دونوں نتھنوں میں ڈال کر سڑکی پھر آہستہ سے بولے تھے۔ "کچھ کرنے دھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تو وہ آ رہا ہے!"

"کون آ رہا ہے؟"

"ارے وہی ہٹلر۔ اور کون آ سکتا ہے۔" اوم بابو نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ "سنا ہے ڈنکرک کے بعد اب اس کی فوج لندن میں اترے گی۔"
ان دنوں روس کے برف پوش میدانوں میں گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔ اس لئے ہم میں سے کسی نے اوم بابو کی بات پہ سنجیدگی سے غور نہ کیا اگلے دن میں نے ہی وہ بات فرگوسن کو بتائی تھی "برکت کو بابر کے نام سے پکارنا مناسب نہیں ہے سر۔ اس سے ہماری توہین ہوتی ہے"

فرگوسن نے فوراً گھنٹی بجا کر برکت کو بلایا تھا اور جب وہ ان کے سامنے آکر مؤدب کھڑا ہو گیا تو فرگوسن نے میز کی دراز سے تاریخ کی کتاب نکال کر میرے سامنے رکھ دی تھی اور صفحے الٹ کر شہنشاہ بابر کی تصویر دکھا کر کہا تھا "تم خود دیکھ لو۔ کیا ان دونوں کے لباس میں کوئی فرق ہے؟

میں نے دیکھا تو درحقیقت دونوں کے لباس ایک جیسے تھے وہی ڈھیلی ڈھالی لمبی قبا۔ وہی جبہ ویسی ہی دستار۔ گو فرگوسن نے کچھ نہیں کہا لیکن میں نے دیکھا کہ برکت کی ڈاڑھی بھی کافی حد تک شہنشاہ بابر کی داڑھی سے ملتی جلتی تھی۔ مجھے تو یوں لگا تھا کہ شہنشاہ بابر تاریخ کے صفحات سے نکل کر فرگوسن کے سامنے آ کھڑا ہوا ہے!

مجھے خاموش دیکھ کر فرگوسن نے کہا تھا "کیا سوچ رہے ہو؟"

میں جو کچھ سوچ رہا تھا اگر اس پر ظاہر کر دیتا تو یقیناً میری ملازمت ختم ہو جاتی اس لیے میں خاموش رہا تھا۔

فرگوسن نے کہا تھا "بولو خلیفہ کیا سوچ رہے ہو۔ سچ سچ بتا دو اس وقت میں تمہارا افسر نہیں دوست ہوں۔ سچا دوست۔"

میں نے ہمت کر کے کہا تھا "چپراسیوں کے جسم پر اس قسم کی وردی تو آپ لوگوں نے ہی چڑھائی ہے سر۔"

"ہاں۔ لیکن کیوں؟ کیا تم نے اس کے بارے میں کبھی کچھ سوچا ہے؟"

میں خاموش رہا تھا۔

فرگوسن کی دونوں آنکھیں سانپ کی آنکھوں کی مانند چمکنے لگی تھیں۔ اس نے بھوئیں سکیڑ کر کہا تھا "یہ سب کچھ تم لوگوں کو ذلیل کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ تمہارے شاندار ماضی اور تمہارے جانباز بادشاہوں کی تضحیک کرنے کی غرض سے کیا گیا ہے۔ تمہیں دنیا والوں کی نظروں سے گرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد فرگوسن نے اپنی لال لال آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا تھا "اگر اس قسم کی باتیں ہمارے ملک میں کی جاتیں تو خون کی ندیاں بہہ جاتیں لیکن تم لوگ ؟ لائیک پٹی ڈاگس ــــــ کتے کو بھی غصہ آتا ہے تو وہ دانت نکال کر غراتا ہے لیکن تم لوگ تو اتنا بھی نہیں کر سکتے۔ ڈیڑھ سو سال سے انگریز چپراسیوں اور اردلیوں کو تمہارے بادشاہوں کا لباس پہنا رہا ہے تو اس سے تمہاری توہین نہیں ہوتی اور برکت کو بابر کہنے سے تمہاری توہین ہوتی ہے؟ خوب عجیب فلسفہ ہے تمہارا!"

میں چپکے سے اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔

اپنے افسر سے میرا اتنا میل ملاپ کبھی نہ ہوا تھا اس لیے فرگوسن کی خفگی دیکھ کر میں ڈر گیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ نیا ہونے کی وجہ سے اس نے اب تک اپنا اصلی روپ چھپا رکھا تھا لیکن اب دوستی کا نقاب اتار کر وہ اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہونے لگا ہے۔

لیکن صورت حال کا ذمہ دار بھی فرگوسن ہی تھا۔ اس سے پہلے وہاں سینڈی نامی مجسٹریٹ تعینات تھا۔ پورا نام ڈنکن سینڈی تھا۔ وہ بڑی بڑی مونچھوں والا خونخوار ٹائپ کا انگریز تھا اور اس کے خوف سے پورا دفتر کانپتا رہتا تھا مگر فرگوسن کے آنے کے بعد سب ہی کا خوف جاتا رہا تھا۔ وہ افسری ماتحتی کے رشتوں کو بھول کر سب کا دوست بن گیا تھا اور اسی لیے میں اس سے بے خوف ہو کر باتیں کرنے لگا تھا لیکن اس واقعہ کے بعد میں نے سوچا تھا کہ ڈرا دھمکا کر کے ڈرانا بھی ان انگریزوں کی فطرت ہے۔

لیکن اگلی شام کو نہ صرف میرا خوف دور ہو گیا بلکہ اپنی غلطی کا احساس بھی ہو گیا تھا فرگوسن نے مجھے اپنے بنگلہ پر بلوایا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ اپنے چاروں طرف چائے کے برتن اور سگریٹ کے ڈبے پھیلائے ہوئے بید کی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔

"لو چائے پیو۔" اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا اور خود ہی شکر اور دودھ کا پیالہ میری جانب بڑھا دیا تھا۔ جب میں چائے بنانے لگا تو وہ اٹھ کر

ریکارڈ پلیئر کے پاس چلا گیا اور اس پر ایک ریکارڈ چڑھا کر اس نے مجھ سے کہا تھا "تم بیٹھ کر میوزک سنو۔ میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہکر وہ اندر چلا گیا۔

اس وقت میلے برہمپتر کے ٹھہرے ہوئے پانی میں شام کا پہلا تارہ جھلملا رہا تھا اور آسمان ایسا نظر آرہا تھا جیسے کسی نے گلال چھڑک دیا ہو برہمپتر اس وقت سانپ کی مانند اپنا جسم پھیلائے مست لہروں کے جھولے پر سوئی ہوئی تھی۔ مغربی موسیقی سنکر مجھے ایسا لگا جیسے برہمپترا انگڑائی لیکر جاگ اٹھی ہو اور پانی کی چنچل لہروں کے ساتھ اس کی جوانی گا رہی ہو پہاڑ کے اندھیارے سے گھبرا کر باہر نکل آئی ہو اور کبھی ہلکے کبھی تیز سروں میں گاتی ہوئی آگے بھاگی جا رہی ہو!

فرگوسن نے اندر آکر میری پشت پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تھا "کیوں میوزک کیسا تھا؟"

"انگریزی ہے نا سر اس لئے سمجھ میں نہیں آتا۔"

دفعتاً اندھیرے میں فرگوسن کے پائپ کی آگ چمک اٹھی۔

"کیا تم جانتے ہو کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟" اس نے پائپ کا کش لیکر پوچھا تھا

"جی نہیں۔"

"صرف یہ جاننے کے لئے کہ تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو۔"

"نو سر۔"

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں اس وقت ہم دونوں افسر اور ماتحت نہیں ہیں دوست ہیں تو سگریٹ پیو۔"

ریکارڈ ختم ہوا تو فرگوسن نے میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ "ہاں۔ تو تم کتوں اور میم صاحب کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے!"

مجھے پچھلی بات یاد آگئی۔ میں نے جواب دیا۔ "یہی کہہ رہا تھا کہ چونکہ آپ نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے اس لئے آپ کے ساتھ میم صاحب نہیں آئیں اور چونکہ میم صاحب نہیں آئیں اس لئے کتے بھی نہیں آئے۔"

"انگریزوں کو پہلے اپنے جسم و جان کی حفاظت کرنے دو خلیفہ۔" فرگوسن نے ہنستے ہوئے کہا تھا "اگر میں جنگ سے پہلے یہاں آتا تو میں اپنے ساتھ میم بھی لاتا اور کتے بھی، بلکہ شراب کی پیٹیاں بھی لاتا۔ اور وہ تمام شراب تمہارے ہی روپوں سے خریدی ہوئی ہوتی۔ تمہاری عمر کے انگریز یہاں جج اور مجسٹریٹ بنکر آتے ہیں اور تم لوگ کلرکی سے آگے نہیں بڑھ سکتے اس کا سبب جانتے ہو؟"

میں نے ہمت کرکے جواب دیا تھا "لٹیروں نے تو سب کچھ لوٹ لیا۔ اب ہمارے لئے بالوگیری کرنے کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے۔"

"لٹیرے؟ وہاٹ ڈو یو مین؟ ہم لوگ لٹیرے ہیں؟" اس نے مجھے خشمگیں نظروں سے گھورا میں نے کھل کر جواب دینے کے بجائے بات گھما کر کہی۔ میں نے کہا تھا "کلائیو کے زمانے میں مرشد آباد لندن سے زیادہ خوبصورت۔ بارونق اور مالدار شہر تھا لیکن صرف ڈیڑھ سو سال میں ان دونوں میں کیا فرق ہو گیا ہے اگر آپ اس پر غور کریں تو پورے ملک کی حالت سمجھ میں آجائیگی۔"

غصہ کا اظہار کرنے کے بجائے فرگوسن نے قہقہہ لگایا تھا اور بات کا رخ پلٹتے ہوئے اس نے کہا تھا "ہسٹری کا غلط انٹرپریٹیشن مت کرو خلیفہ۔ تہذیب ہمیشہ جنگ و جدل اور لوٹ مار کے بطن سے ہی جنم لیتی ہے۔ تم کسے لٹیرا کہہ رہے ہو؟ کیا خود تم ہی لوگوں نے سومناتھ کے مندر کو سترہ بار نہیں لوٹا تھا؟"

وہ لاکھ میرا دوست سہی لیکن تھا تو انگریز اور میرا حاکم بھی۔ حاکم سے بحث نہیں کیجا سکتی اس لئے میں خاموش رہ گیا تھا۔

فرگوسن پنا پائپ بھر کر دھوئیں کے بادل بکھیرتا ہوا بولا تھا: صرف قوم کے لئے ہی نہیں ہر فرد کے لئے تہذیب کا ایک ہی مفہوم ہوتا ہے ــــ خود کو زندہ رکھنا اور ترقی کرنا تہذیب اسی طرح پھیلتی پھولتی ہے صرف تمہاری جان کی حفاظت کے لئے دنیا کی کتنی جانیں ضائع ہوئی ہیں اس کا تمہیں علم ہے؟"

تاریخ سے ہٹ کر فرگوسن بحث پر اتر آیا تھا میں نے یہی مناسب سمجھا تھا کہ اجازت لیکر اٹھ جاؤں۔

جب میں نے اس سے اجازت طلب کی تھی اس وقت برہمپتر کے چوڑے چکلے سینہ پر اندھیرا پھیل چکا تھا اور کنارے لگی ہوئی لالٹینوں میں اس کا پانی کہیں دھندلا کہیں سرمئی اور کہیں درخت کے سبز پتوں کی مانند نظر آیا تھا۔

فرگوسن نے کرسی سے اٹھکر اور میرے قریب آکر بڑے بے تکلفانہ انداز میں پوچھا تھا " تمہاری شادی ہو چکی ہے خلیفہ؟"

" جی ہاں۔ سر "

" کتنے بچے ہیں؟ "

" پانچ "

" مائی گاڈ۔ تمہاری عمر کتنی ہے؟ "

" تیس سال "

" مسز خلیفہ کیسی ہیں؟ "

" ان کی صحت اچھی نہیں رہتی۔ ہمیشہ بیمار رہتی ہیں "

" تم لوگ نہ تو زندہ رہنا جانتے ہو نہ زندہ رکھنا چاہتے ہو۔ دراصل تم لوگ موت کے تمنائی ہو۔ زندگی تمہیں ہاتھ کے اشارہ سے بلا کر بھی کیا کرے گی۔ اچھا سچ سچ بتاؤ" اس نے میری آنکھوں میں جھانک کر کہا تھا" مسز خلیفہ سے شادی کرنے سے پہلے تم نے کسی لڑکی کو آنکھ بھر کر دیکھا تھا؟ "

" جی نہیں " میں نے فخریہ لہجہ میں جواب دیا تھا

" زندگی کا رنگ کتنا انوکھا ہے۔ تم نے زندگی کو دیکھا تک نہیں اسے انجوائے کرنا تو دور کی بات ہے۔ صرف عورتوں میں ہی نہیں جوانی میں۔ زندگی میں۔ ہر جگہ اتنے سارے رنگ ہیں اتنی ساری خوشبوئیں ہیں پھر بھی تم لوگ ان سب کو چھوڑ کر کس چیز کی تلاش میں بھٹک رہے ہو؟ ذرا بتاؤ تو؟ "

میں نے کوئی جواب نہ دیا تھا لیکن میں نے دل ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ کل صبح دفتر میں اوم بابو سے کہونگا کہ اس نوجوان مجسٹریٹ فرگوسن کے دماغ میں کوئی خرابی ضرور ہے اتنے دور دیس سے آیا ہے۔ یہاں نہ تو اس کی جانی پہچانی سوسائٹی ہے نہ بیوی بچے ہیں ظاہر ہے کہ اس کے دماغ میں خلل نہ ہوگا تو کیا ہوگا؟!

" رنگوں کی کتنی قسمیں ہیں؟ جانتے ہو۔ دیکھا ہے؟ "

میں خاموش رہا تھا۔

" میرا رنگ سفید ہے تمہارا بادامی ہے۔ اس کے علاوہ زرد۔ سرمئی اور گھنے کالے رنگ بھی ہوتے ہیں۔ نجانے کتنے ان گنت رنگ ہیں۔ تم سوچ رہے ہوگے کہ اس آدمی کا دماغ خراب ہے! شاید ایسا ہی ہو۔ میں یہاں کے دوسرے انگریزوں سے بھی نہیں ملتا ہوں ۔

کلب نہیں جاتا اور اپنے پینٹ کار کو دوست بنا کر اس سے بے تکی باتیں کرتا ہوں۔ یہ سب پاگل پن نہیں اور کیا ہے؟ لیکن تم ہی بتاؤ۔ جس کی آنکھوں میں بہت سے رنگ لہرا رہے ہوں وہ صرف رنگ پر ہی کیونکر دھیان دے سکتا ہے۔ اس ملک میں کیسے کیسے انوکھے رنگ نظر آتے ہیں۔ جب سورج ڈوبتا ہے تو اس کے سرخ رنگ کے گرد چھائی ہوئی سیاہی کو سرخ رنگ میں گھلتے اور بدلتے ہوئے تم نے دیکھا ہے؟"

دفعتاً کمرہ میں [illegible] ہاتھ میں [illegible] اندھیرے کے پردوں کو چیرتی ہوئی روشنی کی بے شمار لہریں کمرہ میں بکھر گئی تھیں۔ اور فوراً ہی روشنی کی بتی [illegible] سیاہ جسم ابھرا۔ پہلے تو میں نے یہی سمجھا تھا کہ وہ جست کی ایک مورتی ہے لیکن اسے حرکت کرتے دیکھ کر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔ وہ چوبیس پچیس سال کی ایک کالی بھجنگ لڑکی تھی جو فرگوسن کی نوکرانی تھی۔

فرگوسن نے اسے آواز دی تھی "الفتی"!

"سا ب حضور" نوکرانی نے جواب دیا تھا۔

اور مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے فرگوسن رنگوں کا کھیل کھیل رہا ہے۔ اس لڑکی کے گٹھے ہوئے سیاہ جسم پر پڑتی ہوئی روشنی سے مزید چمک پیدا ہو گئی تھی الفتی کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ اندھیرے میں بجلی کی روشنی اتنی تیز کیوں نظر آتی ہے وہ سرخ ریشمی ساڑی پہنے ہوئے تھی بغیر آستین کے بلاؤز میں سے اس کے سڈول اور دلکش بازو باہر جھول رہے تھے۔ اس کے اوپر اٹھے ہوئے جوڑے میں سرخ پھول گوندھے ہوئے تھے میری نظریں اس کے جسم کے مختلف کھلے ہوئے حصوں کو ٹٹولنے لگی تھیں۔ میں نے سینڈی صاحب کی کوٹھی پر خود ان کے ملک کی خادمہ کو دیکھا تھا لیکن الفتی کی بات ہی کچھ اور تھی!۔

"اچھا اب تم جاؤ خلیفہ۔ میں ذرا باہر جا رہا ہوں" فرگوسن نے الفتی کی جانب کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا تھا۔

بنگلے سے باہر نکل کر سڑک پر چلتے ہوئے میں نے دفعتاً سوچا۔ جب سورج ڈوبتا ہے اس وقت سرخی اور سیاہی کے میل سے جو رنگ پیدا ہوتا ہے کیا وہ بھی الفتی کی مانند رنگین اور حسین ہوتا ہے؟!

چند روز بعد اوم بابو نے ایک گرماگرم خبر سنائی تھی "شہنشاہ بابر نے فقیری لے لی ہے اور دنیا تیاگ دی ہے"

"پہیلی نہ بجھوائیے۔ اصل بات بتائیے" میں نے جوش میں کہا تھا۔

اوم بابو کے دوست موہن بابو نے چٹکی لیتے ہوئے کہا تھا "چونکہ افریقہ کے فرنٹ پر رومل کی فوج پیچھے ہٹ رہی ہے اس لئے ان دنوں ہٹلر بہت مصروف ہے اور اسی وجہ سے اب تک اصل خبر اوم بابو کے پاس نہیں بھیج سکا ہے"

"اچھا اچھا جنگ کی باتیں رہنے دو شہنشاہ بابر کی بات بتاؤ"

"بات کیا ہے بس یہی کہ برکت نوکری چھوڑ رہا ہے"

"آخر کیوں؟"

"اس لئے کہ اس کی جورو نے اسے چھوڑ دیا ہے"

"چھوڑ دیا ہے؟"

"ہاں بات کچھ ایسی ہی ہے۔ اور اگر اصل بات جاننا چاہتے ہو تو وہ یہ ہے کہ وہ فرگوسن کی محبت میں الجھ گئی ہے۔"

یہ سنتے ہی میری نظروں کے سامنے الفتی کا سڈول جسم اور بے داغ چہرہ ابھر آیا تھا۔

"تو گویا الفتی برکت کی بیوی ہے" میں نے پوچھا تھا "حیرت ہے......"

اوم بابو نے کہا تھا " فرگوسن نے برکت سے کہا تھا کہ وہ ایک نوکرانی تلاش کرلائے۔ یہ سنکر برکت کو لالچ آگئی اس نے سوچا کہ خود اس کی بیوی نوکر ہو جائے تو کیا ہرج ہے۔ آمدنی بڑھ جائیگی۔ یہ اسی لالچ کا پھل ہے "

" تو پھر اتنی سی بات کے لئے کوئی نوکری چھوڑ کر فقیری لیتا ہے " میں نے منمنا کر کہا تھا۔

اوم بابو نے ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھ کر پوچھا تھا " کیا تمہاری محبت کی شادی ہے؟ "

" جی نہیں " میں نے جواب دیا تھا

" تو پھر زیادہ سمجھنے کی کوشش مت کرو "

فرگوسن تین چار روز تک کورٹ نہیں آیا تھا اطلاع ملی تھی کہ اس کی طبیعت کچھ خراب ہے چند ضروری کاغذات پر دستخط لینے کی غرض سے میں اس کے بنگلہ پر پہنچا تھا۔ سنتری نے جونہی پھاٹک کھولا میں نے ایک عجیب منظر دیکھا تھا۔ گھاس کے تختہ پر لٹکے ہوئے جھولے میں الفتی بیٹھی ہوئی تھی اور گنگنا کر پینگ بڑھا رہی تھی۔ اس دن وہ ڈھاکے کی سفید جامدانی کی ساڑی پہنے ہوئے تھی جس پر سیاہ اور سرخ پھول بنے ہوئے تھے اس کے کھلے ہوئے سیاہ چمکیلے بال اس کی پیٹھ پر لہرا رہے تھے مجھے دیکھتے ہی وہ بے تحاشا بھاگ کھڑی ہوئی اور اس کے اندر پہنچتے ہی فرگوسن کی آواز سنائی دی تھی " سوئیٹی "

میں ہال کمرے کی طرف بڑھا تو میں نے شیشہ میں سے دیکھا تھا کہ الفتی فرگوسن کے قریب پہنچ چکی ہے اور فرگوسن نے اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی آغوش میں دبوچ لیا ہے

الفتی سہمی ہوئی آواز میں چیخ اٹھی تھی ———— " پیشکار "

فرگوسن نے اسے چھوڑ دیا تھا اور وہ اندر بھاگ گئی تھی اس کے بعد فرگوسن نے وہیں کھڑے کھڑے بغیر کچھ کہے کاغذات پر دستخط کر دئے تھے اور میں کاغذات سمیٹ کر واپس چلا آیا تھا۔

اس دن کے بعد بھی کتنی ہی بار فرگوسن اور الفتی کو ساتھ ساتھ نظر آئے تھے کبھی ایک ساتھ کار میں بیٹھے ہوئے کبھی شام کے اندھیرے میں ایک ساتھ جھولا جھولتے ہوئے سارے شہر میں ان دونوں کے پریم کا ذکر ہونے لگا تھا۔

اسی طرح ایک سال بیت گیا تھا۔

ایک دن اطلاع ملی تھی کہ فرگوسن کا تبادلہ ہو گیا ہے اور وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بنکر دیناج پور جا رہا ہے۔ اس خبر سے سارے شہر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ہم لوگ خوش تھے کہ فرگوسن کی جگہ پر ایک بنگالی آئی سی ایس وجے گنگولی آرہا تھا۔

فرگوسن کو الوداعی پارٹی دینے کے انتظامات بڑے جوش و خروش سے کئے جا رہے تھے۔ شام کو اس نے مجھے بلوا بھیجا۔ جب میں اس کے بنگلہ پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ آرام کرسی میں لیٹا ہوا مغربی موسیقی کا ریکارڈ سن رہا ہے۔ میں کرسی کھینچ کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔ اس نے مسکرا کر پوچھا تھا

" خلیفہ۔ تم تو بہت خوش ہو گے "

" کیوں سر؟ "

" اس لئے کہ میں یہاں سے جا رہا ہوں "

" جی نہیں۔ آپ کا خیال غلط ہے "

" غلط نہیں۔ بالکل صحیح ہے۔ تم خواہ کچھ ہی کہو لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ تم سب مجھ سے نفرت کرتے ہو۔ ورنہ الفتی میرے ساتھ چلنے پر

کیوں تیار نہیں ہوتی۔

" الفتی کہاں جائیگی ؟" میں نے حیرت بھرے لہجہ میں پوچھا تھا۔

" میرے ساتھ "

" شاید وہ آپ کی پرسٹیج کا خیال کرکے نہ جانا چاہتی ہو "

فرگوسن کو غصہ آگیا تھا " ڈیم یور پرسٹیج۔ اصل بات کچھ اور ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ ایک دن میرا نشہ اتر جائے گا اور میں شادی کرکے میم لے آؤنگا۔ تب اس وقت اس کی پوزیشن کیا ہوگی اسی لئے وہ اپنے شوہر کے پاس واپس چلی جانا چاہتی ہے۔

" جانتے ہو کہ کون ہے اس کا شوہر ؟ وہی میرا اردلی۔ برکت۔ ڈیم اٹ "

میرے دل میں آئی کہ پوچھ لوں کہ آخر اس میں برائی کیا ہے لیکن میں خاموش رہا تھا۔ فرگوسن نے جیسے میرے دل کی بات جان لی ہو اس نے خود ہی کہا تھا۔ " لیکن میں یہ گوارا نہیں کرسکتا۔ وہ میرے ساتھ اٹھتی بیٹھتی رہی ہے اس لئے اب میں اسے نیچی سطح پر نہ اترنے دونگا۔ اس کا نیچی سطح پر اترنا میرے اترنے کے برابر ہے۔ برٹش گورنر یہاں سے جاتے وقت اپنے گھوڑے کو گولی کا نشانہ کیوں بنا دیتا ہے۔ جانتے ہو ؟ "

" نہیں سر "

فرگوسن نے اٹھکر ٹہلتے ہوئے کہا تھا " جانے دو۔ یہ بات تمہارے جاننے کی ہے بھی نہیں۔ ہاں تم سے ہوسکے تو ذرا الفتی کو سمجھا دو۔ میں نے اسی لئے تمہیں بلوایا تھا "

اگلے دن خبر ملی کہ فرگوسن سنتری کی گولی کا نشانہ بن گیا اور سنتری الفتی کو لیکر فرار ہوگیا لیکن بھاگ نہ سکا اور گرفتار کرلیا گیا۔ اس نے پولیس کے سامنے اقبال جرم بھی کرلیا ہے۔

سنتری نے پولیس کے سامنے بیان دیا کہ اسی نے فرگوسن کو گولی سے ہلاک کیا ہے مگر اس نے جان بوجھکر ایسا نہیں کیا۔ اس نے بتایا کہ حادثہ کی رات کو دفعتاً اس نے الفتی کی چیخیں سنیں اور جب وہ دوڑتا ہوا اندر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ فرگوسن کے ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق ہے اور الفتی اس کی رینج میں کھڑی ہوئی خوف سے تھر تھر کانپ رہی ہے گھبراہٹ میں خود اس کی بندوق کی لبلبی دب گئی اور گولی فرگوسن کے سر کے پار ہوگئی۔

اور یہ سنتے ہی مجھے معاً فرگوسن کی بات یاد آگئی —— " برٹش گورنر یہاں سے جاتے وقت اپنے پالتو گھوڑے کو گولی کا نشانہ کیوں بنا دیتا ہے۔ جانتے ہو ؟ "

میں نہیں جانتا۔ اس کا جواب فرگوسن ہی دے سکتا ہے لیکن اب تو وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔ پھر بھی اس کی قبر کے قریب سے گذرتے ہوئے آج یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی قبر کے گرد ہوا سے جھومتی ہوئی گھاس سرگوشیوں میں اسی بات کا جواب دے رہی ہے !

کورٹ کوزنبرگ
ترجمہ
علی ناظم

اجنبی شوہر

(جرمن کہانی)

پچھلے پچیس برسوں میں کورٹ کوزنبرگ (Kurt Kusenberg) نے جرمن نثری ادب کو بہت کچھ دیا۔ آج بھی اس کو فکشن کی دنیا میں صفِ اول کا فنکار سمجھا جاتا ہے۔ وہ سنہ ۱۹۰۴ء میں سویڈن کے شہر گوٹ برگ میں پیدا ہوا، لیکن تعلیم و تربیت جرمنی میں حاصل کی۔ جرمنی ہی میں اس نے آرٹ کی تاریخ میں امتیاز حاصل کیا۔ اور ایک عرصہ تک آرٹ کے نقاد کی حیثیت سے لکھتا رہا۔ اس مضمون پر اس کی متعدد کتابیں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ فرانسیسی آرٹ سے اس کو خصوصی لگاؤ ہے چنانچہ جرمنی میں پکاسو اور دیگر ماورائی فنکاروں کو مقبول بنانے میں کوزنبرگ کا بڑا حصہ ہے۔

ادب کی دنیا میں بھی کوزنبرگ کی شخصیت نمایاں ہے۔ اب تک اس کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں "لابوتیلا" (La Botella)، "نیلا خواب" (Der Blaue Traum)۔ "سورج مکھی کے پھول" (Die Sonnenblumen)۔ اور "زندگی کی شراب" (Wein auf Lebenzeit)۔ اپنی ادبی اور فنی حیثیت کی بنیاد پر موجودہ جرمن فکشن میں "قیمتی سرمایہ" کہلاتے ہیں۔

کوزنبرگ کا فن اپنے ہم عصروں سے بالکل جدا گانہ اور کسی قدر نرالا بھی ہے، اس لحاظ سے وہ آج کے لکھنے والوں میں منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ وہ معقولات کی حد بندیوں کو توڑتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ کہیں کہیں تو فہم و ادراک پر تو ہم، بلکہ

مہملات کو ترجیح دیتا ہے۔ فہم و دانش مجرد حیثیت سے اس کے یہاں کوئی معنی نہیں رکھتی وہ اس کو اس کے ازلی سائے کے ساتھ دیکھنا پسند کرتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ خود لکھتا ہے:۔

"عقل اور بے عقلی کی مثال توام بہنوں کے بچوں کی مانند ہے
آدمی کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ اُن کو ساتھ ساتھ کھیلنے دے"

وہ روزمرہ زندگی کے قیود اور اس کی لایعنی پابندیوں سے اُکتا چکا ہے، وہ ان سے متنفر ہی نہیں بلکہ بغاوت پر آمادہ ہے۔ چنانچہ زندگی کے اس میکانی نظریے پر جابجا تضحیک و تمسخر کے تیر برساتا ہے اور کبھی کبھی تو اس ختم نہ ہونے والی جدوجہد سے تنگ آکر وہم و خیال کے پرستان میں جا بستا ہے۔ تخیل کی اس سادگی میں بھی وہ اپنے عجیب و غریب مبالغوں سے قاری کے لئے جابجا دلچسپیاں پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ اس تکنیک میں کہیں کہیں عظیم جرمن فن کار ہوفمین (E.T.A.Hoffmann) کی روایتی کہانیوں کا بھی پرتو نظر آنے لگتا ہے۔

زیرنظر افسانہ اس کے سنہ ۱۹۵۱ء کے مجموعہ "سورج مکھی کے پھول" سے لیا گیا ہے۔ جس کی بیشتر کہانیاں طنزیہ انداز کی ہیں۔ اس اچھوتے پلاٹ میں مصنف انتہائی فن کاری کے ساتھ شہر کی نواحی بستیوں کی زندگی پر لطیف طنز کرتا ہے۔ یہ بستیاں اپنے ڈیزائن اور دیگر لوازمات کے اعتبار سے عموماً ایک جیسی ہوتی ہیں۔ پس بستیوں کی مختلف امور میں یکسانیت اس حسین واہمہ کو جنم دیتی ہے کہ اگر ان یک رنگ بستیوں کے مکینوں کا رہن سہن بھی یکساں ہو جائے تو افراد کا اپنی شناخت کھو دینا کوئی تعجب خیز امر نہیں — یہاں کوزنبرگ کے طرز و اسلوب اور واقعات کی صحت و صداقت نے اس انوکھے اور تخیلی پلاٹ میں جان ڈال دی ہے۔

(مترجم)

دوپہر کو ساڑھے بارہ بجے جب لورآس اپنے گھر کی سیڑھیوں سے اُتر رہا تھا تو وہ نشے میں دُھت تھا، اور سرمد و انبساط کے عالم میں ایک پتے کی مانند ہچکولے کھا رہا تھا۔ گذشتہ شام کو اس نے اپنے دوست کے یہاں جی کھول کر پی تھی، پہلے وسکی، پھر جن، پھر بیئر اور آخر میں سب ملا کر— بلاشبہ یہ مقدار کافی سے بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ جب اس نے گھر کا رُخ کیا، تو سر پیر کا ہوش نہ رہا۔ اب کہاں؟ — مکان تو یقیناً اپنی جگہ پر تھا، لیکن اسے گھر سے نکلے ہوئے بہت زیادہ دیر ہو چکی تھی۔ اس وقت ناشتہ اس کا منتظر تھا، مگر اب یہ ناشتہ رہا تھا یا کھانا؟— اور پھر یہ بھی سوچنے والی بات ہے کہ کھانا اس کا منتظر تھا یا وہ کھانے کا؟ — شاید دونوں ہی ایک دوسرے کے منتظر تھے۔ کھانے اور ناشتے کی اس بے معنی منطق پر لورآس دل ہی دل میں ہنسا اور پھر یہ ہنسی ہزاروں کی باریک باریک دھاروں

کی طرح اس کے چہرے سے بھی پھوٹ نکلی۔ یہ اُس دن کی آخری ہنسی تھی جسے وہ دل کھول کر ہنسا تھا۔

زینے سے ٹیک لگا کر اس نے تھوڑی دیر کے نئے مکان کے باغ پر ایک نظر دوڑائی۔ اس کی بیوی باورچی خانے میں کام کر رہی تھی۔ لیکن بوراس نے اس پر نظر ڈالنا ضروری نہیں سمجھا۔ یوں بھی جو لوگ تڑکے اُٹھ بیٹھتے ہیں وہ دیر سے اُٹھنے والوں کو احمق اور بُرا ہی سمجھتے ہیں۔ باغ بہت دلکش تھا۔ لیکن اُس نے کسی چیز کو دیکھنے کے مقابلے میں خود اپنی نمائش جاری رکھنا پسند کیا۔ باغ سرسبز تھا لیکن اس کی سرسبزی کو کسی آدمی کی ضرورت تھی، کیوں کہ یہی سرسبزی آدمی کو بھی سرسبز رکھتی ہے۔ اور سرسبزی کو دیکھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے سرسبزی کو کھانا۔

بوراس باغ میں داخل ہوگیا۔ اور ٹہلتا ہوا دُور تک چلا گیا۔ لیکن جوں ہی وہ ایک ہری بھری جھاڑی کے قریب سے گزرا، اُس کو اپنا پالتو کتا نظر آیا۔ جو بڑی تندہی کے ساتھ اسی جھاڑی کے قریب گڑھا کھودنے میں مصروف تھا۔ بوراس نے اس کی طرف رُخ کرکے سیٹی بجائی۔ جانور یکایک چونک پڑا۔ پھر غُراتا ہوا دُور چلا گیا۔ بوراس یہ سمجھ رہا تھا کہ کتا اُس کو دیکھتے ہی دُم ہلاتا ہوا اُس کی ٹانگوں سے لپٹ جائے گا۔ لیکن وہ تو بہت غضب ناک آنکھوں سے اپنے مالک کی طرف لپکا، اور اس سے کچھ فاصلے پر رُک کر زور زور سے بھونکنے لگا۔

"شاید یہ مجھ سے ناراض ہے۔" بوراس نے سوچا "یا شاید الکحل کی بدبُو سے چونک رہا ہے جو میرے انگ انگ سے پھوٹ رہی ہے"

"ادھر آؤ!" اُس نے کتے کو حکم دیا، اور محض شغل کے طور پر جھک کر اپنے موزے اُوپر چڑھانے لگا۔

لیکن کتے نے اس کو اپنے لئے مبارز طلبی خیال کیا، اور لپک کر بوراس کی پنڈلی پر آن دھمکا۔ بوراس نے فوراً ہی اُس کو دُور ہٹانے کی کوشش کی جس پر اُس نے مالک کے ہاتھ پر کاٹ کھایا۔

کُتا سخت غصے میں تھا، اور اپنے مالک سے سخت مشتعل ہو رہا تھا، اسی جنونی کیفیت میں وہ پلٹا، اور بھاگتا ہوا گھر میں چلا گیا۔ غالباً وہ اپنی مالکہ کو اس واقعہ کی اطلاع دینا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر میں کتا واپس آگیا۔ اس مرتبہ بوراس اس پر نظریں جمائے رہا اور چاروں طرف گھوم گھوم کر اپنی حفاظت کرنے لگا۔

"یہ باغ میں کیا ہو رہا ہے؟" ایک عورت کی گرجدار آواز سنائی دی۔

بوراس نے مُڑ کر دیکھا، تو اُس کی بیوی کا غضب ناک چہرہ جھانک رہا تھا۔ بوراس اُس کو کچھ دیر تک اسی عالم میں دیکھنا چاہتا تھا، لیکن کتے کے جارحانہ عزائم نے اس کی حسرت کو پُورا نہ ہونے دیا۔ وہ بھونکتے ہوئے لمحہ بہ لمحہ بوراس کے قریب آتا جا رہا تھا اور بوراس کو بہرحال اپنی جان پیاری تھی۔

"مار رہا تھا!" وہ چلایا "کیا تم سب کے سب پاگل ہو گئے ہو؟"

"اگر اس کے بعد میں نے اپنا نام لیتے ہوئے سنا تو پولیس کے حوالے کر دُوں گی"

یہ جملہ عورت نے انتہائی غصے کے عالم میں ادا کیا تھا۔

بوراس کا سر چکرا گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایک ذرا سے نشے کی بدولت اتنی طویل شادی شدہ زندگی سے بیزاری کیونکر ممکن ہو سکتی ہے۔

"چچا کہاں ہیں؟" ایک بچے کی آواز سُنائی دی۔

بوراس کے دل پر ایک چوٹ سی لگی، اُس کو اپنے بچے سے بے حد محبت تھی۔
لیکن اُس کو بھی خوب سکھا پڑھا دیا گیا تھا۔
"نکلو!" بچہ بھی چلایا۔ اور غضب ناک ماں کی پناہ لے کر کھڑا ہو گیا۔
پھر کتا بھی زور سے بھونکا اور اس نے بھی بچے والا طریقہ اختیار کیا۔
اب تینوں آہستہ آہستہ بوراس کی طرف بڑھ رہے تھے۔
بوراس نے چل دینے ہی میں خیریت سمجھی، اور چوروں کی طرح خود اپنے ہی مکان سے کھسک گیا
بوجھل اور بے مقصد قدم اٹھاتا ہوا وہ سڑک پر آ نکلا، پھر موڑ سے دوسری جانب مڑا، اور پھر سیدھا ہو لیا۔ اُس وقت اس کے ہوش ٹھکانے نہ تھے۔

یکایک اُسے خیال آیا کہ شاید اس سے پہلی شام کو بھی وہ نشے ہی کے عالم میں گھر لوٹا تھا، اور ہو سکتا ہے کہ اس عالم میں اُس نے ان لوگوں کے ساتھ کچھ برا برتاؤ کیا ہو ـــــ لیکن شاید ایسا تو نہیں ہوا تھا ـــــ یا ممکن ہے ہوا ہو۔ مجھے اپنے سر پیر کا تو ہوش نہیں رہتا۔ نشے میں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔

"ہاں" بوراس نے پھر سوچنا شروع کیا "کل شاید کیلش مجھے گھر چھوڑنے آیا تھا، غالباً وہ اس بارے میں کچھ زیادہ جانتا ہوگا، میں اُسی سے پوچھوں گا۔"
دوست کا مکان کچھ دُور نہ تھا، پانچ ہی منٹ میں وہ اُس کے مکان پر جا پہونچا۔
کیلش نے دروازہ کھولا اور پھر بڑی کڑی نظروں سے بوراس کو دیکھنے لگا۔
"تمہارا مطلب؟" اُس نے پوچھا۔
"کیلش یہ کیا بدتمیزی ہے؟"
کیلش نے بڑی حقارت سے منہ بنایا۔
"یہی میں بھی اپنے آپ سے پوچھا کرتا ہوں۔"
یہ کہہ کر کیلش نے دروازہ بند کر لیا۔
دوست بھی اُس سے پھر گیا، آخر یہ ہُوا کیا؟
"مجھ پر سارے دروازے کیوں بند ہوتے جا رہے ہیں؟ آج میرا کوئی نہیں۔ شاید سب لوگ مجھ سے ناراض ہیں ـــــ لیکن اب میں جاؤں کہاں؟ ـــــ چلو کارلو کے ہاں چلیں ـــــ وہ اچھا آدمی ہے اور اپنا یار بھی ہے ـــــ مکتب سے اب تک ہمارا اُس کا ساتھ رہا ہے۔"

کارلو تک پہونچنے میں اُس کو مختصر سا سفر طے کرنا پڑتا تھا، لیکن دوست کی ہمراہی کے خیال میں یہ سفر بہت جلد طے ہو جایا کرتا تھا، لیکن آج تو بوراس پر جیسے کاہلی کا دورہ پڑ گیا ہو ـــــ اس کو کارلو کے گھر پہونچنے میں پون گھنٹہ لگ گیا۔ زینے پر پہونچتے پہونچتے وہ بُری طرح ہانپنے لگا۔ اور قدم لڑکھڑا گئے۔
"ستیاناس" بوراس نے سوچا، "آج کا تو سارا دن لڑکھڑاتے ہی گذر گیا۔"

بوراس نے دستک دی۔

قدم قریب آتے سنائی دیئے۔

دروازہ کھلا، اور مکتب کا دوست سامنے آکھڑا ہوا ـــــ

"مجھے کچھ نہیں خریدنا ـــــ نہ کچھ منگانا ہے ـــــ میں کوئی دستخط نہیں کرسکتا میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ خدا حافظ"

دروازہ بند ہوگیا!

زینے سے اُترتے ہوئے اُس نے پھر اپنے آپ کو پرندے کی طرح ہلکا اور ہوا میں تیرتا ہوا محسوس کیا۔ انبساط کی ایک لہر پھر دوڑ گئی، لیکن یہ انبساط پہلے سے کسی قدر مختلف تھا۔

سڑک پر ـــــ جس کا نہ کوئی پتہ ہے اور نہ کوئی حد ـــــ بوراس سوچنے لگا۔ اب کیا کروں؟

اس وقت اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ ماضی کی تمام یادیں ہجوم کئے ہوئے تھیں، اور حال اسے بے خود بنائے دیتا تھا، اس وقت وہ اپنے آپ کو بھی نہیں پہچان رہا تھا۔

"خوب" اُس نے سوچا۔ "بلاشبہ اس وقت میں زندہ ہوں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس سے پہلے میں کبھی زندہ ہی نہیں تھا ـــــ میرے پاس آخر زندہ رہنے کا ثبوت بھی کیا ہے؟ مگر میں تو خود اپنے وجود پر سب سے بڑا ثبوت ہوں ـــــ ایسا نہیں ہوسکتا کہ سب کچھ میرا خیال ہی خیال ہو ـــــ نہیں، ہرگز نہیں، مگر آخر میں سب کچھ کس طرح کھو بیٹھا؟ شاید کسی شدتی حرکت کے باعث؟ ـــــ ٹھیک ہے ایسا ہی ہوا ہوگا۔ شاید میں قدرت کے نظام سے بھٹک نکلا ہوں اور اب اِدھر اُدھر بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ میری کوئی منزل نہیں۔ دُمدار تاروں کی مانند میرا بھی کہیں قیام نہیں ہوسکتا۔ مجھے صرف بھٹکنے سے کام ہے۔"

اس عرصے میں ڈیڑھ بج چکا تھا۔ بوراس جو ذرا دیر پہلے تک اپنے آپ کو دنیا کے کارخانے سے الگ تھلگ سمجھ رہا تھا۔ بھوک کی تکلیف محسوس کرنے لگا۔ اب اُسے کھانے کی فکر دامن گیر تھی، چنانچہ اُس نے سہارے کی تلاش میں کئی چکر کاٹے لیکن کوئی نشان نہ ملا۔ یہ قصبہ تو بس رہنے سہنے کے مطلب کا تھا۔

نڈھال اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں کے ساتھ اُس نے باغوں اور مکانات کے اطراف کئی چکر لگائے۔ ہر گھر پر اس کو اپنے مکان کا شبہ گذرتا تھا، لیکن وہ دوسرا نکلتا تھا۔ آخر ایک مکان کی کھڑکی کھلی اور ایک عورت نے جھانک کر دیکھا۔ پھر اس نے بوراس سے مخاطب ہوکر کچھ کہا۔ بوراس کو اس پر کچھ تعجب نہ ہوا۔

"یہ گھر آنے کا وقت ہے؟ شوربا میز پر رکھے رکھے ٹھنڈا ہوگیا"

بوراس نے بغیر کسی سوچ بچار کے فوراً باغ کا دروازہ کھولا، اور مکان میں داخل ہوگیا۔ اُس کو واقعی بہت سخت بھوک لگ رہی تھی ـــــ

کمرے کے دروازے کے قریب ہی ایک بچہ اچھلتا ہوا نظر آیا ـــــ

"پاپا، آج تو انڈے والے کیک بھی پکے ہیں"

"اچھا۔ اچھا۔" اُس نے بچے کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

پھر اپنے جوتوں سے گرد پونچھی، ہیٹ اور کوٹ اُتار کر کھونٹی سے لٹکا دیئے۔ خاتون خانہ کے رخسار پر رسمی بوسہ دیا اور میز

پھر بیٹھ کر منہ سے شوربا اُڑانے لگا۔

کھانے کے دوران وہ خاتون اور بچے کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا تاکہ ان کو کوئی شبہ نہ گزرنے پائے۔ وہ دونوں اس کو بدستور صاحب خانہ سمجھ رہے تھے۔ عورت بھی بُری نہ تھی، بچہ تو بہت ہی پیارا تھا، کھانا بھی بے حد لذیذ تھا۔

"آہ ــ" بوراس نے سوچا ــ "کنبہ پھر کنبہ ہے۔ کام کی بات تو یہ ہے کہ آدمی کو اپنا کنبہ میسر بھی آتا ہے یا نہیں! میں قسمت کی بات کرتا ہوں۔ یقیناً بھٹکا ہوا ہوں۔ ذرا دیر پہلے تک میرا کیا عالم تھا۔ میں نے ان دونوں کی تلاش بھی نہیں کی تھی لیکن پھر بھی ان کو پا لیا۔ آدمی تلاش ہی کیا کر سکتا ہے! اُس کو وہی ملتا ہے جو اسے ملنا چاہیے ــ نہیں ــ مگر ہاں یہ ادل بدل بھی خوب رہی کم از کم ایک امید تو بندھ جاتی ہے"۔

"کیا دیکھے جا رہے ہو؟" عورت نے سوال کیا "کیا کوئی چیز ٹھیک نہیں پکی ہے؟"

بوراس نے رومال نکال کر منہ پونچھا۔

"نہیں" اُس نے کہا "ہر چیز بہت اچھی ہے"۔

پھر چیلوں کی ٹوکری سے ایک سیب نکال کر چھیلنے لگا۔ ــــ کیا یہ معاملہ یوں ہی طے ہو جائے گا؟ یا شاید میں ہمیشہ ہمیشہ یہیں رہوں گا؟ ــــ اور پھر اپنی دوسری شخصیت کو بھول جاؤں گا؟ ــــ کون کہہ سکتا تھا کہ اس وقت بوراس جاگ رہا ہے یا سو رہا ہے! یا خواب میں ہے؟

دروازے پر دستک ہوئی۔

"تم بیٹھے رہو" عورت بولی۔

اور پھر اُٹھ کر سیدھی دروازے کی طرف چل دی۔

اس کے جانے کے بعد دروازہ کچھ کھلا رہ گیا۔ جس سے باہر کی کارروائی اندر ہی سُنی جا سکتی تھی۔

"کون ــ؟"

"کیا مطلب؟"

عورت کی تیز تیز آوازیں آ رہی تھیں۔

"فوراً نکل جاؤ، ورنہ ابھی اپنے شوہر کو آواز دیتی ہوں ــ"

"تیرا دماغ تو نہیں پھر گیا؟" یہ کوئی مردانی آواز کہہ رہی تھی "بس مذاق ختم کر اب مجھے زور کی بھوک لگ رہی ہے"۔

"یہ کوئی محتاج خانہ ہے؟ ــ فوراً نکل جاؤ، ورنہ اس نوکر کا مزا چکھا دوں گی"۔

جھگڑا خاصا بڑھا، لیکن پھر بھی زیادہ طویل نہیں ہونے پایا ــــ آدمی میدان چھوڑ بھاگا، اور دروازہ پھر بند ہو گیا۔

غصے میں لال پیلی عورت کمرے میں واپس لوٹ آئی۔

"ڈھیٹ پن کی بھی حد ہوتی ہے ــ اور ہاں تم یہاں بدھوؤں کی طرح بیٹھے رہے؟"

"مجھے خود اس بدمعاش پر بہت غصہ آ رہا تھا" بوراس نے کہنا شروع کیا "لیکن شاید بے چارے کو بھوک زیادہ لگ رہی تھی یا پھر واقعی وہ اپنے مکان میں تمیز نہ کر سکا ہوگا۔ مکان اکثر بدل جاتے ہیں"۔

"بدل جاتے ہیں۔ عورت نے غصے میں دُہرایا "اس کم بخت کا کوئی مکان بھی ہے۔ بے گھر، بے در، نہ کنبہ، نہ خاندان، بھکاری —"

بوراس فوراً ہی کھڑا ہو گیا —

"پھر تو میں اُس کی ضرور مدد کروں گا۔ کم از کم دوپہر کا کھانا تو ضرور کھلوا دوں گا — میں ابھی آیا"

وہ گھر سے باہر نکل آیا، اور باغ کے دروازے ہی پر اجنبی کو جالیا۔ بے چارہ مصیبت زدہ جذبات کی شدت سے مغلوب تھا اس کی آنکھیں جھنجھلاہٹ سے پھیل گئی تھیں۔

"میں جانتا ہوں" بوراس نے کہا "اس وقت تم پر کیا گذر رہی ہوگی؟ اور اسی بنا پر میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں"

یہ کہہ کر بوراس نے جیب سے نوٹ بک نکالی اور اُس پر چند لائنیں کھینچ ماریں، پھر پرچے کو نوٹ بک سے پھاڑ لیا۔

"دیکھو میرے دوست، یہ ایک پتہ ہے، بہت اچھا پتہ، بس سیدھے چلے جاؤ — مگر جلدی سے، ورنہ شوربا ٹھنڈا ہو جائے گا —"

اُس آدمی نے پرچہ لے لیا، لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔

وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا، بوراس بہت عجلت میں تھا۔

"تم تو بہت رحم دل ہوتے جا رہے ہو" بوراس کے کمرے میں آتے ہی عورت نے کہا۔

بوراس بیٹھ گیا اور سیب کو دوبارہ چھیلنے لگا۔

"بالکل نہیں۔" اُس نے جواب دیا "میں نے تو صرف احتیاط برتی ہے۔ جو اُس کے ساتھ آج ہوا ہے کل میرے ساتھ بھی ہو سکتا ہے"

دوسرے دن بوراس گھومتا گھامتا اپنی گلی میں جا نکلا۔ جوں ہی وہ اپنے مکان کے قریب سے گذرا، اُس نے دیکھا کہ اُس کی بیوی اور وہ اجنبی آدمی دونوں باغ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ عورت سوئٹر بننے میں مصروف تھی اور مرد اخبار پڑھ رہا تھا۔ دونوں مطمئن تھے اور شاید بوراس بھی مطمئن تھا —

سجاد نظر

رادھا رانی

ایک ناولٹ

رادھا رانی

"آؤ تمہیں ایک کہانی سناؤں!

پتہ نہیں اس کہانی کا جنم کیوں ہوا۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ یہ ایک لوری سے شروع ہوئی اور ایک مرثیے پر آ کر ختم ہو گئی۔ جو آج نہیں ہے اور جو کبھی نہیں ہو گی۔ آسمان کی اس بے کنار نیلاہٹ کے پیچھے میں اس کا اکیلا گواہ ہوں۔

آؤ تمہیں وہ کہانی سناؤں!

مگر ٹھہرو — پہلے یہ خط پڑھ لو!

"میری موت میری اپنی موت ہے۔ اس کا کوئی بھی ذمہ دار نہیں۔ اور اگر کوئی ہے تو یہ دنیا، اور دنیا کو تم پھانسی پر نہیں چڑھا سکتے۔"

"یہ میرے چھوٹے بھائی کا خط ہے جو جو بیس برس تک ایک گونگی فریاد بن کر جیتا رہا۔ اور ایک دن بھی شکایت کی طرح مر گیا۔ وہ بہت خوب صورت تھا، اور اُسے رادھا رانی سے پیار تھا۔ مگر رادھا رانی کو اس سے نفرت تھی۔ رادھا رانی کو سب سے نفرت تھی، اور زندگی میں اس کے لئے سوائے ضرورت کے کچھ نہ لائی تھی۔ مگر میرا بھائی یہ ماننے کو تیار نہ تھا۔ وہ کہتا تھا رادھا رانی پنجاب کے کسی گاؤں کی ہے اور پنجاب کے گاؤں میں صرف نفرت اور ضرورت نہیں اُگتی۔ جہاں کے لوک گیتوں میں اتنا پھیل کر چھا جانے والا درد ہو وہاں بن محبت کئے کون جی سکتا ہے؟

اور پھر رادھا رانی کی آواز — بج بج کر دھڑکنوں پر سو جانے والی

اور اس کی وہ چال — جیسے پانچوں دریاؤں کی رفتار — وہ صرف نفرت کیسے کر سکتی تھی — مگر وہ زندگی بھر نفرت کرتی رہی اور میرا بھائی اُسے زندگی بھر چاہتا رہا۔

یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا تھا؟

آج رادھا نہیں ہے۔ اور آج میرا بھائی بھی نہیں ہے مگر وہ کہانی جو پنجاب کے ایک گاؤں سے نکلی اور سارا ہندوستان گھوم کر اس تنگ گلی میں آ کر ختم ہو گئی، وہ کہانی آج بھی زندہ ہے۔

آؤ تمہیں وہ کہانی سناؤں —!

مگر ٹھہرو —

اس تصویر کو ایک نظر دیکھ لو ــــ یہ پرمیشر سنگھ کی تصویر ہے۔ یہ مجھ سے صرف ایک بار ملا لیکن آج تک میری زندگی کے کھنڈر میں بازگشت بن کر گونج رہا ہے۔ میں اب بھی اسے یاد کرتا ہوں تو میری گردن جھک جاتی ہے۔ میں پرمیشر سنگھ کا خدا تو نہیں ہوں لیکن پھر بھی میں نے اُس سے اُس کی تقدیر چھین لی ہے۔ وہ شاید آج بھی کسی تنگ سی گلی میں یا کسی آشرم میں یا کسی چکلے میں رادھا رانی کو ڈھونڈھ رہا ہوگا، اور رادھا رانی آج سبھوں سے دور ایک کالی بن کر گونج رہی ہے۔

پرمیشر سنگھ ادھیڑ عمر کا ایک نہایت بدصورت آدمی تھا۔ جس وقت وہ مجھ سے ملا وہ کئی دنوں کا بھوکا تھا۔ اُس کی گدلی گدلی آنکھوں میں گرد جم گئی تھی اور وہ انہیں بمشکل کھولے آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا ــــ وہ زندگی کا ایک بہت معمولی ٹکڑا تھا، اور میرے سامنے آکر فقیر کی ہتیلی کی طرح پھیل گیا تھا۔

"تم رادھا رانی کو کب سے جانتے ہو؟" میں نے پوچھا تھا

"جی ــ؟" اُس نے بڑی بے کسی سے اپنی گردن اٹھائی ــ "جی بیس سال سے"

"بیس سال ــ؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"جی ــ" وہ پہلی اور آخری بار مسکرایا۔

میں نے پرمیشر سنگھ کو پھر ایک بار غور سے دیکھا۔ اُس کے جسم کی میلی قمیص مسلسل استعمال سے جگہ جگہ سے مسک گئی تھی اور اُس کی پچکی ہوئی ایک کالر ٹوٹے پنکھے کی طرح اندر کو مڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے ننگے سر پر کچے پکے بالوں کا ایک چھوٹا سا جوڑا بنا رکھا تھا جسے وہ بار بار اپنے ہاتھوں سے ٹھیک کرتا تھا۔

"مگر تمہیں کیسے پتہ چلا کہ رادھا رانی یہاں رہتی ہے ــ؟" میں نے بہت دیر بعد پوچھا۔

"جی ــ اُس نے مجھے خط لکھا تھا ــ" اس نے اپنی گندی جیب سے مڑا ہوا کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال کر سامنے رکھ دیا۔ میں نے اُسے اُٹھا کر پڑھا ــ لکھا تھا:

"پرمیشو ــ! میں یہاں کلکتے میں ہوں اور رنڈی بن گئی ہوں۔ مگر پھر بھی میں نے اپنے جسم کی بہت سی لذت تیرے لئے بچا رکھی ہے۔ مجھے آکر لے جا۔ تو مجھ سے مرد بن کر نہ سہی ایک عیاش بن کر تو محبت کر ــ"

میں نے حیرت سے پرمیشر سنگھ کی طرف دیکھا۔

"رادھا رانی سے تمہارا کیا سمبندھ ہے؟"

"جی ــ؟" اُس نے اپنی گدلی گدلی آنکھوں کو یکبارگی پوری طرح کھول کر میری طرف دیکھا اور پھر انہیں بند کرتا ہوا مدھم لہجے میں بولا ــ "وہ میری گود لی ہوئی بیٹی ہے ــ"

"کیا ــ؟" میں چیخ نہ سکا ــ پرمیشر سنگھ نے اپنی گردن جھکا لی اور بولا ــ

"اس کا خط ملنے سے پہلے میں نے اسے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا ــ ہزاروں آشرموں، چکلوں اور مسافر خانوں میں گھوم آیا ہوں ــ میرے سارے روپے ختم ہوگئے۔ میری زمین بک گئی، میرا گاؤں چھوٹ گیا، اور اب سوائے رادھا رانی کے میرا کوئی نہیں ہے۔ میں اسے لے جاؤں گا　　میں اسے لے جاؤں گا ــ" پرمیشر سنگھ کی آواز بھرا گئی۔

میں نے دیکھا اُس کی گدلی گدلی آنکھوں کے کونوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ اسی طرح گردن جھکائے آنکھیں نیچی کئے دھیرے دھیرے

ہانپ رہا تھا۔ میں ایک لمحہ کے لئے سمجھ نہ پایا کہ میں پرمیشر سنگھ سے محبت کروں یا اس کے منہ پر تھپڑ مار دوں۔

"میں دو دن سے بھوکا ہوں ـــ" اس نے اپنا سر اٹھایا اور آنسو اس کے گالوں پر بہہ آئے ـــ میں دو دن سے بھوکا ہوں ـــ مجھے کچھ کھلاؤ ـــ"

"پرمیشر ـــ" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ـــ "تم نے یہ خط پڑھا ہے ـــ؟"

"ہاں ـــ" پرمیشر نے بڑے سیدھے بڑے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"اور پھر بھی رادھا رانی تمہاری گود میں ہوئی بیٹھی ہے ـــ؟"

"ہاں ـــ"

"اور تم اسے لینے آئے ہو ـــ؟"

"ہاں ـــ"

"کہاں لے جاؤ گے اُسے ـــ؟"

"واپس اپنے گاؤں ـــ"

"پھر ـــ؟"

"پھر ـــ" پرمیشر سنگھ نے یکایک اپنی آنکھیں بند کر لیں ـــ "پھر میں اُس سے شادی کر لوں گا۔"

"پرمیشر ـــ" اس کے کاندھے پر رکھا ہوا میرا ہاتھ ایک لمحے کے لئے کانپا اور میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم پاگل تو نہیں ہو؟"

"نہیں ـــ" پرمیشر سنگھ پھوٹ کر رو پڑا ـــ "میں پاگل نہیں ہوں۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں اور بھوکا ہوں اور مسلسل تین راتوں سے جاگ رہا ہوں ـــ پاگل تو رادھا رانی ہے ـــ مگر پھر بھی میں رادھا رانی کو بھول نہیں سکتا ـــ میں سوائے اُسے پیار کرنے کے کچھ بھی نہیں کر سکتا ـــ میں نے اُسے بچپن سے پالا ہے ـــ میں اُس کے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں ـــ اس سے شادی تک کر سکتا ہوں ـــ" وہ زور زور سے ہانپنے لگا۔

میں نے اُس کے بوڑھے ہوتے ہوئے چہرے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا ـــ کیا یہ پرمیشر سنگھ کی اپنی بدصورتی تھی یا وہ اسے کہیں سے مانگ لایا تھا! یہ کس گاؤں، کس گلی اور کس گھر کی آرزو تھی جو ہزاروں میل کی مسافت کا بوجھ اپنے سینے پر اُٹھائے کراہ رہی تھی ـــ یہ کیسی حسرت تھی جو بھوک کا زہر چوس چوس کر بھی زندہ تھی ـــ؟ مجھے پرمیشر سنگھ کی ٹمٹماتی ہوئی امید اس عیاش کی طرح نظر آئی جو اپنی ننگی داشتہ کو لپٹائے بے خبر سو رہا ہو۔ اور جس کی بجوری دوسرے کمرے میں لُٹ رہی ہو۔

"پرمیشر سنگھ ـــ" میں نے اسے آہستہ سے پکارا۔

پرمیشر سنگھ نے اپنی گردن کو اس طرح اٹھایا جیسے وہ کوئی جرح کر رہا ہو۔

مجھے محسوس ہوا کہ اگر مرنا اس کے بس میں ہوتا تو وہ مر جاتا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے ـــ" میں نے پھر کہا۔

پرمیشر سنگھ نے کچھ جواب نہیں دیا۔ بہت دیر تک یونہی چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر بولا ـــ

محبت پرانی کہانی ہے اور بہت بدصورت کہانی ہے۔ اب میں اسے یاد کرتا ہوں تو لگتا ہے کہ میری کہانی کہانی نہیں ایک تنگ سی کوٹھری ہے جس کی دیواروں کا پلاستر جگہ جگہ سے اکھڑ گیا ہے جس میں اندھیرا ہے میں اندر میں قید ہوں اور رادھا رانی باہر سے دروازہ بند کر کے بھاگ گئی ہے ——
آج سے پچیس برس پہلے ......
مگر ٹھہرو ——!
پرمیشر سنگھ کی کہانی سے پہلے اخبار کے اس صفحے پر نظر ڈال لو —— یہ پرمیشر سنگھ کی گرفتاری کا اشتہار ہے! اور اس کی یہ تصویر بیس سال پرانی ہے۔ جب وہ جوان تھا اور اندر پھرتا تھا —— آج پتہ نہیں وہ کہاں ہے، کس بھیڑ میں کھو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ رادھا رانی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے کسی گلی یا کسی فٹ پاتھ پر مر گیا ہو، یا پھر پولیس نے اس کا پتہ لگا لیا ہو۔ اور وہ کسی شہر میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا ہو۔ مجھے کچھ بھی پتہ نہیں —— لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اس سے بہت پہلے جب ایک اندھیری رات کو رادھا رانی اس کے کمرے میں گھس کر ننگی ہو گئی تھی تو وہ اپنی ہی بیچوں میں ڈوب کر رہ گیا تھا۔ اور اسے اس کی اپنی ہی فریاد نگل گئی تھی —— وہ مجھ سے اس دن کے بعد پھر کبھی نہیں ملا لیکن پھر بھی وہ ہر لمحے میں اور ہر سوچ میں اور ہر پچھتاوے میں یاد آیا ہے اور جب بھی یاد آیا ہے میں نے اُس سے معافی مانگی ہے۔
آؤ تمہیں اُس کہانی سے پہلے پرمیشر سنگھ کے اس معصوم جرم کی کہانی سناؤں!

مگر ٹھہرو!
مجھے پہلے ایک بار اس قبر کو سجدہ کر لینے دو، ایک بار اسے پرنام کر لینے دو، اور کہہ لینے دو کہ میری ہر سانس اُس کی قرضدار ہے اور میری ہر دھڑکن اسے سلام کہتی ہے —— آج میرا یہاں سب کچھ نہیں ہے۔ میں دفن ہوں اور رادھا رانی دفن ہے اور پرمیشر سنگھ دفن ہے اور ان سب پر کئی بھیانک کہانیوں کا منوں بوجھ ہے —— آج دور دور تک میرا کوئی نہیں ہے، اور میں اپنے ہی سپنوں کے مندر میں بیٹھا زندگی کا لوٹا ہوا اکتارہ بجا رہا ہوں ——

یہ میرے چھوٹے بھائی کی قبر ہے!
آؤ تمہیں یہ قبر کھود کر دکھاؤں ——!
وہ ایک بیمار رات تھی جو میرے گھر کے آنگن میں بیچوں بیچ کھڑی گردن جھکائے بھیگ رہی تھی، اور گدلا اندھا آسمان بوڑھے جوتشی کی طرح میرے بھائی کی موت کی پیشین گوئی کر رہا تھا۔ مجھے یاد ہے میں اس رات بہت گہری نیند سو رہا تھا۔ لیکن پچھلے پہر جب میری آنکھیں کھلیں تو میں نے سُنا کوئی دروازے پر زور زور سے دستک دے رہا ہے۔
"کون ——؟" میری آواز بھرا گئی۔
"بھیا ——" یہ میرے چھوٹے بھائی کی ہنستی ہوئی آواز تھی۔
میری نیند جیسے میری آنکھوں سے پھسل کر گر گئی۔ میں نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا، رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ اپنے کمرے سے نکل کر تیز قدموں سے سیڑھیاں اُتر کر جب میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا وہ رادھا رانی کے ساتھ کھڑا بھیگ رہا تھا۔
رادھا رانی جو اپنی نہ جانے کتنی کہانیوں کے میلوں کی بھیڑ میں دھکے کھاتی ہوئی، اپنا سب کچھ کھوتی ہوئی میرے بھائی کی انگلی پکڑ کر میرے دروازے تک آگئی تھی۔
میں ایک لمحے کے لئے سوچتا رہ گیا اور ایک پل کے لئے میں نے رادھا رانی کو دیکھا اور وہ پل مڑ کر ایک کانٹا بن کر میرے دل کے ہونٹوں

میں چھپ گیا جیسے کھنچ کر ایک دن ایک سال ایک صدی بن گیا، اور زندگی اپنی ساری آرزوؤں کا غازہ مل کر ایسی شہزادی بن گئی جسے سونے کے کمرے اور ریشمی لحافوں میں بھی نیند نہ آئی ہو —

میں نے اس اکیلے بے سہارا لمحے کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا اور اسے سینے سے لگا لیا — بتا دے کہ اب تک میں کیسے جی لیا — کس آرزو کو پانے کی حسرت میں اب تک زندگی سے نباہ کرتا چلا آ رہا ہوں۔ دل کا لہو نچوڑ نچوڑ کر یہ کون سا آنچل رنگا ہے میں نے — بتا دے — بتا دے میرے اکیلے پل، یا واپس آ جا میری آنکھوں میں۔

"رادھا رانی —" میرے بھائی نے اس کا نام بتایا۔

رادھا رانی — میں نے سوچا، اور وہ ساری رات جیسے ایک کراہ بن کر میرے سینے پر دم توڑنے لگی — میں کہاں سے لاؤں؟ کہاں سے لاؤں اپنے وہ پینتیس برس جو میں نے زندگی کی سڑک پر بیٹھے بیٹھے ہانپ ہانپ کر گزار دیئے — کیسے آواز دوں انہیں — وہ مطلبی دن اور وہ بے وقار راتیں — کیسے پکاروں انہیں؟؟

اور وہ اکیلا پل بہتا رہا، برسات بن کر برستا رہا۔ اُسے کسی نے نہیں روکا اور کسی نے اُسے گالی نہیں دی — وہ میرے دل سے رادھا رانی کے چہرے تک ایک پُل بن کر کھڑا ہو گیا اور جانے کتنے سائے کفن پہن پہن کر اُس پر سے گزرنے لگے۔

"رادھا رانی —"

"رادھا رانی —"

میرا بھائی کہتا رہا اپنے بارے میں اور رادھا رانی کے بارے میں — لیکن میں کچھ نہ سُن سکا۔ اگر کچھ سُن سکا تو اتنا کہ اب رادھا رانی یہیں رہے گی — یہیں رہے گی — میں اپنے بھائی سے کچھ نہ کہہ سکا۔ اتنا بھی نہ پوچھ سکا کہ وہ اسے کہاں سے اٹھا لایا ہے؟ — کون ہوتی ہے وہ اس کی؟ — کیوں رہے گی وہ یہاں؟ — کچھ بھی نہیں۔ اور کچھ اس لئے نہ پوچھ سکا کہ مجھے رادھا رانی کا رہنا پسند تھا۔ میرا دل شدت سے دھڑکتا رہا، اور جب دل دھڑکتا ہے تو ہونٹ کہاں کھلتے ہیں؟

صدر دروازہ بند کر کے بھیگتے ہوئے جب تینوں اوپر آئے تو میں نے رادھا رانی کو غور سے دیکھا اور جو چیز سب سے پہلے مجھے نظر آئی وہ اس کے جسم کا رنگ تھا۔ اتنا صاف اور نکھرا ہوا جیسے چٹکی ہوئی چاندنی کو سفید ململ سے ڈھانپ دیا گیا ہو۔ رادھا رانی قد کی لانبی تھی۔ اور میرے بھائی سے دو ایک انچ چھوٹی ہوگی۔ چہرہ اُس کا بہت معمولی تھا۔ لیکن جب ہنستی تھی تو لگتا تھا جیسے اُس کے چہرے سے کوئی خول پھسل کر گر گیا ہو، اور وہ ایک لمحے کے لئے اتنی حسین ہو جاتی کہ جی چاہتا اُس کے سارے آنسو چھپا کر اپنی زندگی کا حصہ بنا لوں — میں اب بھی جب کبھی تنہائی میں رادھا رانی کی ہنسی کے بارے میں سوچتا ہوں تو بچپن میں ماں کی سُنائی ہوئی وہ کہانی بالکل سچ معلوم ہوتی ہے جس میں ایک شہزادی جب ہنستی تھی تو چاروں طرف چاند طلوع ہو جاتا تھا — گو رادھا رانی کی ہنسی کہانی کی ہنسی تھی لیکن اب وہی ہنسی میری کہانی بن چکی ہے۔ اور اپنی کہانی کو کون بھولتا ہے؟ نہ تم نہ ہم —

آؤ تمہیں وہ کہانی سُناؤں!

میں اسے دیکھتا رہا۔ اُس کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک بکس تھا جس پر پنجابی میں بہت بدصورتی سے پرمیشر سنگھ لکھا ہوا تھا۔ اُس نے سفید رنگ کی بالکل نئی ساری پہن رکھی تھی، اور بھیگ جانے کی وجہ سے اس کے جسم سے اس طرح چپک گئی تھی جیسے بتا دینا چاہتی ہو کہ رادھا رانی ایک ایسا گناہ ہے جس کی سزا اب تک آسمانی کتابوں میں نہیں لکھی گئی — آؤ یہ گناہ کر ڈالو — ابھی خدا مجبور ہے —

رادھا رانی ایک ٹک مجھے دیکھ رہی تھی، اور اس کی وہ صاف بولتی ہوئی نظر قطرہ قطرہ میرے سوئے ہوئے خوابوں کی پلکوں پر ٹپک ٹپک کر گر رہی تھی ـــــ اٹھو! میرے بے عمر سپنو! دیکھو دل کی صبح ہو گئی ہے۔ دیکھو نظر کا سورج چمکا ہے ـــــ دیکھو رادھا رانی آ گئی ہے۔ اُٹھو!

"رادھا رانی ـــــ"

اور زندگی میں مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ خاموشی جب بولتی ہے تو کان بہرے ہو جاتے ہیں۔

میرا بھائی بولتا رہا، اور اس بار بھی میں کچھ نہ سمجھ سکا سوائے اس کے کہ رادھا رانی اب یہیں رہے گی اور اس سے زیادہ سمجھنے کی ضرورت بھی کیا تھی ـــــ وہ محبت ہی کیا جو بہری نہ ہو۔

رادھا رانی کے لئے میرے بھائی نے بیچ کا کمرہ کھول دیا تھا۔ یہ میری ماں کا کمرہ تھا جسے اُس کی موت کے بعد اب تک نہیں کھولا گیا تھا۔ ہم دونوں بھائیوں کے کمروں کے درمیان کا یہ کمرہ ماں کو بہت زیادہ پسند تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ ہم دونوں کی اچھی طرح رکھوالی کر سکتی تھی۔ کیوں کہ اکثر چاندنی راتوں میں اُٹھ کر گھومنے نکل جاتا تھا، اور پچھلے پہر یا کبھی کبھی صبح کو واپس آتا تھا، اور اس طرف میرا بھائی آدھی رات تک میز پر طبلہ بجا کر گانے کا عادی تھا جس سے ماں کو سخت چڑ تھی ـــــ

وہ جب تک جیتی رہی نہ میں نے گھومنا چھوڑا اور نہ میرے بھائی نے طبلہ بازی۔

لیکن اس کی موت کے بعد یکایک جیسے چاندنی جل گئی، اور میرے بھائی کے کانوں میں تیزاب گھل گیا۔ اب نہ میں آدھی رات کو گھومتا ہوں اور نہ میرا بھائی طبلہ بجاتا ہے ـــــ اب جب چاندنی آتی ہے تو اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر یا برآمدے میں کھڑے ہو کر خوش ہو لیتا ہوں اور میرا بھائی ہلکے ہلکے سوچتا ہے ـــــ ماں نہ رہی تو جیسے کچھ نہ رہا ـــــ وہ خوشی جو ماں کو دھوکا دینے میں ہے اب اسے ڈھونڈتا ہوں تو چاندنی جیسے گونگی ہو کر سسکنے لگی ہے اور میرے بھائی کے گیت جیسے بے بسی سے ہکلانے لگتے ہیں۔

آج اتنے دنوں بعد جب وہ کمرہ پھر کھلا تو دروازے کے دونوں پٹ جیسے میری ماں کے مردہ بازو بن کر میرے سینے پر آ گرے۔ میں گھبرا کر اپنے کمرے میں واپس چلا آیا۔ اور آنے سے پہلے میں نے ایک نظر رادھا رانی کو دیکھا، اور وہ نظر جیسے ایک پکار بن کر مجھے موت سے زندگی میں لے آئی، اور گو رات اندھیری تھی پھر بھی میں نے محسوس کیا کہ چاندنی میرے دل میں اٹکی ہوئی ہے اور میری سانس میں اٹکی ہوئی ہے اور جیسے رادھا رانی سے میری برسوں کی لمبی جان پہچان ہے۔

ہائے وہ نظر جو وقت کو دھکیل کر پیچھے لے جاتی ہے ـــــ

جب میں اپنے کمرے میں واپس آیا تو سینے میں جیسے صدیوں کی ملاقاتیں مہکنے لگیں۔ میں نے اپنے کمرے کو غور سے دیکھا۔ ایک چارپائی تھی میری بے چین کروٹوں کی اکیلی گواہ، اور ایک میز تھی میرے بے رنگ افسانوں کا پالنا، اور ایک آئینہ تھا میری عمر کا چور ـــــ میں آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس میں میرے بیس سال جذب تھے۔ وقت کے ریگستان میں بیس آنسو۔ میں جب کبھی اُس آئینے کو دیکھتا تھا، تو وہ بیس سال جیسے بیس ہزار نگاہیں بن جاتی تھیں اور پوچھتی تھیں مجھ سے ـــــ

"کیا ـــــ؟"

"کیا ـــــ؟؟"

اور میں گردن جھکا کر آنکھیں بند کر کے ان بیس سالوں کے گھنے جنگلوں میں کھو جاتا تھا۔ اور وہ آئینہ ایک ریکارڈ بن کر بجنے لگتا تھا ـــــ

"رادھارانی —!"

"رادھارانی — !!"

اور آج رادھارانی میرے بغل والے کمرے میں ایک سچا وعدہ بن کر آگئی تھی، مگر بیچ کی یہ دیوار میرے بھائی کی پہلی امید کا نگہبان بنی کھڑی تھی اور میں اسے پھلانگ نہیں سکتا تھا۔ اسی لئے میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اور آئینے سے پوچھا۔

"کیا —؟"

"کیا — ؟؟"

اور آئینے نے مسکراکر اس لمحے کو جذب کرلیا اور ایک ایسی ہتیلی بن گیا جس کی لکیروں پر میں صرف ایک لفظ پڑھ سکتا تھا —

"خون —!"

جب رات نے آخری ہچکی لی تو میرا بھائی میرے کمرے میں آیا۔ رادھارانی ساتھ والے کمرے میں گہری نیند سو رہی تھی، اور وہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔

"میں رادھارانی سے شادی کروں گا —"

"شادی —؟" جیسے آئینہ چھناک سے ٹوٹ گیا اور اس کی کرچیاں میری آنکھوں میں چُبھ گئیں۔

"کون ہے وہ —؟" میں نے پہلی بار پوچھا۔

"وہ — وہ میرے آفس کی ٹائپسٹ ہے۔ میں اُسے دو سال سے جانتا ہوں —"

"اچھا —" میں مسکرایا۔

"اس کا کوئی نہیں ہے اس دنیا میں۔ ماں باپ سب مر چکے ہیں۔ اسی لئے میں اُسے یہاں اُٹھا لایا ہوں۔ اُس نے اپنا مکان چھوڑ دیا ہے اور کل اس کا سامان بھی آجائے گا — تمہیں بُرا تو نہیں لگا بھیا؟"

"نہیں —" میرا دل میرے ہونٹوں تک آکر بولا۔

"وہ بہت اچھی ہے — تم اس سے مل کر دیکھنا — کیسی ہنس مکھ اور پیاری ہے —" آخری لفظ پر میرے بھائی نے نگاہیں جھکالیں، اور یکایک اُٹھ کھڑا ہوا۔

"تم جا رہے ہو —؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں —" اُس نے جلدی سے کہا اور بھاگ گیا۔

میں نے آہستہ سے اُٹھ کر دروازہ بند کیا، اور چارپائی پہ آکر لیٹ گیا۔ نیند کی جھیل سوکھتی جا رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ آئینہ اب بھی ریکارڈ کی طرح بج رہا تھا —

"رادھارانی —!"

"رادھارانی — !!"

دوسری صبح جب میری آنکھیں کھلیں تو میرا بھائی اپنے کمرے میں نہیں تھا اور رادھارانی میری ماں کے کمرے میں سنگھار میز کے قریب بھیگے بالوں کو تولئے سے لپیٹ رہی تھی۔ اور وہاں جہاں میری ماں کی تصویر تھی وہاں ایک اور تصویر رکھی ہوئی تھی۔ پرمیشر سنگھ کی تصویر —

رادھا رانی نے نظر بھر کر میری طرف دیکھا اور میں گھبرا کر واپس اپنے کمرے میں چلا آیا ـــــ جانے کتنی دیر بیٹھا سوچتا رہا اور اس وقت چونکا، جب رادھا رانی چائے کی پیالی لئے اندر داخل ہوئی ۔ صبح صبح نہا کر اس کے جسم کا رنگ دمک اٹھا تھا، اور اس کی آنکھوں میں بسنے والی ایک ایسی مہربان چمک تھی جو اس وقت آتی ہے جب عورت کو اپنی شکست کا خوف ستانے لگتا ہے ۔

وہ ہلکے سے مسکرائی اور وہ مسکراہٹ جیسے ایک خنجر بن کر میرے سارے فیصلوں کا گلا گھونٹ گئی ـــــ ہائے وہ مسکراہٹ ـــــ وہ مجھ سے کیا کچھ نہیں کرا سکتی تھی کتنے ناکو ہاں میں بدل سکتی تھی ۔ کتنی بے وفائی اور کتنی جنگ کرا سکتی تھی ـــــ چائے کی پیالی اس نے میز پر رکھ دی اور مسکراتی ہوئی واپس چلی گئی ۔ اور میرا دل جیسے مخمل کا ایک ٹکڑا بن کر اس کی مسکراہٹ کے گرد لپٹ گیا ۔

"رادھا رانی ـــــ"

رادھا رانی چلی گئی تھی ۔ اور میرے گذرے ہوئے بیس سال جیسے بیں ہزار شعلے بن کر بولنے لگے تھے ـــــ ریتا، کملا، سمی، نگہت، ان بیس برسوں میں میری بیس لاکھ محبتیں دفن تھیں، اور ہر محبت میں رادھا رانی کا ایک انتظار دفن تھا، جیسے ہر بیج میں انتظار ہوتا ہے چند پھولوں کا جو کھل کر جھک جائیں گے اور چند بے قرار انگلیوں کا جو انہیں توڑ لیں گی ـــــ مگر وہ انتظار جس کا کسی وعدے سے رشتہ نہ ہو کب ختم ہوا ہے؟

اور اب اگر رادھا رانی چلی گئی تھی تو اس میں تعجب کیا تھا؟

اس روز میں دن بھر گھر سے باہر رہا، اور رات گئے جب واپس آیا تو مجھے دروازے پر اپنے بھائی اور رادھا رانی کی ہنسی سنائی دی ۔ کتنے دنوں بعد کوئی اس گھر میں ہنسا تھا، مگر یہ ہنسی مجھے کیوں اچھی نہیں لگی ـــــ کیوں کوئی میرے سینے میں کروٹ بدل کر جاگ پڑا تھا، اور کہہ رہا تھا ـــــ

"مت رو ـــــ"

میں نے چور کی طرح دھیرے دھیرے اپنے لوہے کے قدموں سے سیڑھیاں پار کیں اور چپ چاپ اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا ۔ مجھے کسی نے نہیں دیکھا تھا ۔ بغل کے کمرے میں وہ دونوں اب بھی ہنس رہے تھے ۔ اور ہنستے ہنستے چند منٹوں کے لئے بالکل چپ ہو جاتے تھے ۔ میں نے اپنے کمرے کی بتی نہیں جلائی ۔ بس تکیے میں منہ چھپائے جانے کتنے سوالوں کے بوجھتلے سانس لیتا رہا ـــــ یکایک ان کی ہنسی رک گئی ۔ بہت دیر تک رکی رہی، اور پھر میں نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی، اور پھر یکایک بتی بجھ گئی ۔ پھر کچھ بھی نہیں ہوا ۔ رادھا رانی کی ایک چھوٹی سی ہنسی کی آواز آئی اور خاموشی پھیلتی چلی گئی ـــــ

سناٹا پگھلے ہوئے گرم کولتار کی طرح میرے جسم پر گرنے لگا، اور تاریکی جیلی کی طرح میری آنکھوں اور میرے ہونٹوں سے چپک گئی ـــــ میں نہ ہل سکتا تھا نہ سانس لے سکتا تھا ـــــ ایک لمحہ، دو لمحہ، تین لمحہ ـــــ اور پھر میں نے محسوس کیا کہ میں رو رہا ہوں، اور میرے سینے کے اندر کہیں بہت دور کوئی آواز تسلی بن کر ابھر رہی ہے ۔ میں نے پہچانا اس آواز سے میرا بہت گہرا، بہت پرانا رشتہ تھا، اس وقت سے جب آدم نے پہلی غلطی کی تھی، اور اس وقت سے جب کسی نے کسی کو پہلی بار چاہا تھا ـــــ میں نے بے بس ہو کر اس آواز کے پھاہے پر اپنا زخم رکھ دیا اور پھر جو میں نے آنکھیں کھولیں تو صبح ہو چکی تھی ـــــ

وہ میری زندگی کی پہلی صبح تھی جو اپنے ساتھ سورج نہیں لائی تھی، اور ہر کرن سے منہ موڑ کر اندھیرے کی پتلی چادر بن کر میری دنیا پر چھا گئی تھی ـــــ میں نے آنکھیں کھول کر کروٹ بدلی ـــــ میرا بھائی غسل خانے میں گنگنا رہا تھا اور رادھا رانی پتہ نہیں کہاں تھی ـــــ مجھے لگا جیسے میں برسوں کا بیمار ہوں اور گذری ہوئی رات ایک گندی گالی بن کر میرے دل میں اٹکی ہوئی ہے ـــــ میں بہت دیر تک اپنے بستر پر پڑا

رہا، اور بہت دیر تک میرے کمرے میں کوئی نہیں آیا ــ

پھر وہ صبح گذر گئی، اور اُس وقت جب دیواریں دھوپ کے بوجھ سے ہانپنے لگیں تو میں باہر نکل گیا، اور پھر میں کس وقت واپس آیا، مجھے پتہ نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ میں صدر دروازے پہ تاریکی کے دلدل میں گردن تک دھنسا کھڑا تھا اور دیکھ رہا تھا رادھا رانی کے تاریک کمرے کی طرف ــ شاید بہت رات بیت گئی تھی۔ اور ہر طرف اتنا گہرا سناٹا تھا کہ ہر سوچ بولتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے میں۔ آہستہ سے قدم بڑھایا اور بغیر کسی آواز یا آہٹ کے اپنے کمرے میں چلا گیا ــ

کل کی طرح میں نے آج بھی بتی نہیں جلائی۔ بس چُپ چاپ آئینے کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اور آئینے نے پوچھا ــ

"کیا ؟"

"کیا ــ ؟؟"

میں نے سر جھکا لیا، اور مجھے یاد آئی ایک لمبی دوپہر اور ایک ٹھکی ہوئی شام، اور میں نے اپنے دل کے اکیلے آسرے سے پوچھا ــ

"کیا ــ ؟"

"کیا ــ ؟؟"

اور پھر یکایک میرے کمرے کے دروازے پر کسی نے ہولے سے دستک دی۔ ایک بار، دو بار، اور پھر کئی بار ــ میں نے آہستہ سے دروازہ کھول دیا ــ سامنے رادھا رانی کھڑی تھی ــ

"تم ــ ؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہاں ــ" رادھا رانی نے گھبرا کر کہا، اور میرے کمرے میں گھس گئی۔ چند سیکنڈ اندھیرے میں کھڑے رہنے کے بعد اُس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا، اور پھر میں نے بتی جلا دی۔

"کیوں آئی ہو یہاں ــ ؟" میری آواز جگہ جگہ سے ٹوٹتی چلی گئی۔

"ہوں ــ" رادھا رانی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور پھر مسکراتی ہوئی بالکل میرے قریب آگئی۔ "ایک بات کہنے" اُس نے میرے چہرے پر پھونک ماری۔ میں نے چونک کر رادھا رانی کی طرف دیکھا۔ اُس کے منہ سے شراب کی بُو آ رہی تھی اور اس کی ادھ کھلی آنکھوں کی لانبی لانبی پلکیں جیسے جھپک جھپک کر سو جانا چاہتی تھیں۔

"تم نے شراب پی ہے ــ ؟" میں رادھا رانی کی نگاہوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

"ہاں ــ" وہ آہستہ سے ہنس پڑی۔ پھر اور بھی قریب آ کر بالکل میرے منہ کے سامنے اپنا منہ کھولتی ہوئی بولی: "لو دیکھ لو ــ"

یکایک میرے خون میں جیسے نشہ گھل گیا۔ اور ایک لمحے کے لئے میں سر سے پیر تک ایک ننگی خواہش اور ایک ترسا ہوا جذبہ بن گیا ــ میری نظر جیسے ہزار بوسہ بن کر رادھا رانی کے بھرے بھرے نچلے ہونٹ سے چپک گئی۔

رادھا رانی نے مسکراتے ہوئے ایک ہاتھ اپنی کمر پر رکھا اور دوسرا میرے شانے پر۔ اس کی ساری کا آنچل کھسک کر زمین پر پڑا تھا۔ میں جانے کیوں گھبرا کر ذرا سا پیچھے ہٹ گیا۔

"چلی جاؤ یہاں سے ــ" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا ــ

رادھا رانی لمحہ بھر کے لئے چونکی، پھر دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھ کر ایک ادا سے بولی ــ "چلی جاؤں ؟"

"ہاں —"

"اچھا — " رادھا رانی مسکراتی ہوئی لڑکھڑا کر پلٹی اور دروازے کے قریب پہنچ کر یکایک اُس نے بتی بجھا دی۔

میں پل بھر کے لئے تھر تھرا کر بے جان ہوگیا۔ رادھا رانی پھر میرے قریب آگئی۔

"بتی کیوں بجھا دی تم نے — ؟" میں نے اپنی بے رس آواز میں پوچھا۔

"تمہیں ایک بات بتانے کے لئے — " رادھا رانی نے آہستہ سے کہا۔ اور نہ جانے کیوں لڑکھڑا کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"کون سی بات ؟"

"یہی کہ میرا نام رادھا رانی ہے —" اُس کی گردن جھک گئی۔

میں نے ذرا سا آگے بڑھ کر پوچھا۔ "کون سی شراب پیتی ہو تم ؟"

رادھا رانی نے اپنی گردن اٹھائی — "کیوں — ؟"

"بہت چڑھ گئی ہے تمہیں — "

رادھا رانی نے اپنی گردن جھکا لی۔

"بہت ٹھنڈے مرد ہو —" اُس نے پتہ نہیں کس لہجے میں کہا۔

"رادھا رانی —" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"میرا نام رادھا رانی نہیں ہے جی —" اُس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا — "میرا تو کوئی بھی نام نہیں ہے —" اس کی آواز بھر آگئی — "رادھا اس لئے نہیں کہ میرا کوئی کرشن نہیں، اور کسی نے میرے من میں چھپ کر بانسری نہیں بجائی — رانی اس لئے نہیں کہ میرا کوئی شہزادہ نہیں اور کسی نے مجھے تاج پہنا کر تقدیریں نہیں سونپ دیں — لیکن پھر بھی میرا نام رادھا رانی ہے — کیا تم نے اس سے زیادہ خوبصورت گالی کہیں سنی ہے — ؟"

"رادھا رانی —" میں نے اُسے جھنجھوڑا۔

رادھا رانی دھیرے سے اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اور میری طرف پیٹھ موڑ کر بولی — "اور میرے بارے میں تمہارے بھائی نے تمہیں جو کچھ بتایا ہے وہ سب جھوٹ ہے — نہ میں کہیں کی ٹائپسٹ ہوں اور نہ وہ مجھے دو سال سے جانتا ہے —"

"کیا — ؟" میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر رادھا رانی کو دیکھنا چاہا۔

"ہاں — اور مجھے اُس سے نفرت ہے"

"رادھا —" میں نے یکایک اس کے بازو کو پکڑ لیا۔ اور پھر میں نے جونہی بتی جلانی چاہی رادھا نے مجھے کھینچ لیا —

"بتی مت جلانا، نہیں تو میں کچھ نہ کہہ سکوں گی —"

میں نے محسوس کیا کہ رادھا رانی ہانپ رہی تھی اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔

میری طرف منہ پھیر کر اُس نے کہا —

"تم مرد ہو، شاید سمجھ نہ سکو کہ عورت کبھی کبھی مرد سے جنس کر بھی نفرت کرتی ہے اور اسی نفرت کی خاطر اس کے ساتھ ننگی ہو کر سو بھی جاتی

ہے اور اس کا منہ چوم کر اُس کے بچے کی ماں بھی بن جاتی ہے۔ میں بہت بری عورت ہوں جی مگر پھر بھی عورت ہوں، اس لئے تو تمہارے بھائی کے ساتھ یہاں چلی آئی۔ ہماری صرف دو مہینے کی جان پہچان ہے اور اب میں اس سے شادی کرلوں گی"۔ اتنا کہہ کر رادھا رانی چپ ہو گئی۔

میں نے جانے کیوں اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی، اور لاکھ کوششوں کے باوجود اپنی سسکیوں کو روک نہ پائی تھی۔

"تم دُکھی ہو رادھا رانی ---؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں ---" اُس نے جواب دیا۔ اور یکایک اس نے میرے ایک ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے اس طرح پکڑ لیا جیسے ڈوب رہی ہو۔ "تمہیں نہیں معلوم جی کہ میں کتنی بری عورت ہوں۔ تم مجھے پہلے کیوں نہ ملے۔ اتنی برباد ہو کر بھی میں اپنی اس شیشے کی عورت کو نہ توڑ سکی، اس لئے تو رو رہی ہوں ---"

اُس نے سسک کر میرے ہاتھ کی پشت پر اپنا آنسو بھرا گال رکھ دیا، اور اتنے شکرے رونے لگی کہ جیسے اُسے جنم جنم سے میرا انتظار تھا، اور میں نے محسوس کیا کہ میں ایک سوکھا کنواں ہوں جسے رادھا رانی اپنے آنسوؤں سے بھر رہی ہے --- ایک سسکی --- چند آنسو --- مجھے اور کچھ نہیں چاہئے --- میں محبت کی اس گونج کے سہارے زندہ رہ لوں گا --- میرا انتظار تو امر ہے۔

"رادھا رانی ---"

"تمہیں نہیں معلوم جی ---" رادھا رانی نے بہت دیر بعد کہا۔ "میں اس سے پہلے تین بار شادی کر چکی ہوں اور دو بچوں کی ماں ہوں --- لیکن کسی سہاگ رات نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا، اور میری گود کسی بھی بچے کے لئے پالنا نہ بن سکی --- اسی لئے تو میں رو رہی ہوں --- میرے اندر کی عورت کسی بھی زہر سے نہیں مرتی --- میں کیا کروں ---" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"تم مجھے پہلے کیوں نہیں ملے --- مجھے پہلے کیوں نہیں ملے ---"

"رادھا ---" میں نے اُسے آہستہ سے جھنجھوڑا۔

"ہوں ---" رادھا نے لڑکھڑا کر کہا۔ اور پھر یکایک ایک بچے کی طرح مجھ سے لپٹ گئی۔ "پتہ نہیں جی --- تمہیں چھو کر جی چاہتا ہے کہ اپنا سب کچھ تمہیں بتا دوں --- رو رو کر مر جاؤں --- ہائے! اتنی دیر میں بھی کوئی ملتا ہے ---"

"رادھا ---" میں نے اُسے کس کر بھینچ لیا،

اور وہ مجھ میں سماتی ہوئی بولی --- "تمہیں میں نے کتنا ڈھونڈا ہے تمہیں نہیں معلوم --- اس دنیا میں سبھی مرد ایک سے ہوتے ہیں اسی لئے تو اب تک دھوکا کھا رہی ہوں --- بہت دنوں پہلے میرے گاؤں میں تم رنجیت سنگھ بن کر آئے تھے اور میں تمہارے ساتھ بھاگ کر دلی آ گئی تھی --- ہے نا ---؟"

"ہاں ---" میں نے اس کے بالوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"پھر تم نے مجھے ایک سال تک قالین کی طرح استعمال کیا، اور جب میرے نقش و نگار ذرا دھندلے پڑ گئے تو تم مجھے ایک جیب کی طرح استعمال کرنے لگے --- ہے نا ---؟"

"ہاں ---" میں نے اُس کی گردن پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

SHEAFFER

"اسی لئے تو ایک دن تمہیں چھوڑ کر غلام قادر کے پاس چلی گئی — دلی کا وہ بڑا کلاتھ مرچنٹ تھا۔ اس کی عمر پچاس سے بھی اُوپر تھی، اور اُس کی تین بیویاں تھیں۔ اُس نے مجھے داشتہ بنا کر رکھ لیا، اور داشتہ والی کی طرح استعمال کرنے لگا۔ ایک سال کے بعد میں نے ایک بچہ جنا۔ پھر جانتے ہو کیا ہوا — ؟"

"کیا — ؟"

"ایک دن اُس کی سب سے چھوٹی بیوی نے، جو مجھ سے تین سال چھوٹی تھی مجھے ڈیڑھ ہزار روپیہ دیئے اور مجھے غلام قادر کو چھوڑ دینے کو کہا۔ سو میں ایک رات ڈیڑھ ہزار روپے لے کر چپ چاپ کانپور چلی آئی اور اپنا بچہ غلام قادر کی بانجھ بیوی کے پاس چھوڑ آئی۔ پھر دو مہینے بعد تم مجھے اسٹریٹ کے بھیس میں ملے، ہے نا — ؟"

"ہاں — " میں نے اُس کے کان کے پچھلے حصے پر ہونٹ رکھ دیئے۔

"اور تم نے مجھ سے شادی کر لی، اور مجھے ایک گھر، ایک پلنگ اور ایک چولھا دیا، اور میں اپنے پچھلے گناہوں کی قبر پر چادر چڑھا کر تمہاری بیوی بن گئی — ہے نا — ؟"

"ہاں — "

"لیکن ایک دن تمہیں اپنے دوست نارائن پر شک ہو گیا — ایک رات تم دونوں لڑ پڑے اور تمہاری جان چلی گئی۔ نارائن نے چاقو سے تمہاری انتڑیاں نکال دی تھیں — ہے نا — ؟"

"ہاں — "

"میں اسی رات وہاں سے بھاگ گئی اور بمبئی چلی آئی۔ تم آخری بار مجھے بمبئی ہی میں مائیکل کے روپ میں ملے تھے — تم بالکل سوکھے مریل سے تھے لیکن تم بہت اچھا وائلن بجاتے تھے، اور کبھی کبھی کوئی میوزک ڈائرکٹر تمہیں کام دے دیا کرتا تھا — ہے نا — ؟"

"ہاں — "

"تم بہت اچھے تھے اسی لئے میں نے تم سے شادی کر لی۔ میرے پاس تقریباً ڈھائی ہزار روپے تھے اسی لئے ایک سال پلک جھپکتے ہی اس طرح گذر گیا جیسے وائلن کا ایک نغمہ، لیکن دوسرے ہی سال میں تمہارے وائلن سے تنگ آ گئی — تمہیں بہت کم کام ملتا تھا، اور ہم فاقے کرنے لگ گئی تھی — اسی درمیان میں نے ایک مُردہ بچے کو جنا۔ اور اسی سال کے آخری دنوں میں مجھے پتہ لگا کہ تمہیں ٹی بی ہے — لیکن میں نے تمہیں چھوڑا نہیں کیوں کہ تمہیں واقعی مجھ سے محبت تھی۔ لیکن ایک دن جاڑے کی صبح کو تم مجھے بستر پر مُردہ ملے — میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا — میں نے تمہارے ٹوٹے ہوئے وائلن کو پچیس روپے میں بیچا اور دھوکا دیتی ہوئی بغیر ٹکٹ کے کلکتہ پہونچ گئی — اور پھر جانتے ہو کیا ہوا؟"

"کیا — ؟"

"پھر میں ایک سال تک ہوٹل بار میں پیشہ کراتی رہی، اور ایک سال تک محسوس کرتی رہی جیسے میں اپنی زندگی کی تپتی ہوئی ریت پر کھڑی ہوں، اور میرا ہر گاہک اپنے ہاتھ میں ایک ایک پتھر لئے مجھے سنگسار کر رہا ہے — میرے پاس جتنے روپے آئے میں اتنی ہی زخمی ہوئی۔ میں زہر کے بدلے میں زہر کھاتی رہی اور پھر اُس وقت جب ساری دنیا مل کر میرے شیشے کی عورت کو چٹخا رہی تھی کہ تمہارے بھائی نہ جانے کہاں سے آ کر میری قبر توڑ دی، اور مجھے بتایا کہ اس کا ایک شیشے کا گھر ہے جسے صدیوں سے ایک شیشے کی رادھا رانی کا انتظار ہے — میں نے سر جھکا کر ہاں کہہ دی اور اب ...... "

رادھا رانی یکایک چپ ہوگئی — میں بہت دیر تک اُس کی آواز کا انتظار کرتا رہا — مگر وہ چپ چاپ خاموش گردن جھکائے کھڑی رہی —

"اورا ب —" وہ خود ہی بولی — "مجھے اُس سے نفرت ہے —"

"رادھا —"

"مجھے اُس سے نفرت ہے —" بہت دیر سے رُکے ہوئے آنسو بہہ نکلے اور وہ پھوٹ پڑی۔

"بیجے —" اُس نے سر اُٹھا کر مجھے پکارا۔

پتہ نہیں کیوں اُس نے میرے لئے یہ عجیب سا نام رکھ دیا تھا۔

"بیجے — تمہیں دیکھ کر لگتا ہے جیسے میں نے کبھی شادی نہیں کی اور کبھی؟ پتہ نہیں بیجا — میں اُس سے شادی نہیں کروں گی — مجھے بچا لو — مجھے بچا لو —"

"رادھا —" میرے جسم کا سارا خون اچھل کر میرے دل کی دیوار کو توڑ گیا — "رادھا —"

"ہوں —"

"اب تم جاؤ —"

"کیا —؟" وہ چونک کر بولی۔

"اب تم جاؤ —" میں ہلکے ہلکے کانپنے لگا۔

"نہیں — نہیں —" وہ مجھ سے اور لپٹ گئی۔

"رادھا رانی — دیکھو رات کتنی بیت گئی ہے"

"نہیں —"

"وہ جاگ جائے گا — اب تم جاؤ —" میں نے اُسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"بیجے —" اُس نے میرے بالوں، میری آنکھوں اور میرے ہونٹوں پہ انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا — "میرا ایک کام کر دو گے —؟"

"کیا —؟"

"مجھے کہیں سے تھوڑی شراب لا دو —"

"کیا —؟؟"

"میں کل رات تم سے ملوں گی — یہیں — اسی کمرے میں — —"

"رادھا رانی —"

"میں جاتی ہوں —" اُس نے قریب آکر یکایک مجھے زور سے لپٹا لیا، اور پھر لڑکھڑاتی ہوئی تیز تیز قدموں سے باہر چلی گئی۔

اس رات کے آخری پہر بہت زوروں کی بارش ہوئی اور میں دیر تک اپنے کمرے کی کھڑکی کھولے کھڑا رہا اُس سورج کی یاد میں جسے میری زندگی نے دفن کر دیا تھا — میری آنکھیں نیند سے بھر آئی تھیں — رات اندھیرے کو چاٹ چاٹ کر صاف کر رہی تھی اور جھمجھاتی ہوئی

بارش میں آسمان کے سارے ستارے بجھ بجھ کر بہہ رہے تھے ـــ میں نے آہستہ ـــ گھوم کر الماری کھولی اور ڈرائی جن کی بوتل نکال کر ایک ہی سانس میں ڈھیر ساری شراب پی گیا ـــ یہ میرے ساتھ اکثر ہوا ہے ۔ میں جب بھی کسی سوال کا جواب نہیں دے سکا ہوں میں نے شراب پی ہے اور شراب نے نشہ بن کر ہر سوال کا خون کیا ہے ۔ اسی لئے تو میں نے آج بھی رادھا رانی کی یاد کا خون کر دیا تھا ـــ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا ـــ میں ہنسوں یا روؤں؟ ـــ میں کس پر اپنا حق جتاؤں؟ ـــ کس سے کہوں کہ مجھے رادھا رانی سے محبت ہے؟ ـــ کس پر اپنی زندگی کا الزام لگا دوں ـــ؟

بوتل کی گردن کو میں نے اس زور سے پکڑ لیا جیسے سارا قصور اسی کا تھا ـــ باہر بارش اُسی تیزی سے ہو رہی تھی ۔

دوسری رات ـــ میں نہ چاہتے ہوئے بھی رادھا رانی کا انتظار کر رہا تھا، اور وہ ساری کی ساری رات ایک آہٹ بن کر میری پینتیس برسوں کی اکیلی پگڈنڈی پر گونج رہی تھی ـــ وہ لمحۂ انتظار ایک الاؤ کی طرح سلگ اٹھا تھا جس کے گرد میں ہزاروں روپ میں اپنے سے بہت دور بیٹھا خود اپنی کہانی سن رہا تھا ۔ کیسے محبت دل کے راج محل میں گھونگھٹ کاڑھے آئی تھی اور کیسے اعتبار زخمی ہوا تھا ۔ اور کیسے چاندنی اپنا لہو چھڑک کر برہن بنائی تھی، اور کیسے اندھیروں نے تھپک تھپک کر زہر پلایا تھا ـــ یہ میری دکھوں بھری کہانی ـــ میں کیوں اس زندگی کے بن باس میں اکیلا گھوم رہا ہوں، اور کیوں کوئی سیتا نہیں آتی ـــ

"رادھا رانی ـــ"

یکا یک کسی نے ہولے سے دستک دی ـــ

"رادھا رانی ـــ"

میں نے لپک کر دروازہ کھول دیا ـــ

سامنے وہ کھڑی تھی ـــ میری جان ـــ میری رادھا رانی ـــ

اُس نے چوروں کی طرح میرے کمرے میں گھس کر دروازہ بند کر دیا ۔

میں نے غور سے دیکھا، وہ آج بالکل دلہن بنی ہوئی تھی ۔ پھولوں بھری زلفوں سے لے کر پیروں کے سُرخ ناخنوں تک رادھا رانی تلوار کی طرح کھنچ کر اپنی فتح اور میری شکست بن گئی تھی ـــ اُس کے جسم پر لپٹی ہوئی سُرخ ساڑی نے میرے سارے کمرے میں آگ لگا دی، اور میرے دل کی راکھ تلے دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک کر میری کنپٹیوں اور میری آنکھوں تک آ گئیں ـــ

اُس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کو کہا، اور پھر میرے قریب آ کر یکایک بتی بجھا دی ۔

"رادھا ـــ" میں نے اُدھڑی ہوئی آواز میں کہا ۔

"لائیے ـــ" اُس نے قریب آ کر پوچھا ۔

"کیا ـــ؟"

"شراب ـــ" وہ ہنسی ۔

میں نے اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے ڈرائی جن کی بھری بوتل میز سے اٹھائی اور رادھا رانی کے ہاتھوں میں تھما دی ۔

"پیجئے ـــ" اُس نے پھولوں بھرے لہجے میں کہا ۔

"ہوں ـــ"

"تم بہت اچھے ہو —"

"ہوں —" میں جیسے اپنی ہی خواہشوں کی جھیل میں گردن تک ڈوب گیا۔

"سچ —"

"ہوں —"

"کچھ نہیں —" وہ پھر ہنسی، اور ایک جھٹکے سے اُس نے بوتل اپنے ہونٹوں سے لگالی۔ ایک تیز سی مہک اُڑی۔ پھر چند گھونٹوں کے بعد اُس نے بوتل مجھے تھماتے ہوئے کہا — "لو پیو —"

"میں نہیں پیتا —" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کیوں جھوٹ بولتے ہو —" وہ زور سے ہنسی۔

"میں نہیں پیوں گا —"

"پی لو —"

"نہیں —"

"سچ —"

"ہوں —"

"پی لو —" اُس نے اپنی مہکی زلفوں والا سر میرے کاندھے پر رکھ دیا — "تمہیں میری قسم —"

اور پھر جیسے کسی نے زبردستی بوتل میرے ہونٹوں سے لگادی۔ ایک ہی سانس میں میں تقریباً ڈیڑھ دو پیگ پی گیا۔

"اور پیو —" رادھا رانی بولی۔

میں نے اور پی لی۔

"اور پیو —"

میں نے پھر پی لی۔

"لاؤ —" بوتل اُس نے تقریباً چھینتے ہوئے کہا، اور بے صبرہ ہو کر ایک ڈیڑھ منٹ تک پیتی چلی گئی — بوتل پھر میرے پاس آئی اور پھر اُس کے پاس گئی اور پھر میرے پاس آئی — بیس منٹ کے اندر بوتل خالی ہو چکی تھی۔

میری اَدھ کھلی آنکھوں کے آگے دھواں پھیل گیا، اور میرے گھٹنوں میں ہلکی ہلکی کپکپاہٹ آگئی۔ رادھا رانی نشے میں دُھت مجھ سے لپٹی کھڑی تھی، اور میں اُسے لئے جیسے لفٹ سے نیچے ہی نیچے اُترتے چلے جا رہا تھا۔ نیچے اور نیچے — اپنی زندگی کی کھائیوں میں رادھا رانی کے حُسن کو ایک چور کی طرح بھگائے لے جا رہا تھا — میرا کسی سے کوئی رشتہ نہیں رہا تھا — نہ اپنے سے نہ اپنے پینتیس چکنا چور برسوں سے — نہ مجھے کسی کے ہونٹوں کی مدھم لالی یاد آئی اور نہ ڈھلتی ہوئی شام میں کسی کا بجھتا ہوا وعدہ — زندگی کے اس موڑ سے اُس موڑ تک بس رادھا رانی کا سایہ تھا اور میں اُسے بھگائے لئے جا رہا تھا۔ نیچے — اور نیچے ———

کون اپنا ہے اور کون پرایا؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا — چاندنی کس کی ہے؟ پھول تیرے ہیں یا میرے؟ رات کے آنسو کس کے بھاگ کے ہیں؟ کون تھا جو بولتا؟ کس کی ہمت تھی جو رادھا رانی کو مجھ سے چھین لیتا؟؟

"رادھا رانی ——" میری آواز پتھر کی طرح میرے حلق میں کھڑکھڑائی۔

"ہیجے۔" اُس نے اپنی گردن اُٹھائی ——اُس کی آواز بھاری اور نامکمل تھی۔

"ہوں ——"

"میں مگر تو نہیں جاؤں گی نا ——؟"

"نہیں ——" میں نے اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

"مجھے نیند آ رہی ہے" —— اُس نے اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا —— "جانتے ہو وہ کیا کہتا تھا ——؟"

"کون ——؟"

"وہی پرمیشو —— پرمیشر سنگھ ——" رادھا رانی مشکل سے ہنستی ہوئی بولی —— "کہتا تھا کہ میں بہت گر گئی ہوں —— حرامی کہیں کا ——"

"کون پرمیشر سنگھ؟" —— میں نے اپنی مندھی ہوئی آنکھیں کھولیں۔

"وہی جس کی تصویر میرے پاس ہے —— میرے گاؤں کا پرمیشر سنگھ ——"

"کون ہے وہ ——؟" میں نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

"بہت یاد آتا ہے ——" رادھا رانی بغیر سنے ہوئے بولی —— "سور کا بچہ ——"

"کون ہے وہ ——؟" میں نے پھر پوچھا۔

"ہیجے ——" رادھا رانی کی آواز رُندھ گئی۔

"ہوں ——"

"میں اُسے کیوں نہیں بھول سکتی ——؟" رادھا رانی ہلکے سے سسکی۔

میں خاموش رہا۔

"بولو نا ——" وہ لڑکھڑاتی ہوئی بولی —— "تمھیں کوئی یاد نہیں آتی ——؟"

"آتی ہے ——"

"کون ——؟"

"تم ——!"

"میں ——؟" رادھا رانی چونکی —— "میں تو تمہارے پاس ہوں ——"

"مگر پھر بھی بہت دور ہو ——"

"لو اور قریب آ گئی —— بس؟" وہ بالکل مجھ سے چپک کر بولی۔

میں نے رادھا رانی کا چہرہ ایک کتاب کی طرح اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔

"رادھا رانی ——"

"حرامی کا بچہ ——" رادھا رانی یکایک زور سے بولی۔

"کیا ——؟" میں چونکا۔

"بہتیں نہیں —" وہ زور سے ہنس پڑی — "وہ پرمیشر سنگھ ہے نا — اُس کو بہت غرور تھا اُس کو اپنے مضبوط جسم پر"

"کہاں ہے وہ —؟" میری آواز میں جانے کہاں سے بے بسی آ گئی۔

"پتہ نہیں —" رادھا رانی جیسے کہیں دور چلی گئی — مجھے چند بوسے اور ڈرائی جن کی ایک خالی بوتل دے کر — "اگر کبھی مل گیا تو خون پی لوں گی —" وہ دانت کچکچا کر بولی، اور پھر یکایک میرے شانے پر سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "تب پرمیشر سنگھ — پرمیشر سنگھ کیوں نہیں مر جاتا —"

"رادھا رانی —" میں نے اسے جھنجھوڑا۔

"ہوں۔"

"اب تم جاؤ —"

"نہیں —"

"اب تم جاؤ رادھا رانی —" میں جانے کیوں غصہ ہو گیا۔

"نہیں — اُس نے مجھ کس کر پٹا لیا — نہیں جاؤں گی —"

"رادھا —"

"میں نے کبھی ہار نہیں مانی جی — پرمیشر سنگھ نے مجھے شکست دی ہے نا — تو کیا ہوا؟ میں نے تو ہار نہیں مانی —" وہ بالکل نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں بڑبڑائی۔

"چلی جاؤ رادھا رانی —" میں نے ذرا تیز آواز میں کہا۔

"نہیں۔"

"رادھا —" میں نے نہ جانے کیوں زور سے اُس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔

"بچے —" اُس نے حیرت سے اپنا سر اٹھایا۔

"مر گیا بچے —"

"نہیں جل گیا —" رادھا رانی زور سے ہنسی۔

اور میں نے دھڑا دھڑ دو تین طمانچے اس کے چہرے پر مار دیئے۔

اور پھر یکایک کسی نے دروازے پر دستک دی۔

"کون —؟" میں نے غصے سے تیز آواز میں پوچھا۔

"میں —" میرے بھائی کی ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی —

رادھا رانی چونک کر پیچھے ہٹ گئی۔

اور ایک ٹھنڈی لہر سر سے پیر تک مجھے کپکپاتی چلی گئی — میرے جسم کے اندر خول سا ہو گیا اور تیز ہوائیں سیٹیاں سی بجانے لگیں کانوں میں جھینگروں کی آواز تیز ہو گئی اور نشہ جیسے اُتر کر پسینہ بن گیا — تبھی جلا کر میں نے لڑکھڑاتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا اور اس سے پہلے کہ میں اپنے بھائی کو غور سے دیکھتا، وہ لپک کر اندر داخل ہو گیا — ڈرائی جن کی خالی بوتل زمین پہ پڑی تھی اور کمرہ شراب کی بو سے بسا ہوا تھا۔ رادھا رانی کے

بال بکھر کر اُس کے چہرے پر آگئے تھے، اور ساری سینے سے کھسک کر فرش پر لوٹ رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے سناٹے کا ایک خوفناک ریلا آیا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے ہم تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ــ وہ ایک عجیب لمحہ ــ جیسے ہم تینوں ننگے ایک ہی لحاف اوڑھے سو رہے تھے اور جیسے کسی نے چادر کھینچ کر ہٹا دیا تھا ــ وہ لمحہ ایک سوال بن گیا جسے کسی جواب کی ضرورت نہیں تھی۔

یکایک رادھا رانی قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

"چپ کیوں ہو ــ؟" وہ ہنستی ہوئی میرے بھائی کے قریب آگئی۔ میرا بھائی لمحہ بھر کے لئے چونکا ــ رادھا رانی نے اس کے سینے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ــ

"میں آج رات تم دونوں کی ہوں ــ بانٹ لو مجھے ــ" وہ اب بھی ہنسے جا رہی تھی۔

میرے بھائی نے ایک بار غور سے اس کی طرف دیکھا اور پھر یکایک اس کے منہ پر تھوک دیا۔

رادھا رانی اور بھی تیزی سے ہنستی ہوئی پیچھے ہٹی اور یکایک اپنے بلاؤز کو دونوں ہاتھوں سے پھاڑ کر چلائی ــ "بانٹ لو مجھے تم دونوں ــ رادھا تم لے لو اور رانی تم ــ آؤ ــ" وہ ہاتھ پھیلا کر ہم دونوں کی طرف دیکھتی ہوئی قہقہہ مار کر بولی۔

پھٹے ہوئے بلاؤز سے اُس کا ننگا گلابی سینہ باہر آگیا تھا، اور اس کی ساری اب بالکل کھل کر زمین پر گر گئی تھی ــ میں نے جانے کیوں نظریں جھکا لیں ــ جی چاہا کہ کمرے سے بھاگ کر کہیں گم ہو جاؤں ــ اندھیرا بن کر کسی کونے کھترے میں جذب ہو جاؤں ــ یکایک میرے بھائی نے آگے بڑھ کر پھر رادھا رانی کے منہ پر تھوکا اور آخری نظر مجھ پر ڈالتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا ــ اور اس کی وہ نظر ایک سنگ میل بن کر ٹھہر گئی۔ بتاگئی کہ نفرت میں کتنا اندھیرا ہے، اور محبت میں کتنی بے بسی ہے۔ اور یہ کہ چاندنی میں چاند کا لہو ہے اور شام میں صبح کی شکست ہے۔

میری گردن جیسے دار پر مردہ ہو کر لٹک گئی ــ میں وہ میلی نہیں تھا جسے میرے بھائی نے دیکھا تھا۔ میں تو بہت پہلے، رادھا رانی کے ملنے سے بہت پہلے آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا۔

یکایک میرے بھائی کے کمرے سے کسی کی چیخ سنائی دی۔

مجھے آج بھی یاد ہے وہ چیخ جیسے میرے سارے قہقہوں کا قرضہ چکا گئی تھی، اور اُس کی آواز میرے آنے والے ہر ہر پل میں گونج گئی تھی ــ میں کیسے اپنے بھائی کے کمرے تک پہونچا مجھے یاد نہیں۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ وہ بستر پر تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہا تھا اور زمین پر ایک بیڈ کی شیشی خالی پڑی تھی۔

صبح ہوتے ہوتے وہ مر گیا۔

دوسرے روز مجھے اُس کے تکیے کے نیچے سے ایک پرزہ ملا، لکھا تھا "میری موت میری اپنی موت ہے ــ اس کا کوئی بھی ذمہ دار نہیں ــ اگر کوئی ہے تو یہ دنیا، اور دنیا کو تم پھانسی پر نہیں چڑھا سکتے ــ"

میں نے محسوس کیا کہ میں ایک دلچسپ ناول ہوں جس کا آخری صفحہ کھٹ گیا ہے۔ جیسے میں جنم جنم سے اکیلا ہوں، اور میرا ہر جذبہ اکیلا ہے اور ہر سوچ اکیلی ہے۔ میں ایک لمحہ کے ڈھلوان سے لڑھک کر دوسرے لمحہ کے چٹان پر زخمی ہو رہا ہوں اور اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں۔

اس کی موت کی رات بہت کالی تھی اور سارے ستاروں کو جیسے کسی نے چن چن کر اندھیرے میں پھینک دیا تھا اور آسمان کا سینہ خالی تھا

صبح ہوتے ہوتے بوندوں کی بارش شروع ہوئی اور تین دنوں تک ایک لمبی شکایت کی طرح برستی رہی ــ وہ تین دن میں نے کیسے گذارے میں نہیں جانتا، اور تین دنوں تک رادھا رانی کہاں رہی یہ بھی میں نہیں جانتا ــ لیکن چوتھے دن میں نے صبح صبح دیکھا رادھا رانی جوگن کی سی سفید

ساری چیزیں اپنا ہاتھ میں اپنا بکس لئے میرے کمرے کے دروازے کے پاس سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور پپوٹے بھاری ہو گئے تھے۔

"میں جا رہی ہوں" — اُس نے مدھم آواز میں کہا، اور وہ مدھم آواز دیکھتے ہی دیکھتے تیز ہوئی اور پھر چیخ بن کر میرے کانوں سے ٹکرائی

"کیا —؟" میں نے بے اختیار لہجے میں کہا۔

"میں جا رہی ہوں —" رادھا رانی اسی طرح سر جھکائے ہوئے بولی اور پھر آگے بڑھ گئی۔

"ٹھہرو — " میری آواز، میرا دل، میرا جسم سب کچھ ڈوب گیا — "کہاں جا رہی ہو —؟"

"پتہ نہیں —" اُس نے ہنسی کرتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"رادھا — میرے سارے خواب جیسے پگھل کر میری آواز بن گئے، اور میری زندگی جیسے ایک بھکاری بن کر جلنے کس بھوک سے کلاپنے لگی — "مت جاؤ —"

"نہیں —" وہ آگے بڑھی۔

"رادھا —" میں نے لپک کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چھوڑ دو مجھے —" اُس نے یکایک نظریں اُٹھا کر بہت تیز لہجے میں بہت غصے سے کہا۔ اور پھر اسی لمحے سر جھکا کر رونے لگی — "مجھے جانے دو — میں بہت بُری عورت ہوں — بہت بُری عورت ہوں —" بکس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا، اور اُس نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے اس طرح چھپا لیا جیسے وہ ڈرا دینے والی حد تک بدصورت ہو۔

"مت جاؤ رادھا —" میں نے اس کا بکس اٹھا لیا۔

"جانے دو مجھے —" اُس نے پھر غصے سے اپنا بکس چھینتے ہوئے کہا۔

"رادھا —" رادھا نے مجھے ایک بار اپنی آنسو بھری شفاف آنکھوں سے دیکھا اور یکایک اُس کا لہجہ مدھم ہو گیا

"مت روکو مجھے —" اُس نے اس طرح کہا جیسے کہہ رہی ہو مجھے معاف کر دو —"

"رادھا —"

"نہیں —" وہ آگے بڑھی۔

"رادھا رانی — آج — صرف آج اور رُک جاؤ —" میں نے اُس کے دونوں بازوؤں کو زور سے پکڑ لیا۔

رادھا نے پلٹ کر جیسے حیرت سے مجھے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں پھر آنسو اُبلنے لگے تھے۔ اُس نے جان بوجھ کر بکس نیچے گرا دیا، اور دوڑتی ہوئی کمرے میں گھس گئی، اور میں کھڑا دیکھتا رہ گیا — ایک دن — صرف ایک دن — وہ خوشی جو زندگی بھر کی ہوتی آج صرف ایک دن کی تھی — کل کیا ہوگا؟ — اور پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ — میں نے سوچا جب سے محبت جاگی ہے درد نے کتنا ہنسنا سکھایا ہے؟

اور پھر اُس دن مجھے پرمیشر سنگھ ملا — پہلی اور آخری بار — ہانپتا ہوا بھوکا پرمیشر سنگھ — جو اپنے سینے پر ایک طویل مسافت کا بوجھ اٹھائے نہ جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاتا ہوا رادھا رانی کو ڈھونڈتا ہوا یہاں آ نکلا تھا — میں نے دیکھا وہ بوڑھا ہو چلا تھا، اور اُس کے چہرے پر جمی ہوئی بدصورت جھریوں میں ایک ایسی کہانی کھدی ہوئی تھی جسے ہزاروں بار دہرایا گیا تھا، اور اس کی گردن کائی جمی ہوئی

آنکھوں میں ایک پیاسا بے بس انتظار، جو بار بار دیا گیا تھا ـــــ اُس کے ہاتھوں میں اب بھی رادھا رانی کا بوسیدہ مڑا ہوا خط تھا، اور وہ کہہ رہا تھا، اپنی کہانی جو بعد میں میری کہانی کی جان بن گئی۔

آؤ تمہیں وہ کہانی سُناؤں!

رادھا رانی جب آٹھ سال کی تھی تو پرمیشر سنگھ نے اُسے بیٹی بنا کر گود لیا تھا ـــ وہ چھوٹی سی گڑیا سی بڑی بڑی آنکھوں والی رادھا رانی جس کے ماں باپ گاؤں کی کسی وبائی بیماری میں مر گئے تھے پرمیشر سنگھ کے پاس بارہ سال تک رہنے کے باوجود اپنی پہلی کہانی بھول نہ سکی تھی ـــ پرمیشر سنگھ نے شادی نہیں کی تھی ـــ صرف محبت کی تھی۔ اور محبت اس کی زندگی کو جگہ جگہ سے اُدھیڑ کر بدصورت بنا کر چلی گئی تھی، اور وہ زندگی کی گہری کھائیوں میں کھڑا تنہائی کی آواز سنتا رہ گیا تھا۔ اور وہ ساری چاندنی راتیں جو اُس کے دل کی کال کوٹھڑی میں پاگل ہو کر چیخنے لگی تھیں پرمیشر سنگھ کی معصوم آس پر اندھیرے کا کولتار ڈال گئیں ـــــ اور پھر ایسے میں اُسے رادھا رانی ملی اور اس نے اپنے پیار کا رُخ موڑ دیا ـــ بارہ سال تک اس نے اسے بیٹی کی طرح پالا اور زندگی اُسے سکھ کی بھیک دینے لگی ـــــ وہ اندرا کو بھول نہ سکا تھا ـــ کبھی کبھی آدھی رات کو جب اُس کی آنکھیں کھل جاتیں اور وہ رادھا رانی کو نیند میں گم ایک چمکتی ہوئی مسکراہٹ سے لپٹا ہوا پاتا تو اُسے اندرا یاد آتی اور وہ سوچتا کہ اگر اس کی محبت دلہن بن جاتی تو شاید وہ سچ مچ رادھا رانی کا باپ ہوتا۔ سچ مچ اندرا رادھا رانی کی ماں ہوتی۔ اور پھر کیا ہوتا؟ ـــــ پھر شاید کچھ ہونے کی ضرورت نہ ہوتی ـــــ زندگی اندرا اور رادھا رانی سے زیادہ کیا دے سکتی ہے؟

پرمیشر سنگھ ایک موہوم سی خوشی میں گم رادھا رانی کو اپنی بیٹی اور اندرا کی بیٹی سمجھ کر پیار کرتا رہا۔ کیوں کہ زندگی میں جسے محبت نہیں ملتی وہ بدصورتوں سے نفرت نہیں کر سکتا۔

لیکن بارہ سال کے بعد پرمیشر سنگھ کا یہ خواب بھی تارے کی طرح ٹوٹ کر اندھیرے میں گم ہو گیا۔ رادھا رانی جب جوان ہوئی، تو اُس نے پرمیشر سنگھ کو بابا کہنا چھوڑ دیا۔ اور اس کی آنکھوں میں ایک ایسی زبان پیدا ہو گئی تھی جسے سُن کر پرمیشر سنگھ مہینوں دکھا اور پچھتاوے میں جلتا رہا۔ اور بہت دنوں بعد اسے یاد آیا کہ وہ رادھا رانی کا باپ نہیں۔ رادھا رانی جیسے کوئی پرائی عورت تھی جو اس کے گھر میں زبردستی گھس آئی تھی، اور پرمیشر سنگھ جیسے بارہ سال مُردہ رہنے کے بعد ہوش میں آیا تھا۔

ایک رات جب وہ اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا کہ اسے احساس ہوا کوئی اُس کے بستر کے پاس کھڑا ہے اور اس کی پیشانی چھو رہا ہے۔ اُس نے آنکھیں کھولیں، دیکھا، رادھا رانی پسینے میں شرابور دھیرے دھیرے ہانپ رہی تھی، اور اس کی طرف ایسے دیکھ رہی تھی جیسے اُس کی آنکھوں نے زندگی بھر پلک نہ ماری ہو۔

"رادھا ـــ" اُس نے چونک کر اُٹھتے ہوئے کہا۔

رادھا رانی یکا یک پلٹ کر دوڑتی ہوئی کمرے سے بھاگ گئی۔

پرمیشر سنگھ سر سے پیر تک پتھر کا پرمیشر سنگھ بن گیا ـــــ وہ نظر جو رادھا رانی اُس رات اپنے ساتھ لائی تھی صاف بتا گئی تھی کہ وہ اس کی بیٹی نہیں صرف عورت ہے ـــــ لیکن وہ اپنے کو صرف مرد سمجھنے پر تیار نہیں تھا۔ وہ اس کا باپ بھی تھا ـــــ اُس رات وہ بالکل نہ سو سکا۔ اور دوسرے دن جب صبح ہونے سے پہلے اس نے رادھا رانی کے کمرے میں جھانکا تو دیکھا وہ اُس کی شلوار اور قمیص سے لپٹ کر سو رہی تھی ـــ پرمیشر سنگھ کو عجیب سی دکھ بھری شرم نے گھیر لیا ـــــ اُس نے رادھا رانی سے کچھ نہیں کہا، اور بہت دنوں تک اُداس رہا ـــــ رادھا رانی اب اس کی طرف دیکھ کر ایسے مسکرانے لگی تھی کہ اس کا خون کھول جاتا۔ اُس کا جی چاہتا کہ وہ رادھا رانی کو جان سے مار ڈالے

— اُسے یقین نہ آتا کہ وہ رادھا رانی جسے اُس نے بارہ سال تک بیٹی بنا کر پالا اتنی ذلیل اتنی کمینی کیسے ہو گئی۔ اُس کی رگوں میں کس کا خون ہے جو اتنا گر کر سوچتا ہے؟

اسی درمیان ایک رات پھر پرمیشر سنگھ نے رادھا رانی کو اپنے بستر کے قریب اسی طرح پسینے میں شرابور کھڑا پایا۔ اُس کی سانسیں اسی طرح تیزی سے چل رہی تھیں۔۔

پرمیشر سنگھ نے غصے میں ایک کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔۔

۔رادھا — اُس نے تقریباً چلا کر کہا۔

اور رادھا رانی جیسے بے قابو ہو کر اُس کے سینے پر گر پڑی، اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، رادھا رانی نے اپنے ہونٹ اُس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔

پرمیشر سنگھ ایک لمحے کے لئے ساکت ہو گیا، ایک لمحے کے لئے دکھی ہوا، اور ایک لمحے کے لئے شرمندہ ہوا۔ اور پھر جیسے ہمیشہ کے لئے اُس کے سینے میں غصے کی آگ سُلگ اُٹھی — رادھا رانی کے منہ پر اُس نے اس زور سے تھپڑ مارا کہ وہ فرش پر جا گری، اور پھر اُٹھ کر اُس نے گھونسوں اور لاتوں کی بارش شروع کر دی —— اور اُس وقت تک مارتا رہا جب تک کہ وہ بے ہوش نہ ہو گئی —— اور جب وہ بے ہوش ہو گئی تو وہ ہانپتا ہوا اپنے بستر پر لیٹ گیا، اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا —— پرمیشر سنگھ جو زمانے میں کسی کو اپنا نہ بنا سکا۔

اس رات کے بعد اُس نے رادھا رانی سے پھر بات نہ کی، اور لاکھ کوشش کے باوجود اُسے اپنے گھر سے نکال نہ سکا۔ بارہ برس کی لگاتار محبت نے رادھا رانی کے پیار کو اُس کے دل میں ایک کیل کی طرح پیوست کر دیا تھا، اور اب ایک دریچہ بھی ایسا نہیں تھا جہاں سے نفرت چپکے سے آ سکتی۔۔۔

اُس نے اندر ہی اندر رادھا رانی کی شادی دلجیت سنگھ سے پکی کر دی۔ پہلے تو رادھا رانی بالکل راضی نہ ہوئی، اُداس رہنے لگی بھوکی رہنے لگی، لیکن جب پرمیشر سنگھ کسی طرح نہ پگھلا تو اُس نے ہاں کہہ دی۔

شادی کے تین دن پہلے جب وہ اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا، اُسے اپنے سینے پر کسی ہلکے سے بوجھ کا احساس ہوا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں اور سر سے پیر تک ایک ٹھنڈی لہر بن گیا — اُس کے سینے پر ایک ہاتھ رکھے رادھا رانی اس کی بغل میں ننگی سو رہی تھی۔ جانے کیوں اُس کے منہ سے ایک لمبی چیخ نکل گئی۔ اور اس نے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ پھر اُسے کچھ یاد نہ رہا۔ اور جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو صبح ہو چکی تھی۔ رادھا رانی جانے کب اُس کے پہلو سے اُٹھ کر چلی گئی تھی۔ اُسے لگا جیسے اب وہ زندگی بھر رادھا رانی سے آنکھ نہیں ملا سکے گا۔ اور زندگی اپنے خیالوں کی بھیڑ میں راستہ ڈھونڈتی رہے گی۔

اس صبح وہ پھر دیر تک بیٹھا بچوں کی طرح روتا رہا۔

اُس نے سوچا تھا کہ رادھا رانی کی شادی کے بعد وہ اپنا سب کچھ بیچ کر کہیں دوسری جگہ چلا جائے گا۔ اور کسی ایسی جگہ چھپ کر جینے لگا جہاں کسی سے محبت نہ کرنا پڑے۔ کیوں کہ محبت جب آتی ہے آنکھیں آنسوؤں سے اندھی ہو گئی ہیں۔

لیکن رادھا رانی کی جس دن شادی ہوئی اُس کے دوسرے ہی دن واپس بھیج دی گئی۔ سہاگ رات ہی کو رادھا رانی نے اپنے شوہر کو بتایا تھا کہ وہ پرمیشر سنگھ کے بچے کی ماں بننے والی ہے —

پرمیشر سنگھ نے جب یہ سُنا تو اُسے اپنے کانوں پر اور رادھا رانی کی نیکی پر یقین نہ آیا۔ پورے گاؤں میں اُس کی بدنامی ہوگئی اور وہ کبھی آسمان کی طرف سر اُٹھائے چاند دیکھ کر ہنستا تھا اب زمین کی ڈھول پر ننگا ہیں جمائے رونے پر مجبور ہوگیا۔

اس دن رادھا رانی اپنی سسرال سے واپس آئی تھی اُس کے دوسرے ہی دن وہ زنبیت کے ساتھ بھاگ گئی اور پرمیشر سنگھ کی دنیا میں ایک ایسی کہانی چھوڑ گئی جسے وہ دہرا نہیں سکتا تھا۔

پھر اس کے بعد بہت کچھ ہوا۔

پرمیشر سنگھ نے اپنا گاؤں چھوڑ دیا۔ اپنی زمین بیچ دی ۔۔۔ اور سبھوں سے رشتہ ناطہ توڑ کر ادھر اُدھر بھٹکتا رہا، اور رادھا رانی کو ڈھونڈتا رہا ۔۔۔ محبت جب ٹھکرائی جائے تو اور بے چین ہو جاتی ہے ایسا ہی حال پرمیشر سنگھ کا تھا۔

میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ اتنی دیر بولنے کے بعد وہ اور زیادہ ہانپنے لگا تھا، اور اس کی لال آنکھوں کے کوئے آنسوؤں سے بھر آئے تھے ۔۔۔ پرمیشر سنگھ رو بھی سکتا ہے، یہ اُسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا۔ لیکن اُسے روتے دیکھ کر یہ ہر کوئی کہہ سکتا تھا کہ اسے کبھی کسی نے چاہا ہوگا۔

"تو تم اُسے لینے آئے ہو ۔۔۔؟" میں نے بہت دیر بعد پوچھا۔

"ہاں ۔۔۔" اُس کی آواز بھرّا گئی۔

"کہاں لے جاؤ گے اُسے ۔۔۔؟"

"واپس اپنے گاؤں ۔۔۔" اُس نے اسی طرح کہا۔

"لیکن رادھا رانی تو اب یہاں نہیں ہے ۔۔۔" میں صاف جھوٹ بولا۔

"کیا ۔۔۔؟" پرمیشر سنگھ نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن اُٹھائی

"ہاں ۔۔۔" میں نے آنکھیں جھکا لیں "دو ہفتے ہوئے وہ یہاں سے چلی گئی ۔۔۔"

"کہاں ۔۔۔؟" اس کی آواز ٹوٹ کر بکھر گئی۔

"پتہ نہیں ۔۔۔"

"اوہ ۔۔۔!" پرمیشر سنگھ نے اپنا سر جھکا لیا، اور پھر میں نے دیکھا کہ وہ رو رہا ہے اور سسکیوں سے اُس کے شانے کانپ رہے ہیں۔

"پرمیشر سنگھ ۔۔۔" میں نے پکارا

پرمیشر سنگھ نے اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھوں کو پونچھا۔ آہستہ سے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ تیزی سے آگے بڑھ کر چلا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ میں کھو گیا۔

اُس دن کے بعد وہ مجھ سے پھر کبھی نہیں ملا۔ لیکن میں جانتا ہوں۔ وہ آج بھی بھیڑ میں کھویا ہوا ہے، اور ڈھونڈ رہا ہے رادھا رانی کو جسے میں نے چُرانا چاہا تھا۔

اُس رات میں بہت دیر سے گھر پہونچا ۔۔۔ چاندنی کھلی ہوئی تھی اور میرے کمرے کا برآمدہ دھیمی اور ٹھنڈی روشنی سے بھر گیا تھا، ہواؤں میں ایسی خنک مدھم سرسراہٹ تھی جیسے کوئی کسی کے کانوں میں کہہ رہا ہو ۔۔۔

"سو مت جانا ــــ"

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ چاند کے دل میں نیند کا خون ہو گیا تھا۔ اور ساری رات اتنے غرور سے جاگ رہی تھی کہ جیسے کسی کا اعتبار بن کر کسی کا انتظار کر رہی ہو۔

آئے گا ــــ کوئی آئے گا۔

رادھا رانی شاید اپنے کمرے میں سو رہی تھی، اور جب رادھا رانی سو رہی تھی تو پھر کوئی کیسے آئے گا؟ میری محبت جیسے آہٹ بن کر اُس کے دروازے پر دستک دینے لگی ــ

"سو مت جانا ــ" کیا رادھا رانی نے ہواؤں کی آواز نہیں سُنی؟ یکایک میرے دل میں دُور تک کوئی پتھر چبھتا ہوا، کھڑکھڑاتا ہوا اُتر گیا ــ میری آنکھوں میں خواہ مخواہ آنسو آ گئے۔

"جادو کیسے چلتا ہے ــ؟" میں نے رات سے یہ پوچھنا چاہا۔

پتہ نہیں کب تک میں اپنے برآمدے میں کھڑا چاندنی کے گھنے جنگل میں بھٹکتا رہا۔ اور جب میں چونکا تو میں نے خود کو رادھا رانی کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے پایا۔

"کون ــ؟" رادھا کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"میں ہوں ــــ" میری آواز ایسے اُبھری جیسے یہ آواز نہ ہوتی تو ایک جھرنا ہوتی۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ ایک مدھم سوال کی طرح کُھل گیا ــ میں نے دیکھا سامنے رادھا رانی کھڑی تھی۔ مینڈیں بوجھل اور نشے میں دُھت ــ ایک لمحے کے لئے میں نے اسے پتھر بن کر دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی میں یکایک اُس کے کمرے میں گھس گیا، اور پھر وہ چاندنی رات جیسے شراب میں ڈوب گئی، اور میں ایک لمحے میں انسان اور لمحے میں حیوان بنتا گیا۔

"کیا ہے ــ؟" رادھا رانی نے پلٹ کر مجھ سے پوچھا۔

"کچھ نہیں ــ" میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر دیا، اور ایک جھٹکے سے رادھا رانی کو لپٹا لیا۔

"سچ ــ" رادھا رانی نے اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا، اور میری گردن پر اپنا چہرہ رکھتی ہوئی گھبرا کر بولی: "چلے جاؤ جی"

"نہیں ــ نہیں ــــ" میری آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔

"سچ ــ" رادھا رانی میرے بالوں میں انگلیاں کھپاتی ہوئی بولی "مجھے ڈر لگتا ہے ــــ"

"ڈر ــ؟" میں مسکرایا ــ "کس کا ڈر ــ؟"

"تمہارا ڈر ــــ" رادھا رانی ڈوبتی ہوئی بولی ــ "مجھ سے پیار مت کرو ــــ"

"کیوں ــ؟"

"میں بہت بُری عورت ہوں۔ مجھ سے اتنے اچھے بن کر مت ملو کہ کل میں تمہیں چھوڑ کر نہ جا سکوں ــ" رادھا رانی ایک جھٹکے سے الگ ہو گئی۔

"میں تمہیں جانے نہیں دوں گا ــ" میں نے رادھا رانی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"مجھے اب کوئی نہیں روک سکتا ــ" اُس کا لہجہ یکایک بدل گیا۔

"رادھا رانی ۔۔" میں نے پھر اُسے اپنے قریب کر لیا ۔۔ "میں روک سکتا ہوں ۔ میں ۔ میں تم سے شادی کروں گا ۔۔"

"کیا ۔۔ ؟" رادھا رانی چونکی ۔

"میں تم سے شادی کروں گا ۔۔" میں نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے ہالے میں لے لیا ۔

"شادی ۔۔ ؟!" رادھا رانی جیسے پل بھر کے لئے مر گئی ۔ پل بھر کے لئے اس کی آنکھوں میں کوئی کنواری بے قصور عورت گھونگھٹ کاڑھے اُٹھی اور مہندی رنگے ہاتھوں سے اُس خط کو پڑھنے لگی جسے سات سمندر پار سے اُس کے شوہر نے بھیجا تھا ۔

"ہاں ۔۔"

"سچ ۔۔" اُس کے ہونٹ اس طرح لرزے جیسے کسی لڑکی نے آنکھیں کھولی ہوں ، اور پھر یکایک کھل کھلا کر ہنس پڑی ۔ سامنے کے سنگھار دان سے اُس نے پرمیشر سنگھ کی تصویر اٹھائی اور بولی ۔۔ "جانتے ہو یہ کون ہے ۔ پرمیشر سنگھ ۔۔ میں اس کی لاش سے شادی کروں گی ۔" وہ پھر زور سے ہنسی اور تصویر کو سینے سے لگا ئے ہوئی بستر پہ گر پڑی

"رادھا ۔" میری آواز میں وہی بے بسی وہی غصہ آ گیا ۔

"سچ ۔۔" رادھا رانی ایک لمحے کے لئے سنجیدہ ہو گئی ۔۔ "جانتے ہو میں جب سے پیدا ہوئی ہوں پرمیشر سنگھ کی دلہن ہوں ۔۔" وہ پھر ہنس پڑی ۔

"پرمیشر سنگھ ۔" میں مارے جلن کے بے تاب ہو گیا ۔۔ "وہ اب تمہیں کبھی نہیں ملے گا ۔"

"کیا ۔۔ ؟" وہ مسکرائی ۔

"میں نے اُسے تم سے بہت دُور بھیج دیا ہے ۔۔" میرے ہونٹوں پر وہی ہنسی آ گئی جو اُس وقت آتی ہے جب دل رونا چاہتا ہے ۔

"کیا ۔۔ ؟" وہ یکایک سنجیدہ ہو گئی ۔

"وہ کل تمہارا خط لے کر تمہیں ڈھونڈتا ہوا یہاں آیا تھا اور تمہاری کہانی سُنا کر چلا گیا ۔"

"سچ ۔۔" رادھا رانی چیخ اٹھی ۔ اُس کے چہرے پر پسینے کے قطرے پھوٹ آئے ، اور اس کی سانسیں تیزی سے چلنے لگیں ۔

"میں نے اُس سے کہہ دیا کہ تم یہاں نہیں ہو ۔۔"

"سچ ۔۔" رادھا رانی اتنے زور سے چلائی کہ میں دَم بھر کے لئے ڈر گیا ۔۔ "کیوں کہا ایسا تم نے ۔ ؟" رادھا رانی نے یکایک میرے منہ پر تھپڑ مار دیا ۔ "کیوں کہا ۔ ؟" وہ ہانپنے لگی ۔۔ "کیوں کہا ۔۔ ؟"

"رادھا ۔۔" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ۔

"چپ رہو حرامی کے بچے ۔۔" اُس نے میرے منہ پر لگاتار کئی تھپڑ مارے ۔ پھر کمرے سے دوڑتی ہوئی نکل کر اپنے کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا ۔۔

میں بہت دیر تک وہیں کھڑا سوچتا رہ گیا ، اور اس وقت چونکا جب رادھا رانی کی تیز چیخ میرے کانوں میں آئی ۔ میں دوڑتا ہوا باہر نکلا ۔ رادھا رانی میرے کمرے میں بند لگاتار چیخے جا رہی تھی ۔

"رادھا ۔۔" میں نے دروازہ جھنجھوڑ ڈالا ۔۔ "رادھا ۔۔ رادھا رانی ۔۔"

رادھا رانی کی چیخیں اور تیز ہو گئیں ۔

"دروازہ کھولو رادھا رانی ـــ" میں نے دروازے کو اپنی پوری قوت سے پیٹتے ہوئے کہا ـــ رادھا ـــ"

"پرمیشر ـــ" رادھا رانی زور سے چیخی۔

اور میں نے جانے کے لئے دروازہ توڑ ڈالا ـــ اور پھر میں نے دیکھا، رادھا رانی کے سر سے پیر تک آگ لگی ہوئی تھی، اور وہ اپنے دونوں ہاتھ کسی بازی کی طرح پھیلائے کمرے میں چاروں طرف چکر لگا رہی تھی۔

"رادھا ـــ" میں اپنی پوری قوت سے چلّایا۔

رادھا رانی اسی طرح ڈگمگاتی ہوئی بہت تیز دوڑتی ہوئی دروازے سے باہر نکلی۔ سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر اُس نے آخری بار پرمیشر سنگھ کو آواز دی۔ اور پھر لڑھکتی ہوئی نیچے تک چلی گئی۔

میں اپنی ساری زندگی کھو کر حیرت سے نیچے دیکھتا رہ گیا جہاں رادھا رانی کی چتا جل رہی تھی۔ وہ زمین پر چت پڑی تڑپ رہی تھی اور اُس کا سارا بدن جل رہا تھا۔

پھر بہت دیر بعد جب میری گلی کے سارے لوگ میرے گھر میں آگئے۔ اور جب اسپتال کی گاڑی آگئی، اور جب ایک پولیس انسپکٹر آگیا تو میں نے دیکھا وہ رات چور کی طرح رادھا رانی کا خون کر کے بھاگ گئی ہے۔ اور دُور آسمان کے سینے سے خون اُبل رہا ہے۔ میں نے اپنی بجھی ہوئی آنکھوں سے رادھا رانی کو دیکھا۔ اس کے جسم کی تمام جلد جل کر اور کالی ہو کر اُدھڑ گئی تھی۔ اور اندر سے سفید چربی جھانک رہی تھی۔ اُس کی بھنویں، اُس کی پلکیں اور اُس کے لانبے گھنے بال جل گئے تھے، اور اُس کے ہاتھوں اور پیروں کی اُنگلیاں مُڑ کر، اکڑ کر بھیانک ہو گئی تھیں۔

"رادھا رانی ـــ" میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا ـــ کیا یہ وہی رادھا رانی ہے جس سے میں نے پیار کیا تھا؟ کیا یہ وہی حسن ہے جسے پاندلپو ہر رات آکر ڈھونڈا کرتی تھی؟ ـــ کیا یہ وہی آرزو ہے جس کے لئے زندگی نے بیراگ لیا تھا؟ ـــ نہیں ـــ نہیں!

اسپتال کی گاڑی پر چڑھانے سے پہلے پولیس انسپکٹر نے رادھا رانی پر جھکتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

"تم نے خودکشی کیوں کی ـــ؟"

رادھا رانی نے اپنی بے نور آنکھیں بڑی مشکل سے کھولیں اور بولی ـــ

"میں نے خودکشی نہیں کی ـــ"

"پھر ـــ؟" انسپکٹر اپنی جیب سے نوٹ بک نکالتے ہوئے بولا۔

"مجھے ـــ" رادھا رانی کی آواز ڈوبنے لگی ـــ "مجھے جلایا گیا ہے ـــ"

"کس نے جلایا ہے تمہیں ـــ؟"

اُس نے پھر پوچھا۔

رادھا رانی نے مڑ کر میری طرف دیکھا ـــ اور میں سر سے پیر تک کانپ کر رہ گیا ـــ اُس کے ہونٹوں پر ایک بھیانک مسکراہٹ آئی ـــ

"پرمیشر سنگھ نے ـــ" اُس نے آہستہ سے کہا، اور مر گئی۔

فراق گورکھپوری

جس قدر تیری یاد آتی تھی — تجھ کو مجھ سے چھپائی جاتی تھی
تیری یادوں سے خلوتِ غم میں — تیرگی اک کنول جلاتی تھی
میرے ماتھے کی اک شکن دمِ نزع — درد کی انتہا بتاتی تھی
کبھی غفلت سرائے دنیا میں — زندگی ہوش میں بھی آتی تھی
کشفہائے نوائے عشق نہ پوچھ — غم کی تقدیر کھلتی جاتی تھی
ہم تھے سلجھانے عقدۂ غم کو — اور گتھی الجھتی جاتی تھی
نوجوانی مہکتی کلیوں کی — جسمِ رنگیں میں کسمساتی تھی
سیرِ نقش و نگارِ فطرت سے — تیری تصویر یاد آتی تھی
لبِ رنگیں میں لفظ لفظ کے ساتھ — پنکھڑی سی نکلتی آتی تھی
وہ نظر مدبھری فضاؤں میں — سرخ ڈورے سے ڈال جاتی تھی
اک غریب الدیار کو سرِ راہ — بے کسی راستہ دکھاتی تھی
وہ بھی کیا دن تھے جب نسیمِ سحر — تیری زلفوں سے ہو کے آتی تھی
سر سے پا تک دمکتے پیکر میں — چاندنی رات رسمساتی تھی
کتنی دلکش تھی داستانِ حیات — یوں تو رُودادِ بے ثباتی تھی

خامشی رات کی فراق اکثر
میرے اشعار گنگناتی تھی

جمیل مظہری

یہ کس نے رخ سے نقاب الٹی کہ شمع احساس جھلملائی
نظر کے سارے طلسم ٹوٹے عقیدے دینے لگے دہائی
یہ سارے دنیا کے قید خانے سبھی ہیں اک سلسلے کے قیدی
کسی کی زنجیر آہنی ہے کسی کی زنجیر ہے طلائی
یہی ہے جب روشنی کی یورش تو پھر اندھیرے کی کیا شکایت
نہ پہلے دیتا تھا کچھ سجھائی نہ اب بھی دیتا ہے کچھ سجھائی
کسی کی آنکھوں میں سرمہ کھینچا کسی کی آنکھوں میں دھول جھونکی
ادھر بگولے ادھر بگولے یہ کیسی وحشت نے خاک اڑائی
جو تھا اس برگ پر ذرا سی شبنم تمہاری کرنوں نے وہ بھی پی لی
غرض کہ چمکے بھی بن کے سورج تو پیاس ذرات کی بڑھائی
اک آہ پیچیدہ و تپیدہ زمیں کے سینے میں ناکشیدہ
نہ جانے کیونکر ہوئی دمیدہ کہ پھوٹ کے گل بن کے مسکرائی
دماغ کی تیرگی بڑھا دی ضمیر کی شمع بھی بجھا دی
تمہارے آنچل نے جی ہوا دی مگر نہ اس دل کو نیند آئی
شکایت باغباں یہی ہے حکایت گلستاں یہی ہے
زبان مانگی تھی برگ گل نے ملی ملی وہ بھی رسمسائی
گرا دیا تخت نے جو تم کو تو آؤ اپنی جگہ پہ آؤ
تمہیں چٹائی کو بھول بیٹھے تھے تم کو بھولی نہیں چٹائی
ابھی تو تھا مظہری کے دل پر اک انفعالی سکوت طاری
یہ کس نے تاروں پہ رکھ دی انگلی کہ ساز کی روح جھنجھنائی
ہے کیا دل غم طراز اپنا انہیں کی بخشش گداز اپنا
نہ سوز اپنا نہ ساز اپنا جمیل کیسی غزل سنائی

قمر ہاشمی

عجب موجِ نسیمِ تربیت گلشن سے اُٹھی ہے
یہ جذبِ اندروں کی لے دلِ پُرفن سے اُٹھی ہے

سکوتِ جبر اک خاموش بجلی ہے صداؤں کی
تڑپ کر جب بھی یہ چمکی ہے جان و تن سے اُٹھی ہے

جلایا تھا جو خرمن آگہی کا بے شعوروں نے
نئی فصلِ شعور آور اُسی خرمن سے اُٹھی ہے

طیورِ سوختہ جاں منتظر تھے جس کے مدت سے
وہ موجِ بے قرارِ رنگ و بو گلشن سے اُٹھی ہے

ترے ماتھے کے اس داغِ ریاکاری سے بہتر ہے
جو عصیاں کی جھلک واعظ مرے دامن سے اُٹھی ہے

ہوا بحرِ عرب کی کم نہیں اپنی لطافت میں
مگر جاں بخش ہے جو تیرے پیراہن سے اُٹھی ہے

ہے اک موجِ سرورِ شوقِ نظارہ قمرؔ صاحب
یہ بجلی جو دمِ دیدار اک چلمن سے اُٹھی ہے

سیّد حرمت الاکرام

گذرتے لمحوں کے ہر پیچ و خم میں ڈھلتی ہے
یہ زندگی مرے خوابوں کے ساتھ چلتی ہے

اُجالے دے نہ سکیں رات کو اماں نہ سہی
مگر اندھیروں کے دامن میں صبح پلتی ہے

دیارِ دل میں جلا جاؤ آ کے شمع کوئی
تمہاری زرفشاں یادوں کی دھوپ ڈھلتی ہے

ہم اہلِ دل ہیں سلامت کہ ہے بنی ہوئی بات
حیات ورنہ سنبھالے سے کب سنبھلتی ہے

چلا ہے قافلۂ دل نجانے کس جانب
قدم قدم پہ نئی شمع بجھتی جلتی ہے

یہ شرط ہے کہ شعورِ نگاہ ہو بیدار
تو یہ زمین بھی لعل و گہر اگلتی ہے

زمانہ اک نئی کروٹ ضرور لے گا مگر
اک آن میں کبھی یہ دنیا نہیں بدلتی ہے

دوام کی ہے طلبگار زندگی کی جو قدر
وہ میری فکر کی نیرنگیوں میں ڈھلتی ہے

اُٹھا کے شہرِ دل و جاں میں سیکڑوں طوفاں
یہ موجِ خوں مری پلکوں پہ کیوں مچلتی ہے

وہ خواہ کچھ نہ سہی لیکن اے حسین خوابو!
تمہارے واسطے دل سے دعا نکلتی ہے

یہ زندگی کہ ہے کب سے بسا فرانہ رواں
سنبھل کے گرتی ہے گر کر کبھی سنبھلتی ہے

کہیں سے ڈھونڈھ کے لاؤ خلوص کی شبنم
یہ کیسی آگ ہے جس میں حیات جلتی ہے

چلو، ستارا کوئی توڑ لائیں گردوں سے
نہ شمع جلتی ہے حرمت نہ رات ڈھلتی ہے

خاطر غزنوی

کہہ گئے غم کی داستاں رستے
بن گئے ہیں مری زباں رستے

انتخابِ نظر تھا یہ ورنہ
ہر طرف تھے رواں دواں رستے

راہ و منزل گزیدہ ہیں ہم لوگ
لے چلیں چاہیں اب جہاں رستے

ہم شناسا کہاں ہیں منزل سے
کب ہوئے ہم پہ مہرباں رستے

ہم تلاشِ بہار میں نکلے
لے گئے جانبِ خزاں رستے

جب کبھی ہوتے ہیں ہم شریک سفر
بھول جاتے ہیں کارواں رستے

ہائے وہ لوگ اندھی گلیوں کے
جن کو مل جائیں بے کراں رستے

اب تو خواب و خیال ہیں خاطرؔ
وہ حسیں شہر وہ جواں رستے

حزیں لدھیانوی

رات نے کروٹ بدلی، انساں جاگ رہا ہے
پھیلے ہیں انوار، اندھیرا بھاگ رہا ہے

بُجھ کر گذرو اس کی راکھ کو راکھ نہ سمجھو
جو دیوانہ برسوں جلتی آگ رہا ہے

چاند کا ہالہ سنبل پیچاں کیونکر لکھوں
زلفوں کا خم میرے حق میں ناگ رہا ہے

برکھا رُت میں یاروں نے ملہار بھی گایا
لیکن میرے لب پر دیپک راگ رہا ہے

ہم نے زیست کی خاطر عیش کو چھوڑا جیسے
ہیر کی خاطر رانجھا دنیا تیاگ رہا ہے

ساون کا کچھ حال نہ پوچھو اپنے لئے تو
سرما میں دریا کے لب پر جھاگ رہا ہے

بجلی گر کر اپنا ہی نقصان کرے گی
خرمن کا اب دانہ دانہ جاگ رہا ہے

تمہیدالاسلام سیّد

شامِ غربت کو سحر کہتے ہیں
ہم کہ ویرانے کو گھر کہتے ہیں

روز و شب روح میں تحلیل ہوئے
وقت کو گردِ سفر کہتے ہیں

نو بہ نو پھول کھلاتی ہے بہار
ہم اسے حسنِ نظر کہتے ہیں

نہ یہ آکاش نہ دھرتی ہوگی
سہمے سہمے سے کھنڈر کہتے ہیں

کتنی صدیوں کی دکھاتی ہے جھلک
آنکھ کو شیش نگر کہتے ہیں

جسم ہے جیسے مہکتا ہوا پھول
سرخیٔ لب کو شرر کہتے ہیں

ہر قدم کانٹے بچھے ہیں تمہید
ہم اسے راہگذر کہتے ہیں

تابؔ اسلم

ہر جانب سے رنگ برنگے پتھر برسے
جب بھی گذرا ہوں میں تیری راہگذر سے

یہ کس بھولے بسرے خواب کی پرچھائیں ہے
دیتی ہے جو مجھ کو آوازیں چاند نگر سے

ماہ و انجم بن کر چمکا خاک کا ذرہ
کیا کیا نکھرا ہوں میں تیرے حُسن نظر سے

کون سا مہماں خانۂ دل میں رات آیا تھا
لپٹ لپٹ کر روتا ہوں دیوار و در سے

یادوں کے ساحل پر بیٹھا سوچ رہا ہوں
موجِ ہوا کی صورت تم آؤ گے کدھر سے!!

دل سے چل کر موتی پلکوں تک آ پہونچے
لو یہ طوفاں بھی گذرا اب اپنے سر سے

کہتے ہیں اک ہنگامہ ہے بازاروں میں
آؤ تھوڑی دیر کو نکلیں ہم بھی گھر سے

شہر کا شہر نظر آتا ہے بیگانہ سا
جب سے لوٹ کے آیا ہوں میں تابؔ سفر سے

فضیل جعفری

دل، نہ اس طرح سے تڑپا ہوتا
زخم، اگر اور بھی گہرا ہوتا

سخت دشوار ہے راہِ غمِ دل
کاش، یہ پہلے ہی سوچا ہوتا

کتنی آزادی سے چلتے، پھرتے
شہر اگر واقعی صحرا ہوتا

منتظر اُس کے رہا کرتے ہم
جاگتے، سوتے سویرا ہوتا

یا تو دل، یاد بھی کرتا، نہ اُسے
یا تو وہ جان سے پیارا ہوتا

جھوٹ، سچ، لوگوں کی عادت ہی سہی
ہم نے خود اپنے کو سمجھا ہوتا

در و دیوار ڈراتے نہ فضیلؔ
گھر میں اتنا تو اندھیرا ہوتا

صمد رضوی ساز

"سرِّ حقیقت ہاتھ نہ آیا، بھول گئے افسانے بھی[۱]
دیوانے سے دیوانے، فرزانے سے فرزانے بھی"

اہلِ خرد نے اہلِ جنوں کی بات اگر مانی ہوتی
رشکِ ارم بن جاتے کب کے گلشن کیا ویرانے بھی

آؤ کھل کر بات کریں اور زہر کا پیالہ چھلکائیں
ذکرِ سحر میں شامل کب تک راتوں کے افسانے بھی!

تنہا منزل ڈھونڈنے والو کس کو دھوکا دیتے ہو
بات تو جب ہے ساتھ چلیں سب اپنے بھی بیگانے بھی

ہم تو نظامِ دہر بدل دیں عظمتِ انساں کی سوگند
کوئی ہماری بات سُنے تو، کوئی ہماری مانے بھی

دیر و حرم سے منہ موڑے جگ بیت گیا تھا سازؔ مگر
جب سے نظر نے آنکھیں[۲] پھیریں، چھوٹ گئے میخانے بھی

۱؎ فانی
۲؎ نظر حیدرآبادی

منظور ناصری

حریم جاں سے ملے، بزمِ دلبراں سے ملے
تمہارے وصل کے پہلو کہاں کہاں سے ملے

کھٹکتی آئی ہے یوں تیرے گیسوؤں کی مہک
سُراغِ نکہتِ گل جس طرح خزاں سے ملے

نہ تم ملے شبِ وعدہ تمہارے دیوانے
جلا کے مشعلِ مہتاب کہکشاں سے ملے

انہیں بکھیر دیا اہلِ فن کی محفل میں
جو زخم ہم کو ترے سنگِ آستاں سے ملے

بدلنے آئے تھے عنوانِ زندگی کچھ لوگ
یہ اتفاق کہ وہ تیرے رازداں سے ملے

عجب نہیں کہ حوادث کی رہ گزاروں میں
تری نوائے پریشاں مری فغاں سے ملے

بتاؤ ناصری اب ہم انہیں بتائیں کیا
وہ پوچھتے ہیں کہ "یارانِ نکتہ داں سے ملے"

مظفر حنفی

کیوں یقین کر لیں ہم "بولنے ہی والی ہیں"
جب کہ تیری تصویریں سربسر خیالی ہیں
بارہا یہ زنجیریں دوستوں نے ڈھالی ہیں
اور میری فطرت ہے۔ میں نے توڑ ڈالی ہیں
خون صرف کرنے کی بات سوچتا ہوں میں
پھول بھی سوالی ہیں، خار بھی سوالی ہیں
ہم "فضول لوگوں نے" موشگافیاں کر کے
بعض بعض باتیں تو کام کی نکالی ہیں
اب وفا پرستوں سے احتراز کیا معنی؟
آپ کی ادائیں بھی واقعی نرالی ہیں
"کج کلاہ بننے کا" شوق ہو تو ایسا ہو
پگڑیاں ہزاروں کی آپ نے اُچھالی ہیں
ڈھیل دے رہا ہے وہ "تاکہ خوف مٹ جائے"
کور مغز یہ سمجھے "بندشیں ہٹا لی ہیں"
کون روک سکتا ہے۔ کم نظر کہوں گا میں
دیکھتا رہا ساقی، پھر بھی جام خالی ہیں
آپ کے مظفر نے زندگی کو برتا ہے
اس لئے مظفر کے شعر بھی مثالی ہیں

انور محمود خالد

میں ہوں اور رات بھر کی تنہائی
اک اذیت ہے گھر کی تنہائی

چاندنی میں سلگ سلگ اٹھی
آج ہر بام و در کی تنہائی

تو نہیں ہے تو کس طرح کاٹیں
زندگی کے سفر کی تنہائی

ہم کو ڈستی رہے گی رہ رہ کر
دور تک رہگذر کی تنہائی

ایک دو پل تو کوئی کاٹ بھی لے
اور جو ہو عمر بھر کی تنہائی

رات تو رات تھی مگر اللہ
ہائے وقت سحر کی تنہائی

نجیب احمد

دل کے دروازوں سے جو ٹکرائے گی
تیری یادوں کی ہوا کہلائے گی

کیا خبر تھی مثل بوئے گل کبھی
تو مرے دل سے جدا ہو جائے گی

دامن دل کو کشادہ کیجئے
پیار کی خوشبو سمٹ کر آئے گی

پھر نہ روشن کیجئے دل کے چراغ
غم کی آندھی تیز تر ہو جائے گی

چاند کے رتھ سے اتر کر چاندنی
کون جانے کس نگر کو جائے گی

منتظر ہوں اب بھی ان لمحات کا
جب تمنا پھول بن کر آئے گی

رات کے گہرے سمندر میں نجیب
جو کرن اترے گی گم ہو جائے گی

ہنس راج رہبر

پروفیسر رشید احمد صدیقی

ادب کا تو ذکر ہی کیا، زندگی کے کسی بھی میدان میں شاید ہی کوئی ایسا ذہین اور طباع فن کار ملے جس نے شہرت سے قطعاً دامن کشی کی ہو، اور گوشۂ گمنامی کو عزیز رکھا ہو۔ لیکن اردو ادب کے پاس ایک ایسا گوہر آبدار موجود ہے جس نے سمندر کی گہرائی کے ایک کونے ہی میں پڑا رہنا پسند کیا ہے۔ میری مراد اردو کے منفرد انشا پرداز پروفیسر رشید احمد صدیقی سے ہے جنہیں عصر حاضر کا عظیم ترین طنز نگار اور مزاح نگار مانا جاتا ہے۔

رشید احمد صدیقی سنہ ۱۸۹۶ء میں مڑیاہوں ضلع جون پور کے ایک متمدن شریف اور وضع دار مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ایک برہمن سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، اس طرح انہیں گاؤں کے مندر میں آمد و رفت کے بھی کئی مواقع ملے۔ انہوں نے رواج زمانہ کے مطابق چھوٹی ہی عمر میں ناظرہ قرآن پاک پڑھا اور رامائن اور مہابھارت کا مطالعہ کیا۔ اس طرح مختلف مذاہب کے لئے ان کے دل میں رفاقت پیدا ہوئی۔ یہ اسی مذہبی رواداری کا کرشمہ ہے کہ ان کا قلم کتنی ہی بے باکی سے کیوں نہ چل رہا ہو، ان کا موڈ کتنی ہی خوفناک راہ پر کیوں نہ ہو ان کے قلم سے ایک بھی لفظ ایسا نہیں نکلتا جس سے کسی کے نازک عقیدے کو ٹھیس پہونچتی ہو۔ اس ضمن میں وہ اردو اور فارسی کے روایتی مزاح سے بہت دور نظر آتے ہیں جس کا طرۂ امتیاز ہی دوسرے عقائد کا تمسخر اڑانا رہا ہے۔

جون پور کی جن گلیوں میں رشید احمد صدیقی کا بچپن گذرا، وہ گلیاں ایک واضح ثقافتی وراثت کی مظہر تھیں۔ ان گلیوں میں مقامی شعرا کے تازہ اشعار گونج رہے تھے۔ یہ گونج رشید کے کانوں سے ہوتی ہوئی ذہن میں اتر گئی، اور سنہ ۱۹۱۵ء میں علی گڑھ جانے سے قبل آپ اردو اور فارسی کے کلاسیکل شاہکاروں کی جی بھر کر خوشہ چینی کر چکے تھے اور خود بھی اچھا لکھ لیتے تھے۔

رشید کو کرکٹ سے والہانہ لگاؤ تھا، اور یہی محبت انہیں علی گڑھ کھینچ کر لائی، اور خرابی صحت کے باوجود آپ مختلف کھیلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ آپ کھیل کو زندگی سے ایسا نعرانہ عقیدت سمجھتے تھے کیوں کہ کھیل کے میدان میں ہار یا جیت کی اہمیت کچھ نہیں رہتی اسی اسپورٹس مین اسپرٹ اور اپنی علمی وسعت کے سہارے انہوں نے کالج کا زمانہ زندگی کی کوتاہیوں پر قہقہے لگا کر گذار دیا۔

یہ رشید کی خوش قسمتی تھی کہ بیسویں صدی کے اولین بیس برس ہندوستان میں اہم تاریخی واقعات سے بھرپور تھے۔ پہلی جنگ عظیم، تحریک عدم تعاون، علی گڑھ تحریک، واردھا اسکیم اور مسلم لیگ کا ظہور اس دور کے اہم واقعات ہیں۔ یہ دور سرکردہ ہستیوں کا دور تھا، جن کا بالعموم مقام علی گڑھ تھا اور یا وہ اکثر علی گڑھ آیا کرتے تھے۔

رشیدان سے متاثر ہوئے۔ آپ نے اس دور کے چند نئے ابھرتے ہوئے ستاروں کی طرف بھی رجوع کیا۔ جن میں ذاکر حسین، اقبال سہیل، آغا حیدر حسن بھی شامل تھے۔ یونیورسٹی میں ادب، سیاست اور زندگی کے ہر گوشے میں طلبا کے نئے لیڈر روح رواں کی حیثیت کے حامل تھے۔ رشید کے اندر کا فن کار ان کی قربت سے بہت متاثر ہوا۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اردو کو بوسویل مل گیا۔ بوسویل نے سموئل جانسن کی داستان حیات لکھ کر اسے زندۂ جاوید کر دیا اور انگریزی ادب کو ایک انمول گوہر عطا کیا

اسی طرح ذاکر اور سہیل کے خاکے اتار کر رشید نے انہیں غیر فانی بنا دیا، اور اردو ادب کا سر اونچا کیا۔ ان خاکوں میں انہوں نے اپنے دور کی جیتی جاگتی اور صحیح تصویر پیش کر دی۔

> علی گڑھ اُن دنوں کلاسیکی مزاج، نفیس آداب اور ذہنی وسعت کا گہوارہ تھا
> زندگی کو گہری نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن اس نظر میں مایوسی یا دل شکنی نہیں تھی،
> بلکہ اس نظر کے سامنے ایک عظیم مقصد تھا۔ طلبا کو ملک کی فلاح و بہبود میں اپنے کردار
> کا احساس تھا۔ وہ زندگی کی ہر اچھی قدر کو خندہ پیشانی سے اپنا زیور بنا لیتے تھے
> اور افراد اور ان کی نیتوں پر کچھ طنزیہ اور حقیقی نظر ڈالتے تھے۔

رشید کی عظمت کا راز ان کے ان خاکوں میں پنہاں ہے جو اپنے وقت کے سرکردہ افراد کے متعلق ہیں، اور ان واقعات کے بیان میں ہے جو اس دور میں ظہور پذیر ہوئے۔ آپ کی نگارشات اس بات کا ثبوت ہیں کہ انہیں اپنے موضوع سے بے پناہ دلچسپی ہے۔ ذاکر صاحب یا سہیل، گاؤں کا کوئی پٹواری ہو یا کوئی معمولی مزدور، وہ اپنے موضوع سے پورا پورا انصاف کرتے ہیں۔

سہیل کا ذکر آتے ہی نظروں کے سامنے ایک تصویر گھوم جاتی ہے:۔

> پانوں کی ڈبیا ہاتھ میں، پیک منہ میں، اور اس کے دھبے شیروانی پر
> ..... چار برس کالج میں رہے۔ بورڈر تھے، لیکن تمام زمانہ دوسروں کے
> کمروں پر گزارا۔ دن کا تو کیا ذکر، رات ہوئی، جس کمرے میں ہوتے، وہیں رات
> گزار دیتے۔ اب کمرے والے کو یا تو شعر سنا رہے ہیں یا اُس کے لئے کوئی نظم لکھ
> رہے ہیں۔ یا اُس کو اقتصادیات، فلسفہ، تاریخ، الٰہیات، فارسی، عربی شعر
> و شاعری پر لیکچر دیتے ہوئے، ورنہ پھر آم، پان، زمینداری، مذہب، عورتوں
> کی اقسام، مردوں کے امراض، مسلمانوں کے انجام پر خطبہ دیتے دیتے، زائد
> چارپائی کا انتظام ہوا تو خیر، ورنہ کسی کے ساتھ اس کی چارپائی پر شکن بستر
> ہو جاتے۔

> مولانا اور ان کے حریف میں گلنپ ہونے لگی۔ حریف نے آخر اس
> اعتراض پر بحث ختم کرنی چاہی کہ دونوں امیدوار احمق۔ مولانا نے برجستہ فرمایا
> "تو جناب میرا احمق کیوں نہ ووٹ پائے؟"

امیدوار کا انتخاب اکثر ذوق نظر کے ماتحت کرتے۔ اس کے بعد ہو گیا

شروع ہوتا۔ مشاعرہ ہوتا تو غزل تیار کر دیتے۔ تقریر ہوتی تو تقریر لکھ دیتے۔
روپے کی ضرورت ہوتی تو اس سے بھی دریغ نہ کرتے:

جو حضرات ذاکر حسین کو جانتے ہیں وہ رشید صاحب کے خاکے کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ شخصی خاکوں کے علاوہ انہوں نے واقعات اور حکایات کے بھی خاکے کھینچے ہیں۔

"اوپر کا کھیت، بظاہر ایک عام کھیت کی تصویر پیش کرتا ہے لیکن حقیقی معنوں میں، یہ پورے ہندوستان کا نقشہ ہے:-

> اس کھیت کا اپنا ایوان ہے جس کے اراکین ہیں۔ کھیت میں جو لوگ
> آتے ہیں وہ بحث مباحثہ کرتے ہیں، لیکن ایسی باتوں پر جو مفید ہونے کے بجائے
> نقصان رساں ہیں۔ یہ کھیت ایسا مقام بھی ہے جہاں دیہی جھگڑے جنم لیتے
> ہیں، اور دفن کر دیئے جاتے ہیں۔ یہاں لوگ سکھ کا سانس لینے بھی آتے ہیں اور
> دہکتے ہوئے انگارے بھی چھوڑتے ہیں۔ دوسروں سے متعلق اسکینڈل گھڑتے
> کرتے ہیں اور خود موضوع اسکینڈل بنتے ہیں۔ قہقہے لگاتے ہیں، جھگڑتے ہیں،
> لیکن پھر بھی ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ کھیت میں ہی شادی کی رسومات ادا کرتے
> ہیں اور موت واقع ہونے پر ماتم کرتے ہیں۔"

رشید صاحب کبھی تو گاؤں کے نمائندوں کو ایک کھیت میں جمع کر دیتے ہیں، اور کبھی اس کو ہماری نظروں کے سامنے یوں گھماتے ہیں کہ پورے ہندوستان کا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ آپ کا مرشد (ذاکر حسین) ایک ایسی چلتی پھرتی مشین ہے جو ایک شمالی ہندوستان کی ریل میں پورے ملک کا سفر کرتی ہے۔ جس میں مارواڑی عورتیں تھوکتی اور سوتی ہیں۔ جس میں لوگ اپنے "...." کو فسود وغل کرنے کا لائسنس سمجھتے ہیں

اس طرح پوری انسانی زندگی ہماری نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ یہ زندگی جیتی جاگتی معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ رشید صاحب ایک رفن کی طرح اس میں مختصر قصے کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ مختصر اور پُرمعنی فقرے استعمال کرتے ہیں۔ کبھی کبھی طویل فقرے بھی استعمال کرتے ہیں جن سے ان کے اسلوب بیان میں رنگینی اور رعنائیت پیدا ہوتی ہے۔ دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے ان حصوں میں کلاسیکی شہ پاروں سے اقتباسات بھی شامل کئے جاتے ہیں۔

وہ زندگی کے ٹھوس حقائق ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ خود نتیجے نہیں نکالتے بلکہ ایک طرف کھڑے ہو جاتے ہیں۔ منظر سے پردہ اٹھتا جاتا ہے۔ کہیں قدیم اور جدید کا ٹکراؤ ہے۔ کہیں ایسی قدیم روایات ہیں جو ہندوستان کو آگے بڑھنے سے روکے ہوئے ہیں۔ کہیں وہ توہمات اور رسم و رواج جن کو غلط طور پر مذہبی عقائد کا نام دیا جاتا ہے۔

> "شباب اور مفلسی کا اجتماع اتنا ہی بے کیف ہے جتنا بے مرچوں کا سالن
> یا بے تمبا کو کا پان۔ مانا کہ مرچ اور تمباکو مضر صحت ہیں لیکن تندرستی کا مطلب
> تحفظ تندرستی نہیں بلکہ لطف اندوز ہونا ہے..... شباب اور پیری دونوں
> حالات منتظرہ ہیں۔ ایک کا مقصود انتشار، دشمن ایمان و آگہی، یا رہزن تمکین و ہوش

ہے۔ دوسرے کا ....؟"

ہلکے پھلکے طنز و مزاح کے حامے میں وہ بڑے کام کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ انسان بنیادی طور پر نیک ہے۔ ان کا مقصد ہے کہ اس انسان کے ذہن کو دنیا کی اُلجھنوں سے بری کیا جائے۔ وہ حساس تو ہیں لیکن جذباتی نہیں ہیں۔

"چوپالوں اور ایوانوں کی تعمیر دولت اور مشین سے ہوتی ہے۔ یہ ایک لمحہ میں تعمیر ہوتے ہیں، اور اپنے تعمیر کرنے والوں کی دولت اور حُسن کی مانند ایک لمحہ میں فنا ہو جاتے ہیں۔ جھونپڑا نسلوں کی تعمیر ہے اور نسلوں کے فنا ہونے کے بعد بھی قائم رہتا ہے:

رشید صاحب کے الفاظ اور خیالات دونوں میں طنز ہے۔ اندازِ بیان اور موضوع میں یکسانیت ہے۔

رشید کی نگارشات میں مقامی رنگوں کی آمیزش بکثرت ہے۔ لیکن اس سے قاری کی دلچسپی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بشرطیکہ وہ اپنی ادبی روایات سے بخوبی واقف ہو۔ رشید مزاح نگاروں کے مزاح نگار ہیں۔ اُن کی یہ خصوصیت کسی حد تک ان کے گوشۂ تنہائی میں رہنے کے لئے جواز پیش کرتی ہے۔ لیکن جُوں ہی قاری اُن کے اسلوبِ بیان کے راز کو پالیتا ہے اور اُن کے خلوص پر ایمان لے آتا ہے اُس پر رشید کا جادو چل جاتا ہے۔

رشید کو موضوع کا آغاز کرنے میں ملکہ حاصل ہے۔ اور جس طرح وہ اس آغاز سے موضوع کی تشریح کرتے ہیں وہ اُن کا ہی حصہ ہے۔ اُن کے ابتدائی جملے معنی کے بھرپور خزانے ہوتے ہیں۔ حرفِ اوّل سے ہی قاری مضمون میں کھو جاتا ہے اور آخری لفظ تک اسی دنیا میں محو رہتا ہے۔ اس درمیان میں رشید صاحب قاری کو کبھی اِدھر کبھی اُدھر، کبھی یہاں کبھی وہاں لئے پھرتے ہیں، اور قاری اُن کے جادو کے زیرِ اثر کھنچا چلا جاتا ہے۔ ان بے ربطیوں میں جو حُسن ہے اُس تک شاید آل احمد سرور اور اسلوب احمد کی نظر نہیں پہونچ سکی انہیں بے ربطیوں پر تو رشید صاحب کو قدرت حاصل ہے۔ وہ بے ربطیوں کے ماہر ہیں یہی اُن کا آرٹ ہے۔

رشید کے بیشتر خاکوں میں اسلوبِ بیان، بات چیت اور گفتگو کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے۔ وہ آپ اپنے کرداروں کو مختلف حالات سے دوچار کراتے ہیں۔ کردار ان مناظر سے گذرتے ہیں۔ اور اپنی خصوصیات واضح کرتے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض بھلے معلوم ہوتے ہیں اور کچھ بُرے۔ پورے خاکے میں قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ کبھی کوئی کردار بات چیت کرتا ہے۔ کوئی اِدھر اُدھر گھومتا ہے۔ کوئی بحث کرتا ہے۔

اردو ادب میں ڈائیلاگ لکھنے اور خاکہ کشی کے فنوں کو رشید نے پایۂ تکمیل تک پہونچایا ہے۔ رشید اپنے فن میں اکبر اور فرحت اللہ بیگ سے آگے نکل گئے ہیں۔ ان کے ہاں ایک بھی اقتباس بھونڈا نہیں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فلاسفر مزاح میں گفتگو کر رہا ہے۔ یہ فلاسفر اپنے گرد کی زندگی سے پوری طرح واقف ہے۔ اور چاہتا ہے کہ ہم بھی اسے دیکھیں اور اس سے لطف اندوز ہوں۔ لیکن دنیا اور انسان پر ہمارا یقین متزلزل نہ ہونے پائے۔

بقلم خود

تلوک چند محروم

مجھے اپنی شاعرانہ زندگی کا جائزہ لینے کا خیال آیا، تو تصور مجھے بچپن کے ماحول کی طرف لے گیا۔ آج سے ستر برس پہلے پچیس تیس خس پوش گھروں کا ایک گاؤں میں سرسبز کھیتوں کے درمیان، دریائے سندھ کی ایک شاخ کے کنارے میرے بچپن اور لڑکپن کا زمانہ گذرا۔ اس سرزمین کے قدرتی مناظر نے مجھ پر بہت اثر کیا۔ میں ان میں اکثر کھو جاتا، یا دل میں ایک بے نام سی اُمنگ پیدا ہوتی۔ ساون بھادوں میں جب دریا چڑھاؤ پر ہوتا تو میرے دل میں بھی ایک عجیب سا تموج برپا ہوتا۔ گویا شعر کہنے سے پہلے طبیعت شعرگوئی کے لئے تیار ہو رہی تھی۔

مجھے سات سال کی عمر میں اسکول میں بٹھایا گیا۔ اس زمانے میں اردو نصاب کا بیشتر حصہ مولوی محمد حسین آزاد کے قلم سے نکلا ہوا تھا۔ پرائمری درجوں ہی میں مجھے آزاد کے دلکش طرزِ بیان سے اُنس ہو گیا۔ کیا نظم اور کیا نثر، دونوں میں شیر و شکر کا مزہ ملنے لگا۔ اسی دور میں ایک منظوم کتاب "قصص مجموعہ" کے نام کی کہیں سے ہاتھ آ گئی۔ اس میں چند قصے سہل زبان اور آسان وزن میں تھے — انہیں بار بار پڑھنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ خود بخود زبان پر موزوں مصرعے آنے لگے۔ اور غلط سلط اور درست اوزان میں چھوٹی چھوٹی نظمیں ہونے لگیں۔ ابتدا میں وزن کا غلط نہ ہونا موزونیٔ طبع کی دلیل ہے۔ لیکن زبان پر قدرت حاصل کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔ میری مادری زبان اردو نہیں، ملتانی ہے — وہ زمانہ تو دُور رہا — مجھے آج پچھتر برس کی عمر میں یہ دعوےٰ نہیں کہ اردو زبان پر مجھے پوری قدرت حاصل ہے۔

زبان کے معاملے کو یہیں چھوڑ کر اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ پرائمری کا امتحان پاس کر کے مڈل میں داخل ہوا، اور چھٹی ساتویں جماعتوں میں اردو اور فارسی میں خاصی دلچسپی لی۔ اردو کورسوں میں شعرائے قدیم و متاخرین میر، سودا، غالب، مومن، وغیرہ کے کلام کے علاوہ شعرائے جدید مثلاً حالی، آزاد، اصغر، اسماعیل میرٹھی کا کلام بھی موجود تھا۔ میری طبیعت دونوں سے متاثر ہوئی۔ مضمون نویسی کی مشق میں اپنے اشعار اور نظمیں شامل کرتا رہا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں جب ساتویں درجے میں تھا، قیصرِ ہند ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہوا میں نے ایک مسدس کی صورت میں مرثیہ کہا جس کا ایک شعر اب تک حافظے میں ہے ؎

فرطِ غم سے غنچے چپ ہیں گُل گریباں چاک ہیں
نوجوانانِ چمن بھی سر پہ ڈالے خاک ہیں

بقلم خود — تلوک چند محروم

یہ مرثیہ اسکول سے ڈویژنل انسپکٹر آف اسکولز کی معرفت ڈائرکٹر سرشتۂ تعلیم پنجاب تک پہونچا، اور وہاں سے خوشنودی کا پروانہ آیا۔ اس واقعے نے سمند شوق پر تازیانے کا کام کیا۔

اس طرح میری شاعری کی ابتدا بغیر کسی رہبر یا رہنما کے ہوئی۔ بے جا نہ ہوگا کہ اگر یہ عرض کر دوں کہ میں نے کسی اُستاد سے اصلاح نہیں لی۔ ممکن ہے کہ اگر کوئی شاعر ان اطراف میں ہوتا تو میں بخوشی اُس کی شاگردی اختیار کر لیتا۔ لیکن شاعر تو کیا، شعر میں دلچسپی لینے والے بھی مفقود تھے۔

مڈل اسکول کا امتحان پاس کر کے ہائی اسکول میں داخل ہوا تو میرا نام اساتذہ اور تلامذہ میں بطور شاعر مشہور ہو چکا تھا اور مجھے اس پر طفلانہ قسم کا کچھ فخر بھی تھا کیوں کہ اساتذہ کی طرف سے میرے ساتھ امتیازی سلوک ہوتا تھا۔ یہ ہائی اسکول شمال مغربی سرحدی صوبہ کے شہر بنّوں میں تھا۔ زبان یہاں کی پشتو تھی۔ قبائلی لڑکے بھی یہاں تعلیم پاتے تھے، اور ہمارے ساتھ بورڈنگ میں رہتے تھے جب اردو بولنے پر آتے تو "چپل دال" کو "اُبلا دال" کہتے۔ زبان کے معاملے میں کسی کا یہ مصرع میرے حسب حال تھا ؎

دیوانہ چھوڑ آئے ہیں دیوانہ پن میں ہم!

لیکن سرسبزی اور شادابی میں یہ خطہ نہایت دل کش اور دل آویز تھا۔ شاعری کا جو چسکا پڑ چکا تھا، بنّوں کے سبزہ آب رواں اور عمر کے تقاضے نے اس میں کچھ اضافہ کر دیا۔ ان ایام میں کئی تفریحی نظمیں کہیں۔ اور چھوٹی چھوٹی انگریزی نظموں کے ترجمے کئے۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں دسویں یعنی ہائی اسکول کے آخری درجے میں تھا کہ رسالہ "زمانہ" کان پور میں، اور اس کے بعد "مخزن" لاہور میں نظمیں شائع ہونا شروع ہو گئیں۔ منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر "زمانہ" نے اپنے خطوط میں، میرا دل بڑھایا۔ یہیں سے میں نے اپنا کلام محفوظ رکھنا شروع کیا۔ اس سے پہلے جو کچھ لکھا تھا اُس سے مطمئن نہ ہو کر اُسے تلف کر دیا۔

ہائی اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں قومی نظمیں لکھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ اور پنجاب کے بعض اخباروں میں اس نوع کا کلام شائع ہوتا رہا۔ اُس وقت سے آج تک وطن اور حب وطن کے موضوع پر کچھ نہ کچھ لکھتا آیا ہوں جس کا نتیجہ "کاروان وطن" نام کی ایک کتاب ہے جو پچھلے دنوں دہلی سے شائع ہوئی۔

طالب علمی کے اس دور میں رسالہ "زمانہ" کان پور اور "مخزن" لاہور میں سراقبال، سرور جہاں آبادی اور نادر کاکوروی کا کلام شوق سے پڑھتا رہا، اور اس سے متاثر ہوتا رہا۔

اسکول کی طالب علمی کا مرحلہ طے ہوا، تو پون سال کے لئے لاہور کے سنٹرل ٹریننگ کالج میں مدرسی کی تربیت کے لئے داخل ہو گیا۔ یہاں پہلی بار ایک مشاعرے میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا۔ اخبار "صدائے ہند" کے مالک و ایڈیٹر منشی محمد دین اپنے اخبار کے دفتر میں یہ مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے۔ طرحی کلام پڑھا جاتا تھا۔ منشی راج نرائن ارماں دہلوی اسٹیج کے پاس بیٹھے ہوئے مصرعے دہراتے اور اپنے چست فقروں سے محفل کو گرمایا کرتے تھے۔ میرے اس شعر پر انہوں نے بہت داد دی ؎

پلایا محبت نے زہراب غم
جوانی ہماری ہمیں کھا گئی

غالباً اس لئے کہ شعر صنعت تضاد کا حامل تھا۔

سنہ ۸-۱۹۰۷ء کا زمانہ تھا، اور لاہور میں سیاسی تحریک زوروں پر تھی، میں نے بھی کئی قومی نظمیں لکھیں، اور اخباروں و رسالوں

میں شائع بھی ہوئیں۔ لیکن چونکہ لب ولہجہ معتدل تھا۔ اس لئے سرکار کی طرف سے گرفت نہ ہوئی۔ ہاں ایک نظم پر ڈپٹی کمشنر نے رسالہ "آزاد" لاہور کے ایڈیٹر منشی لشن بہارے آزاد کو بلوا کر پرسش کی۔ نظم کا عنوان تھا۔ ؏

اسیرو، کرو کچھ رہائی کی باتیں!

اُنہوں نے نظم کی اُلٹی سیدھی توضیح کر کے خلاصی پائی۔ انہیں دنوں لالہ لاجپت رائے مانڈلے سے چھ ماہ کی جلاوطنی کاٹ کر لاہور واپس آئے۔ لاہور نے ڈی اے وی کالج میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کر کے ان کا خیر مقدم کیا۔ اس تقریب میں میں نے بھی ایک طویل نظم کہی، اور ایجنڈے میں شمولیت کے لئے مہاتما ہنس راج کو پیش کر دی۔ انہوں نے نظم شامل تو کر لی لیکن کئی اشعار خطوط وحدانی میں بند کر دیئے اور فرمایا انہیں نہ پڑھا جائے۔ لیکن جب میں نے پڑھنا شروع کیا تو خطوط وحدانی کو روندتا چلا گیا۔ جب پڑھ کر اسٹیج سے اُترا تو ٹریننگ کالج کے پروفیسر سید محمد حسن مرزا دہلوی نے مجھے بغل میں لے لیا اور فرمایا —

"میں تمہیں اس کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں"

یہ واقعہ بھی میری آئندہ شاعری کے لئے جرأت افزا ثابت ہوا۔

لاہور کے سنٹرل ٹریننگ کالج سے فارغ ہو کر ڈیرہ اسماعیل خاں کے مشن ہائی اسکول میں ملازمت اختیار کر لی، اور زندگی کے نئے میدان میں قدم رکھا۔ ملازمت اور خانہ داری کے فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ مشق سخن بھی جاری رہی اور حسب معمول اخبارات اور رسائل مثلاً ادیب، العصر، زمانہ، مخزن وغیرہ میں کلام چھپتا رہا۔

یہیں سے سنہ ۱۹۱۶ء میں اخلاقی، جذباتی اور نیچرل نظموں کا پہلا مجموعہ موسوم بہ کلام محروم حصہ اول مرتب کر کے شائع کر دیا جس پر ملک کے بیشتر اخباروں اور رسالوں کے علاوہ حضرت اکبر الٰہ آبادی، ڈاکٹر سر اقبال، حضرت کیفی دہلوی، ڈاکٹر سر گوکل چند نارنگ، اور کئی دوسرے شعراء اور ادباء نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اکبر مرحوم نے تو ایک رُباعی بھی براہ راست "زمانہ" کان پور میں شائع کرائی جو اب تک میرے لئے باعث فخر ہے۔ وہ رباعی یوں ہے ؎

ہے داد کا مستحق کلام محروم
لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے اُن کا سخن مفید و دانش آموز
ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دُھوم

اس پر میری طرف سے بطور شکریہ یہ رُباعی اسی رسالے میں شائع ہوئی ؎

طبع موزوں خدائے برتر سے ملی
تاثیر کلام قلب مضطر سے ملی
آیا مجھ کو یقین کہ شاعر ہوں میں
جب داد سخن جناب اکبر سے ملی

پینتیس سال مختلف مدارس اور پندرہ سال کالج، یعنی پوری نصف صدی کی ملازمت کے دوران میں بعض ناخوش گوار حالات اور کچھ ذاتی رنج دہ واقعات پیش آئے۔ طبیعت شروع سے رقت آشنا تھی۔ ان حالات نے میری شاعری میں غم و اندوہ کا عنصر شامل

(باقی صفحہ ۲۱۰ پر)

بقلم خود

شکیلہ اختر

اردل ضلع گیا کا ایک بڑا خوب صورت اور صحت بخش قصبہ ہے۔ اردل کا حسن سون ندی کی مچلتی ہوئی موجوں، اونچے اونچے ریتوں کے ٹیلوں، خوبصورت نہروں، آموں کے گھنے باغوں، تاڑوں کی لمبی لمبی قطاروں اور شیشم اور نیم کے بے شمار درختوں سے وابستہ ہے۔

میں ۲۵ر اگست سنہ ۱۹ ء کو اردل میں پیدا ہوئی۔ سون کا میٹھا پانی اور سون کی مشہور مزیدار مچھلیوں اور رسیلے آموں پر پلتی رہی۔ چمکتے ریتوں پر کھیلتی کودتی، غفور دادا کے مکتب میں ایک دو سال پڑھ کر ۹ سال کی عمر میں پردے کے اندر بٹھا دی گئی۔ زمیندار گھرانوں میں لڑکیوں پر پردے کی قید بہت جلد لگا دی جاتی تھی، اور معصوم بچیاں اپنی حویلیوں کی چار دیواری میں سمٹی سمٹی اور شرمائی شرمائی زندگی گزارنا اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھتی تھیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اسی ماحول میں میری تعلیم کا مرحلہ بھی سر ہوگیا۔ اپنے مکتب کی ایک بات مجھے ہمیشہ یاد آتی ہے، ہمارا مدرسہ بستی کے اندر ہمارے ایک قریبی رشتہ دار کے بہت اونچے برآمدے پر تھا۔ خاندان اور بستی کی بہت سی لڑکیاں وہاں پڑھنے جاتی تھیں ہمارے مولوی صاحب کی اہلیہ بالکل ان پڑھ تھیں، مگر ان کی کئی لڑکیاں اسی مکتب میں پڑھ رہی تھیں۔ ایک دن ہم ساری لڑکیاں تختی پر سرکنڈے کے قلم سے ا ب ت ث کا سبق لکھ رہی تھیں، جب ہم سب نے اچھی طرح لکھ لیا تو ہمارے مولوی صاحب کی اہلیہ نے اچانک بڑے غور سے ہم سب کی لکھی ہوئی تختیوں کو دیکھا اور بڑے یقین کے ساتھ بولیں کہ سب لڑکیوں سے شکیلہ نے بہت اچھا لکھا ہے، یہی لڑکی سب سے اچھا لکھے گی۔

اب جبکہ اس بات کو ایک زمانہ گزر چکا ہے ـــ دادی صاحبہ کی یہ بات میں بھول نہیں سکتی ہوں، اور یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ میری جتنی بھی ہم جماعت تھیں وہ سب کی سب پڑھائی لکھائی کو اس طرح سے بھول چکی ہیں جیسے کبھی پڑھا ہی نہیں تھا، میری زندگی میں اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی پڑھائی کا کبھی کوئی دن نہیں آیا، لیکن میرا گھر علم و ادب کا مرکز تھا، اباجان اور ایا جان دونوں کو ہی ادب اور شعر و شاعری سے گہرا ذوق تھا، اس کے لئے، گھر پر نیرنگ خیال، ہمایوں، ایشیا، تہذیب، عصمت، اور عالمگیر پرچے آتے رہتے تھے، اماں جان کے پاس اشعار کی ایک کاپی تھی جس کو بچپن میں، میں بڑی عقیدت کی نظر سے دیکھا کرتی تھی۔

گھر میں اماں جان بڑی محبت سے بنت نذر الباقر کے ابتدائی مضمون کے وقت یہ ایک نذر سجاد حیدر تک کی باتیں کیا کرتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ عصمت کا کوئی خاص نمبر آیا تھا جس میں محترمہ نذر سجاد حیدر کی ایک تصویر چھپی تھی، اماں جان نے اس تصویر کو بڑے پیار سے فریم کرایا تھا اور ایک زمانے تک وہ تصویر اماں جان کے کمرے میں ٹنگی رہی تھی بس اسی طرح سے ہم بچپن کے دماغ پر یہ اثر پڑ رہا تھا کہ یہ مشہور شخصیت کس طرح سے ہمارے درمیان آ گئی ہے۔

اماں جان کو ادب سے اتنا گہرا لگاؤ تھا کہ وہ لیمپ کی روشنی میں روزانہ رات کو پرچوں میں سے چھے اچھے افسانے ابا جان کو سنایا کرتی تھیں۔ انہیں افسانوں میں سے ایک افسانہ "سرخ جوڑا بھی تھا" جو ایک بنگالی افسانے کا ترجمہ تھا۔ میری عمر اس وقت دس سال سے زائد نہ ہوگی۔ لیکن اس افسانے نے میرے دل و دماغ میں ایک ہل چل سی مچا دی تھی، آج تک میں وہ افسانہ نہیں بھلا سکی ہوں اور اس کا ایک ایک لفظ میرے دل پر نقش ہے۔ (میں تو آپ سے بھی یہ گذارش کروں گی کہ اگر کبھی آپ کو وہ افسانہ "سرخ جوڑا" مل جائے تو ضرور پڑھئے گا) اور مجھے یہ کہنے میں بھی کلف نہیں کہ اس ہی افسانہ کے شدید تاثر نے میرے دل میں افسانہ لکھنے کی تحریک پیدا کی۔

میرا سب سے پہلا افسانہ "رحمت" "ادب لطیف" میں چھپا تھا، یہ ۳۸ء کا زمانہ تھا۔ یہ افسانہ ایک واقعہ تھا جسے میں نے کھیل ہی کھیل لکھ دیا تھا۔ اس سے پہلے میری چھوٹی چھوٹی نظمیں اور نظمیں چھپتی رہی تھیں۔ میں نے اپنا افسانہ "رحمت" جب ادب لطیف میں چھپنے کو بھیجا تو دل ڈر رہا تھا کہ نہ جانے کیسی پھٹکار پڑے گی، مگر جب دوسرے ہی مہینے اڈیٹوریل میں تعریف کے ساتھ میرا افسانہ چھپ گیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اچانک آسمان پر پہنچ گئی ہوں۔ اس کے بعد میں پابندی سے افسانے ہی لکھتی رہی۔

اپنے افسانے ویسے تو مجھکو سب کے سب عزیز ہیں ان کو پرکھنا اور تولنا تو آپ لوگوں کا کام ہے۔ بہت دن ہو ئے میرا ایک افسانہ "گھر یا ویرانہ" نقوش میں چھپا تھا، دراصل وہ میری اپنی کہانی تھی اس لئے مجھے بہت اچھی لگتی تھی، مگر شاید وہ پرانی ہوگئی ہے اسی لئے اب مجھے اپنا تازہ طویل افسانہ "منزل" بہت پسند ہے، میں نے اس پر بڑی محنت بھی کی ہے۔ لیکن میری محنتوں کا صلہ تو آپ لوگوں کی پسندکی صورت میں ملے گا۔ افسانے میں خود سے کبھی نہیں لکھتی ایک تحریک مجھ سے لکھواتی ہے۔

میں نے جب آنکھیں کھولیں تو حجاب اسمٰعیل کے ادب پارے چھپ رہے تھے مجھے ذرا پڑھنے کا سلیقہ آیا تو پھر ان کے افسانوں نے دماغ کو روشنی بخشی، عصمت چغتائی، تسنیم سلیم، صالحہ عابد حسین ہمارے دور کی ہیں، مجھے کرشن چندر، بیدی، منٹو عصمت اور تسنیم کے افسانے بہت پسند ہیں مگر ہماری افسانہ نگاری نے ادھر کوئی خاص ترقی نہیں کی ہے۔ پھر بھی اس کی رفتار سے میں مایوس نہیں ہوں اردو کی مختصر افسانہ نگاری نے پچھلے تیس سالوں میں جو معیار قائم کیا ہے اس کو نبایا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی رسالوں میں بڑے اچھے افسانے بھی مل جاتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ افسانوں کے مجموعے شائع نہیں ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے پورے طور پر جائزہ لینا مشکل ہے ویسے مجھے اردو افسانہ نگاری کا مستقبل بڑا روشن نظر آرہا ہے۔ لیکن مجھے اس کا بڑا افسوس ہے کہ کئی اچھے ادیب فلم کی طرف چلے گئے ہیں اور ہمارا اردو ادب کچھ تہی داماں نظر آنے لگا ہے۔ بھئی اب تو آپ نے بڑے نازک سوالات شروع کر دیئے ہیں۔

میری کمزوریاں ویسے تو بہت کچھ ہیں لیکن جو سب سے بڑی کمزوری ہے وہ یہ کہ میں عام طور پر خواتین کی گھریلو گفتگو سے کترا کر آپ لوگوں کی باتیں زیادہ شوق اور توجہ سے سنتی ہوں کیونکہ کپڑے، زیور اور اس طرح کی چیزوں سے مجھے کبھی کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی ہے۔ اور آپ لوگوں کی گفتگو میں بڑے بڑے مسائل ہوتے ہیں۔ میری یہ کمزوری کئی دفعہ میرے لئے وبال بھی بن چکی ہے۔

میری ناکام تمنائیں بس اتنی سی ہیں کہ لوگ میرے افسانوں کو میرا اپنا لکھا ہوا سمجھا کریں۔ مجھے اس بات کا بڑا غم ہے کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میرے افسانے اختر صاحب لکھ دیتے ہیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اختر صاحب کے لکھنے کا انداز مجھسے بالکل الگ ہے ان کے پاس الفاظ کے ذخیرے ہیں اور میرے یہاں تہی دستی۔ سیدھے سادے الفاظ بس جو دیکھا محسوس کیا، اور اسی کو اپنی گھریلو زبان میں لکھ دیا۔ میں ہمیشہ اختر صاحب سے کہتی ہوں کہ آپ سے شادی کر کے مجھے بڑا نقصان پہنچا ہے ایک تو یہ کہ میری لکھی ہوئی چیزیں میری اپنی نہیں سمجھی جاتیں، دوسرے ذہنی طور پر میں بھی اپنی اڑان اور اونچی نہیں کر سکتی، میری حالت بالکل اس حقیر پودے کی سی ہو کر رہ

گئی ہے جو برگد کے سائے میں مرجھایا سوکھا مارا سا رہتا ہے اور کبھی کبھی کن انکھیوں سے مہان برگد کے درخت کو دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس چپکے سے لے لیتا ہے۔

میری گھریلو زندگی۔؟ بس کچھ نہ پوچھئے یہی لگتا ہے کہ ایک بڑے جنکشن پر کھڑی ہوں اور دنیا بھر کی گاڑیاں ادھر سے اُدھر اُدھر سے ادھر شور مچاتی زمین دہلاتی، روشنی پھیلاتی اور کبھی کبھی آگ اور دھواں بھی بکھیرتی گذرتی جا رہی ہیں۔

لکھنے کے لئے مجھے کسی خاص ماحول اور فضا کی ضرورت پیش نہیں آئی! اگر آپ مجھے افسانہ لکھتے ہوئے دیکھ لیں تو شاید حیران رہ جائیں۔ ابھی دو سال ہوئے اختر صاحب کے بھائی ڈاکٹر محسن ڈھاکہ سے آئے ہوئے تھے؛ اچانک مجھے ایک افسانہ لکھنے کا خیال آگیا بچوں کی کاپی سے کاغذ لئے جو کئی سائز کے تھے، لکھنے بیٹھی، نگاہوں کے آگے سارا افسانہ پھر رہا تھا "لجیا" کو میرے پاس سے گئے بس چند ہی دن ہوئے تھے۔ گھر کے اندر مہمانوں کا ہمیشہ کی طرح ایک ہجوم تھا جن کے ساتھ گھڑی گھڑی مجھے ہسپتال اور پٹنہ مارکٹ بھی جانا پڑتا تھا، باورچی کے ساتھ دماغ کھپا کر نوکروں کو گھر کی صفائی کی تاکید کرتے ہوئے میں نے کسی طرح سے دو تین صفحے لکھے تھے کہ دھوبی آگیا! اسی کمبخت دھوبی کی مجھے کئی دنوں سے تلاش تھی اور وہ کپڑوں کا بڑا سا گٹھر لئے خود ہی آگیا تھا؛ اسے دیکھتے ہی مجھے اپنی وہ عزیز ساری یاد آگئی جس کو ان حضرت نے استری سے جلا کر برباد کر دیا تھا۔ میں افسانہ لکھنا بھول گئی اور ساری کا غم غصہ میں بدل گیا۔ جب میں غصہ اتار چکی تو پھر اچانک "لجیا" یاد آگئی۔ تمتمائے ہوئے چہرے کو پانی سے دھونے کی فرصت بھی کہاں تھی! اسی عالم میں قلم لیکر بیٹھ گئی اور میں آپ سے سچ کہہ رہی ہوں کہ ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا کہ گوالا اپنے دودھ کا حساب لے کر آگیا اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ پٹنہ میں دودھ لینا اور پھر اس نیلے پانی والے جھوٹے دودھ کے سچے دام دینا کتنا کٹھن کام ہے جیسے تیسے اب تک گذر ہو ہی رہی تھی مگر یہ نیا گوالا تو سارے گوالوں سے ڈھیٹ تھا، اس کے یہاں پانی زیادہ اور دودھ کم تھا میں نے بڑے ٹھنڈے دل سے اس کا حساب کیا، دودھ کا حصہ الگ اور پانی کا حصہ الگ کرنا ہی تھا کہ اس کو جیسے چنگاری لگ گئی مگر وہاں تو چنگاری ہی تھی اور مجھ کو تو سچ مچ آگ ہی لگ گئی، خوب گرجی، برسی، اور اس کے حساب کی کاپی پٹک کر گھر کے اندر آگئی۔ غصے سے جسم اب تک کانپ رہا تھا! اپنے کو سنبھالنا چاہا، تو سامنے افسانے کے صفحے ہوا میں پھڑپھڑاتے نظر آئے، سوچا، یہیں امن ہے، اور پھر لکھنے جو لگی گھر میں کھانے، ناشتے اور چائے کے دور چلتے رہے، نوکر ایک دوسرے سے الجھتے رہے، کسی نوکر کو ترکاری کم اور چائے نہیں ملی، لیکن میں۔۔ ان سارے ہنگاموں کے درمیان بیٹھی اپنا افسانہ لکھتی رہی اور جب افسانہ ختم کر کے محسن کو سنا چکی تو وہ حیران ہو کر پوچھنے لگے؛

۔ بھابی اس افسانے میں دھوبی پر آپ کی کڑک، دودھ والے پر گرج اور نوکروں کی ڈانٹ ڈپٹ کا تو کہیں پتہ ہی نہیں چلتا ہے۔ تو بھائی صاحب یہی میرے افسانے کا ہمیشہ سے ماحول رہا ہے، اگر میں پٹنہ میں نہ رہتی تو شاید میں زیادہ توجہ سے اچھے افسانے لکھ سکتی تھی۔ کاش میں اتنے بڑے گھرانے کے چوراہے پر بیٹھ کر افسانے نہ لکھتی۔

میرے مشاغل پوچھ کر آپ گھبرا جائیں گے۔ دھوبی، گوالا، مالی، جمعدار اور گھر کے نوکروں پر مسلسل تاکید کر کر کے کام لینا، ان پر بگڑنا ڈانٹنا، اور جب بھاگ جائیں تو اور زیادہ پریشان ہوتے رہنا۔ روزانہ مہمانداری، تیمار داری، مارکٹنگ، اور سب کے ساتھ خرچ کا جوڑ توڑ کرنا اور سوچ سوچ کر روپے حاصل کرنے کی کوشش کرنا، جب میں ایسی کیفیت میں مبتلا ہوتی ہوں تو اختر صاحب اپنا پرس مجھ سے چھپائے رہتے ہیں، زندگی میں مجھے صرف ایک چیز سے جنون کی حد تک پیار رہا ہے اور وہ پھولوں کا شوق ہے مجھے سبزہ اور پھول بہت پسند ہیں بس انہی کے پیچھے دیوانی بنی رہتی ہوں۔ اگر مجھے یہ شوق نہ ہوتا تو ممکن ہے میں لکھنے کی طرف اور زیادہ توجہ دیتی۔

محبوب اللہ مجیب

بلونت سنگھ

اگر شخصیت کا دوسرا نام خلوص ہے تو بلونت سنگھ اس کی بہترین مثال ہیں۔ لمبا ڈیل ڈول، بڑی لیکن خوش گوار سی داڑھی، سر پر ایک خوب صورت سی دستار، لباس میں جیکٹ اور پتلون، یہ ہیں اردو کے افسانہ نگار سردار بلونت سنگھ، جو رک رک کر باتیں کرتے ہیں، ان کی باتوں میں سادگی بھی ہے اور گہرائی بھی۔

بلونت سنگھ سگریٹ نہیں پیتے لیکن رکشہ کا کرایہ ضرور سے کرتے ہیں، اکثر یہی حادثہ پیش آیا ہے کہ ہم دونوں ساتھ چلے ہیں اور سول لائن میں کافی ہاؤس تک پیدل ہی آگئے ہیں، اور رکشہ والا ہاتھ نہیں آیا۔

ہوسکتا ہے لوگ اسے میلانِ پر محمول کریں لیکن میں نے آج تک اتنے اتھاہ خلوص کا آدمی کم دیکھا ہے۔ اُٹھنے بیٹھنے پڑھنے لکھنے اور بات کرنے میں جتنی باقاعدگی بلونت سنگھ کے یہاں ملے گی اتنی شاید ہی دوسرے ادیبوں میں ملے۔ یہ باقاعدگی ان کے یہاں اس وقت بھی تھی جب وہ "آج کل" اردو کے نائب مدیروں میں شامل تھے اور اسی قدر باقاعدگی اس وقت بھی ہے جب کہ وہ صرف افسانہ نگار ہیں اور ایک عدد ہوٹل کے مالک۔

اتنا ہنس مکھ اور کشادہ دل افسانہ نگار شاید ہی کوئی ہو۔ لکھنے کے علاوہ مطالعے کے بھی شائق ہیں۔ اپنے لکھے ہوئے افسانوں کی بات کم کرتے ہیں اور دوسروں کے لکھے کی زیادہ۔ اردو اور ہندی کے علاوہ دوسری زبانوں کا ادب بھی (خاص طور پر فکشن) وہ کثرت سے پڑھتے ہیں۔ ادھر ایک نوعمر فرانسیسی ناول نگار خاتون کا چرچا بڑے زور شور سے ہوا۔ اس ناول نگار خاتون کا نام فرینک نوسی سیگان (Fronoise Sagan.) ہے۔

اس کے ایک ناول بانجور تریسے (Bangour Tresse) "محبوبہ کو سلام" کو فلمایا بھی جاچکا ہے۔ اس کا یہ ناول پڑھ کر بلونت سنگھ بولے ——!

"صاحب ناول اس طرح لکھا جاتا ہے ——!"

"بات تو ٹھیک ہی ہے" میں بول پڑا۔

"حقیقت تو یہ ہے کہ فرانسیسی ادب برسہا برس کی کاوش کا نتیجہ ہے" بلونت سنگھ کہہ رہے تھے "اس ادب نے "بالزاک" سے لے کر "ژاں پال سارتر" تک پیدا کیا۔ جو ادبی تحریک پیدا ہوئی وہ وہیں سے ابھری۔ ہم لوگ تو صرف ان تحریکوں کی تقلید کرتے ہیں۔"

گہرے مشاہدہ اور مطالعہ کے سہارے بلونت سنگھ نے اپنی کہانیوں کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ "پنجاب"۔ "وارث شاہ"، نواب و شیال کی بستی، اور ہیر رانجھا کی بیوگ و سنجوگ کی نگری ان کے خاص موضوع ہیں۔

پنجاب کی سرزمین، اس کی ہنستی بولتی روایت وہاں کے مسکراتے ہوئے کردار اور وہاں کا رومان آفریں ماحول ان کے دل پر اس طرح نقش ہو چکا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے الگ بھی کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے!

شعری ادب کے لئے پنجاب کی سرزمین سے جس قدر اکتساب احمد ندیم قاسمی نے کیا ہے اتنا ہی کام افسانوی ادب کے لئے بلونت سنگھ نے کر دکھایا۔ پنجاب سے جو کردار بلونت سنگھ نے لئے، وہ "جگا" کے روپ میں لوٹا دیئے بالکل اسی طرح جس طرح احمد ندیم قاسمی نے جہلم اور پنجاب کے ترنم کو سمیٹ کر جلال و جمال کے روپ میں پیش کیا ہے۔

ایک صاحب اس کا ناول "جگا" پڑھ کر فرمانے لگے "کہیں ایسا تو نہیں کہ بلونت سنگھ ڈاکوؤں کی ڈائری پا گئے ہوں؟"

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے اس آدمی کی یہ رائے باتوں ہی باتوں میں ان تک پہونچا دی تھی۔ اور جس طرح وہ اور دوسری باتوں کو مسکرا کر گذر کر جاتے ہیں اپنے پڑھنے والے کی اس رائے کو بھی اسی طرح ٹال گئے۔

ان کی کہانیوں میں جو ایک سب سے بڑی خصوصیت ہے وہ یہ کہ Expression میں کہیں ڈھیلا پن نہیں آنے دیتے۔ پڑھنے والا کہانیوں میں اپنے کو جذب ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے ـــ

> "اتنے بڑے میلے میں ایک عورت کو ڈھونڈھ نکالنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ سکھوں کا میلہ
> ایک برس میں ایک ہی مرتبہ لگتا تھا۔ گرو ارجن دیو جی مہاراج کی یاد میں بڑے بڑے دیوان لگتے
> پنجاب کے دور افتادہ مقامات سے پریمی سکھ جوق در جوق آتے۔ دو دن تو اس جگہ تل دھرنے کو
> جگہ نہ ملتی۔ مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے سبھی جمع ہوتے۔ اتنی بڑی بھیڑ میں بھلا جگمیت سنگھ کا کیا
> پتہ چل سکتا تھا ـــ!" (ہندوستان ہمارا)

کہانیوں میں بلونت سنگھ کے یہاں مخصوص قسم کا مزاح بھی موجود ہے۔ جس میں کچھ لطف کچھ طنز اور کچھ بے باکی کی آمیزش ہے۔ مثلاً ان کی ایک کہانی "ڈاکو" کی یہ سطریں ملاحظہ کیجئے ـــ! اس کہانی میں موجو چودھری کی بیٹی ماکان ہیروئن کی سی حیثیت رکھتی ہے اور نواب اس کا عاشق ہے۔ بھولی بھالی لڑکی پیار کے ترنم کو نہیں سمجھتی تو نواب اسی معصومیت سے اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے ـــ:

> "اری پگلی! تو کان کا مطلب آدمی کا کان ہی سمجھتی ہے۔ کان گدھے کا بھی ہو سکتا ہے
> ہاتھی، بلی سبھی کا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح پہاڑوں کے بھی "کان" ہوتے ہیں۔ ان میں سے نمک
> نکلتا ہے ـــ!" (ڈاکو)

بلونت سنگھ کو میں نے شہرت کے پیچھے بھاگتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ جم کر کام کرنے کے عادی ہیں۔ جس میں کوئی انہیں مات نہیں دے سکتا۔ اچانک ان سے مہینہ بھر تک ملاقات نہ ہو سکی، اور جب ملے تو معلوم ہوا کہ تیرہ سو صفحات پر مشتمل "ہیر رانجھا" ہندی میں منتقل کر چکے ہیں۔ یوپی سرکار ان کے ایک ناولٹ "ایک معمولی لڑکی" پر ڈھائی سو روپے انعام بھی دے چکی ہے۔ بلونت سنگھ سے جو ایک بار ملا وہ ان کے خلوص کو زندگی بھر نہ بھول سکا۔ وہ اپنے دوستوں سے بڑی محبت کرتے ہیں، اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ملاقات کرتے ہیں۔

علی حیدر ملک

مہندر ناتھ

حیدر :- آداب عرض ہے مہندر جی!

مہندر ناتھ :- آداب عرض ہے۔ فرمائیے۔ کیا حکم ہے حیدر صاحب؟

ح :- مہندر جی! سب سے پہلا سوال آپ کی عمر کے متعلق ہے۔ اس لئے یہ بتائیے کہ اس وقت آپ کی عمر کیا ہے یعنی آپ کس تاریخ، مہینے اور سن میں پیدا ہوئے تھے؟

م :- دن اور تاریخ تو یاد نہیں، صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ میں سنہ ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوا تھا۔

ح :- آپ کا وطن اور جائے پیدائش کہاں ہے؟

م :- وطن ہندوستان اور جائے پیدائش بھرت پور۔

ح :- آپ نے کہاں تک اور کن کن اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پائی؟

م :- میں نے ریاست پونچھ میں مڈل تک تعلیم پائی۔ پھر پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کیا۔

ح :- کالج چھوڑنے کے بعد آپ نے کون سا مشغلہ اختیار کیا؟

م :- کافی عرصے تک سوچا کیا کروں، پھر اچانک لکھنے کی طرف رجوع ہوا۔

ح :- آپ کے بھائی اوپندر ناتھ جی عمر میں آپ سے کتنے سال چھوٹے ہیں؟ — وہ ان دنوں کہاں ہیں اور ان کا مشغلہ کیا ہے؟

م :- اوپندر جی مجھ سے بہت چھوٹے ہیں، تقریباً بارہ سال — اوپندر دلی میں رہتے ہیں اور گورنمنٹ سروس کرتے ہیں۔

ح :- آپ نے لکھنا کب شروع کیا؟

م :- اٹھارہ انیس برس ہو گئے لکھتے ہوئے۔

ح :- آپ کو کچھ یاد ہے کہ آپ کی پہلی کہانی کا عنوان کیا تھا، اور یہ کس رسالے میں شائع ہوئی تھی؟

م :- میری پہلی کہانی کا عنوان تھا "ریاضت" جو رسالہ "ساقی" میں شائع ہوئی تھی۔ ان دنوں یہ رسالہ دلی سے نکلتا تھا، اور اس کے ایڈیٹر جناب شاہد احمد دہلوی تھے۔

ح :- آپ نے اب تک کل کتنے افسانے لکھے ہیں؟

م :- تقریباً دو سو افسانے۔

ح :- اور ناول؟

م :- صرف آٹھ۔

ح :- اب تک آپ کی کتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں؟

م :- آٹھ افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور آٹھ ناول۔

ح :- آپ نے کبھی ترجمے کا کام بھی کیا ہے؟

م :- بہت کم۔

ح :- آپ کی تخلیقات کے ترجمے کن کن زبانوں میں ہو چکے ہیں؟

م :- ہندی، گجراتی، مراٹھی، سندھی، پنجابی، تامل اور روسی زبان میں چند کہانیوں کے ترجمے چھپے ہیں۔

ح :- آپ کی واقفیت کن کن زبانوں سے ہے؟

م :- اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی اور پنجابی زبان سے واقف ہوں۔

ح :- آپ کی نظر میں آپ کی بہترین تخلیقات کون کون سی ہیں؟

م :- یہ بتانا بہت مشکل ہے پھر بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دو سو کہانیوں میں چند کہانیاں ضرور زندہ رہیں گی۔ اور وہ یہ ہیں: جہاں میں رہتا ہوں، "اگر میں مر جاؤں تو"، "تنہا تنہا"، اور اسی طرح چند اور کہانیاں۔

ح :- ملکی اور غیر ملکی افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں میں کن کن کو آپ پسند کرتے ہیں؟

م :- میں تقریباً سبھی ادیبوں کو پڑھتا ہوں۔ جن کو پسند کرتا ہوں ان کی ایک لمبی فہرست تیار کرنی پڑے گی۔

ح :- اپنے معاصرین میں آپ کن کن کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں؟

م :- میں کسی کو بھی ناپسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا چاہے وہ ادیب چھوٹا ہو یا بڑا۔

ح :- اردو افسانہ نگاروں کی نئی پود میں کون کون سے نام آپ کی نظر میں اہم ہیں؟

م :- ایک ہو تو گنواؤں۔ جس کا نام چھوٹ جائے گا وہ ناراض ہو جائے گا۔ نئی پود میں اچھے خاصے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے بڑے خوبصورت افسانے لکھے ہیں۔

ح :- کرشن کے فن کا سب سے نمایاں اور اہم پہلو کیا ہے؟

م :- حیدر صاحب! کرشن جی کے فن کے بارے میں ایک کتاب لکھنے کا ارادہ ہے۔ کرشن جی ہندوستان اور پاکستان کے سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ اُن کے فن کے بارے میں دو چار سطروں میں کام کی بات لکھنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

ح :- آپ کے نزدیک ایک اچھے افسانے کی تعریف کیا ہے؟

م :- جو دل اور دماغ پر اثر انداز ہو۔

ح :- کیا اردو افسانہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے؟

م :- جی ہاں! بڑے اعلیٰ اور خوبصورت افسانے لکھے جا رہے ہیں۔

ج :- آپ فلمی دنیا سے کب سے وابستہ ہیں ؟

م :- تقریباً سولہ برس ہوگئے۔

ج :- آپ نے اب تک کتنی اور کون کون سی فلمیں لکھی ہیں ؟ کچھ فلموں کے نام بتائیے۔

م :- میں نے تقریباً پندرہ فلمیں لکھی ہیں۔ چند کے نام یہ ہیں : "ممتا" - "نقلی نواب" - "ممی ڈیڈی" - "مہارانی" - "تاج اور تلوار" "دل کی آواز" اور "اُمید"

ج :- اداکاری کے فرائض آپ نے کن کن فلموں میں انجام دیئے ہیں ؟

م :- پانچ چھ فلموں میں ایکٹنگ کی - دو فلموں "سرائے کے باہر" اور "دل کی آواز" میں بطور ہیرو پیش ہوا - اس کے بعد چند اور فلموں میں کام کیا، مگر یہ پیشہ راس نہ آیا۔

ج :- کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں کہ ترقی پسند تحریک پر زوال آگیا ہے ؟

م :- ترقی پسند تحریک اپنا کام کر چکی۔ جن قدروں کو لے کر یہ تحریک اٹھی تھی وہ آج ہمارے سماج میں رس بس گئی ہیں - آج سے بیس برس پہلے سوشلزم کے نعرے میں ایک جوش و خروش تھا۔ آج سوشلزم کو اپنانے کے لئے زیادہ جوش کی ضرورت نہیں سنجیدگی اور ٹھہراؤ کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ادب میں بھی ان قدروں کو ہضم کرنے کے لئے جذباتی لگاؤ کے علاوہ عقل و دانش کے استعمال کی زیادہ ضرورت ہے۔

ج :- کیا آپ اپنی فلمی زندگی سے مطمئن ہیں ؟

م :- بالکل نہیں - ہر روز ارادہ کرتا ہوں کہ یہاں سے بھاگ جاؤں پھر سوچتا ہوں کہ کہاں جاؤں اور جب کوئی اور جگہ نظر نہیں آتی تو پھر بمبئی میں رُک جانے کا ارادہ کر لیتا ہوں۔

ج :- فنونِ لطیفہ میں آپ کن کن فنون سے دلچسپی رکھتے ہیں ؟

م :- شاعری سے، مصوری سے، موسیقی سے - سچ پوچھئے تو ہر حسین چیز اچھی لگتی ہے - چونکہ فنونِ لطیفہ کا جمالیاتی حس سے زیادہ تعلق ہوتا ہے اس لئے جو فن میری جمالیاتی حس کو زیادہ تسکین پہونچاتا ہے اُس سے ضرور دلچسپی رکھتا ہوں۔

ج :- آپ نے کسی غیر ملک کا سفر کیا ہے یا نہیں ؟ - کیا ہے تو کس ملک کا ؟

م :- ابھی تک نہیں کیا، اور نہ ہی کرنے کا ارادہ ہے - ابھی تک پورا ہندوستان نہیں دیکھ سکا - باہر کے ملکوں کو دیکھ کر کیا کروں گا - یوں ہر ملک کے لوگ ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں - کہیں کہیں رنگ، لباس، زبان، رسمیں بدل جاتی ہیں - جہاں تک بنیادی انسان کا تعلق ہے وہ ہر جگہ بے حد عقلمند اور بے حد بے وقوف نظر آئے گا۔

ج :- آپ کے خیال میں اردو زبان و ادب کا مستقبل ؟

م :- اگر ہمارے حکمرانوں کی اردو کے بارے میں یہی پالیسی رہی تو اردو زبان کا مستقبل بہت تاریک ہے۔

ج :- نذیر احمد اور پریم چند کے متعلق آپ کی ذاتی رائے کیا ہے ؟

م :- میں نے منشی پریم چند کو بہت پڑھا ہے اور نذیر احمد کو بہت کم - منشی پریم چند تو جدید افسانے کے بانی تھے - اُن کے مشہور ناول "گئودان" کو میں اعلیٰ ترین ناولوں میں شمار کرتا ہوں۔

ح :- اردو کے کچھ ایسے نقادوں کے نام بتائیے جنہوں نے آپ کو متاثر کیا ہو۔

م :- سید احتشام حسین، ڈاکٹر محمد حسن، محمد حسن عسکری اور وقار عظیم۔

ح :- اردو کے موجودہ رسم الخط کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ - کیا آپ اسے تبدیل کر دینے کے حق میں ہیں؟

م :- جی نہیں! میں چاہتا ہوں کہ اردو کا موجودہ رسم الخط برقرار رہے۔ یہ ہمارے ملک کی بڑی اہم، پیاری اور خوب صورت زبان ہے۔ اور یہ کہ سیکھنے سے، پڑھنے سے اور بولنے سے ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ بلکہ ہماری تہذیبی زندگی میں ایک نکھار پیدا ہوگا۔ اور اس زبان کے مرنے سے ہم ایک عظیم خزانے کو زندہ دفن کر دیں گے جس کے لئے آنے والی نسلیں ہمیں معاف نہیں کریں گی۔

ح :- اور ہاں! آپ کی شادی آپ کی پسند اور مرضی سے ہوئی تھی یا آپ کے والدین کی پسند اور مرضی سے؟

م :- شادی تو اپنی مرضی سے کی لیکن کوئی تیر نہیں مارا۔ والدین کی مرضی سے شادی کرتا جب بھی شادی ہوتی اور کیا ہوتا۔ یوں عرض کروں کہ اپنے آپ کو چھوڑ کے میں ہر شخص سے مطمئن ہوں۔

ح :- اچھا! بہت بہت شکریہ مہندر جی!

م :- لیجئے علی حیدر صاحب! شکریہ کس بات کا! - آپ نے سوال کئے۔ میں نے جواب دیئے۔ قصہ ختم۔ پھر کبھی ملاقات ہوگی۔

تلوک چند محروم

(صفحہ ۲۰۱ سے آگے)

دیا۔ چنانچہ "گنج معانی" کے دیباچے میں شیخ سر عبد القادر مرحوم نے اس پہلو پر کافی روشنی ڈالی ہے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں میں نے عملاً کسی سے اصلاح نہیں لی۔ ہاں اساتذہ کے کلام پر ضرور نظر رہی ہے۔ اور مولانا حالی، آزاد کی ادبی تصانیف، مولانا شبلی کی "شعر العجم" اور "موازنۂ انیس و دبیر" اور حسرت موہانی، چکبست لکھنوی، آثر لکھنوی، جوش ملسیانی کے ادبی و تنقیدی مضامین سے استفادہ کیا ہے۔

چونکہ ایف اے، بی اے کے امتحانوں میں جو میں نے دورانِ ملازمت پرائیوٹ طور پر پاس کئے، میرا ایک لازمی مضمون فارسی بھی تھا، لہٰذا اس زبان کے شعری ادب سے بھی کچھ واقفیت ہوگئی۔ اور چند غزلیں، رباعیاں اور قطعے فارسی میں بھی کہہ چکا ہوں ــــ نیز ان ہی امتحانوں کے طفیل انگریز شعراء مثلاً ورڈز ورتھ، کیٹس، شیلے، سر والٹر سکاٹ، پوپ اور شیکسپیئر کے جزوی کلام کا مطالعہ بھی کیا۔ اور ان کی کئی نظموں کے اردو نظم میں ترجمے بھی کئے جو میرے مجموعہ ہائے کلام میں شامل ہیں۔ اصغر گونڈوی مرحوم نے شیکسپیئر کی نظم LUENCY کے ترجمے کو کامیاب قرار دیا۔ اور سر اقبال نے کلام محروم حصہ اول میں شمول ترجموں کو پسند فرمایا۔

اب تک میری نظموں کے چھ مجموعے، گنج معانی، رباعیات، کاروانِ وطن، نیرنگ معانی، بہارِ طفلی اور شعلۂ نوا شائع ہو چکے ہیں۔ کلام محروم حصہ اول، دوم و سوم کا کلام بھی ان ہی میں شامل کر دیا گیا ہے ــــ ایسا کلام جو رسالوں میں تو شائع ہو چکا ہے لیکن کتابی صورت میں نہیں آیا، خاصی مقدار میں موجود ہے۔

شمس الرحمٰن
ترجمہ
یونس احمر

بنگلا

اُوٹ سے ......

دریچہ کھلا ہے،
جہاں سے ٹریفک کا بہتا سمندر نظر آ رہا ہے
ہَوا کے تھپیڑے جھگلتے ہیں سینے سے
کھڑکی کے پٹ کو
کبوتر کا جوڑا ہے دنیائے مستی میں سرشار و غلطاں
گلی میں خمیدہ کمر ایک بڈھا
ستاروں سے بھرپور آکاش جیسے ہے جس کے بدن پر
پھٹا کوٹ، جس میں ہزاروں ہیں پیوند
مگر وہ کہ بیڑی کے کش اور گیتوں کی تانوں میں
سَر دُھن رہا ہے!

نہ غم کی اَنی اُس کا دل چیرتی ہے
نہ فکرِ جہاں روگ ہے اُس کی جاں کا
نہ دھوپ اور چھاؤں سے
بے جان آنکھوں میں کوئی چمک ہے

مگر ہائے اس پیلے مہتاب کی مُردنی چاندنی میں
مرے پاس اک نعش رکھی ہوئی ہے
میں بیٹھا ہوا ہوں
جو مجھ سے عظیم اور برتر جواں تھے
وہ آخر نگاہوں کو ملتے ہوئے جائے پینے چلے ہیں
یہ بے جان مُردہ بدن، جس نہ حرکت
پڑا ہے
یہ یخ بستہ ہاتھوں کی دس انگلیاں کیوں
مری بے حسی کو پکڑنے کی خاطر بڑھی آ رہی ہیں!

سسکتا وجود اور بے جان ہستی کے اُوپر سے
پردہ ہٹا،
نظر آیا آنکھوں کو گرمی کے سُورج میں
تپتے ہوئے پھل کی مانند چہرہ تمہارا
جوانی کے شعلوں سے دہکا ہوا!

پیر سید محمد شاہ
ترجمہ
سید منیر جعفری

پنجابی

دل کے تار

پیر سید محمد شاہ پنجابی زبان کے بلند پایہ اور مقبول عوام صوفی شاعر گزرے ہیں۔ ان کے مطبوعہ کلام کی دو سی حرفیاں رواں صدی کے آغاز میں منشی گلاب سنگھ کے مطبع لاہور سے شائع ہوئی تھیں۔ بیشتر کلام عقیدت مندوں کے سینے میں محفوظ ہے۔ ان کے ابیات آزاد کشمیر اور راولپنڈی ڈویژن کے وسیع علاقوں میں بڑے ذوق و شوق سے گائے جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ پنجابی زبان کے ان چند شعرا میں سے ہیں جو عوامی زندگی کی دھڑکنوں میں شامل ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شاہ صاحب خود بھی اپنے ابیات جذبے و وجد کی ایسی کیفیت میں پڑھتے تھے کہ ہزاروں لوگ ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے!

سید محمد شاہ گذشتہ صدی کے آغاز میں ضلع میرپور (آزاد کشمیر) کے ایک چھوٹے سے گاؤں کھنیارہ میں پیدا ہوئے۔ انتقال اسی صدی کے اواخر میں ہوا۔ ان کے بزرگ وادی کشمیر سے ہجرت کرکے اس علاقے میں جا گزیں ہوئے تھے۔ سید صاحب درویش منش، صوفی بزرگ تھے۔ علاقہ پوٹھوہار میں اُن کے ہزارہا ارادت مند موجود ہیں۔ جوانی میں آپ مردانہ وجاہت، شہ زوری اور شہ سواری کے لئے دور دور مشہور تھے۔ سرکار کی طرف سے اچھی خاصی جاگیر رکھتے تھے۔ طبیعت کا رنگ بدلا تو تارک الدنیا ہو کر جنگلوں میں روپوش ہو گئے۔ مدتوں عبادات و ریاضات کا سلسلہ جاری رہا۔ کھنیارہ شریف میں ان کا مزار آج بھی مرجع خواص و عوام ہے۔

شعر گوئی سے فطری میلان تھا۔ کلام میں تصوف اور معرفت کا رنگ غالب ہے۔ فکر کے شعلے جا بجا فروزاں نظر آتے ہیں۔ طرز نگارش میں فارسی آمیز پوٹھوہاری لہجے کی کھنک نمایاں ہے۔ حال میں ان کے پوتے اور خاندان کے

موجودہ سجادہ نشین سید سپیر بادشاہ نے ان کے غیر مطبوعہ کلام کے بعض
اجزا۔ جس میں سے راقم الحروف نے ایک نغمۂ معرفت چنوا کے، کی روح اور
لے کی آمیزش سے اردو میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ (رضیہ)

بانکے، گھوڑے سوار کشمیر جا کر نورشاہ کے حجرے میں رات کرنا
وہ دربار رہے جاگتی برکتوں کا اس سرکار سے بھی ملاقات کرنا
اس درگاہ پر میری آواز دینا، میری چشم پرنم سے برسات کرنا
جس کی ذات سے ہے میری بات روشن، اسی روشنی سے مری بات کرنا

کہنا! تیرے فقیر کے سامنے ہے تیرے فقر کی شمع نور اب بھی
خلق خادموں سے، عجز عاجزوں سے، وہ دستور ہے میرا دستور اب بھی
مال، ملک، اولاد، جاگیر، دولت، میرے راستے میں ہیں مجبور اب بھی
اُس کریم نے دونوں جہاں بخشے، دنیا پاس اب بھی، دنیا دور اب بھی

آس پاس سنسان خاموشیاں ہیں، تو آواز دے اِن کو آواز دے دوں!
کوٹ کوریں کرودھ کی ظلمتوں کو ذوق و شوق کی صبح گداز دے دوں!
جنگل بول اٹھیں، دریا جاگ اٹھیں، ان کو سوز دے دوں، ان کو ساز دے دوں!
اپنا قلب دیدوں، اپنا درد دیدوں، اپنا عشق دیدوں، اپنا راز دیدوں!

قلندر مومند
ترجمہ
سلیم خواجہ

پشتو

دانیال

تیرگی کے زنداں میں اک شعاعِ نورانی
جو کبھی نہ ظلمت کے اہرمن سے گھبرائی
صبح کے دیئے کی لَو جو سدا رہی روشن
مجمعِ اندھیروں اور آندھیوں سے ٹکرائی

اُس چراغ کی لَو کی گفتگو رکی کس سے؟
جس نے ربِ ظلمت کے گھر میں آگ بھڑکائی
اور گھنے اندھیرے میں اک ذرا سی چنگاری
بہرِ قیصر اور نگ زیب آگ بن کے لہرائی

تیرگی سے تنویریں کیا شکست کھا جائیں
سدِ بولہب سے کیا بحرِ نور رک جائے
کیسے کوئی فرعونی کاٹ دے یدِ بیضا
دانیال زنداں میں کب تلک سزا پائے

رات کی سیاہی نے صبح کو جنم بخشا
ظلمتوں کے پودے نے روشنی اگائی ہے
توڑنے کو سحر شب ہیں تو چاند تارے بھی
پر سحر کے جلوے نے تیرگی مٹائی ہے

دُشینت کمار
ترجمہ
فضل تابش

ہندی

سُورج کا سواگت

آنگن میں پھیلی ہے کائی
دیواریں ہیں چکنی، کالی
جن پر دھوپ نہیں چڑھ پاتی
آہ کروں کیا سُورج جانی
میرا مقدّر رہی ہے ایسا

کھلی ہوئی کھڑکی کو تم تو
دیکھ کے اندر آ پہونچے ہو
پر میں تاریکی کا عادی
میں مایوس، عمل سے عاری
کھو ہی چکا تھا دن کی آشا

لیکن تم آئے، سواگت ہے
بیٹھو..... کائی دیواروں پر
اور کہاں؟ لیکن بچے نے
کھیل میں یہ کائی کھرچی تھی
آؤ یہاں آ کر تم بیٹھو
اور مجھے بھدّے سواگت پر
بھائی سورج کرو معاف
اور دیکھو کہ میرا بچہ
تم کو بٹھانا سیکھ رہا ہے

سروجنی نیڈو
ترجمہ
امیر چند بہار

انگریزی

بے خودی

(۱)

اُٹھو بہار آ گئی
چمن میں مرغزار میں
وہ عندلیبِ خوشنوا خوشی سے گا رہی ہے آج
وہ جوئبار کس طرح مچل کے آ رہی ہے آج
وہ مور بھی تو دیکھئے جو محوِ رقص و رنگ ہیں!

(۲)

دلِ حزیں نظر تو کر — سماں ہے رقص و رنگ کا
ہٹائے جا رہا ہے غم — اثر صدائے چنگ کا

سماں تو دیکھ ہر طرف — بہار ہی بہار ہے
عروسِ کائنات پر — شباب ہے نکھار ہے
طیور نغمہ سنج ہیں — طرب میں جوئبار ہے

اِنہیں سے لیں گے درس ہم سرور و انبساط کا
غم و الم کے واسطے تو ایک عمر ہے ابھی
یہ ذکرِ غم کا چھوڑ دے
کہ آج نوبہار ہے

سلام مچھلی شہری ○ محسن احسان ○ تابش اسلم
احمد رئیس ○ انور محمود خالد ○ بشر نواز ○ رام لعل

محفل

سلام مچھلی شہری، نئی دہلی

تمہارا خط ابھی ابھی ملا۔ تم میرے غم میں اس خلوص، محبت اور تقدس کے ساتھ شریک ہو جیسے کوئی دیوتا۔ میرا خیال ہے کہ غزل میں تم اصل روپ میں آتے ہو۔ تمہارا پُر نور کردار اور بھی نکھر جاتا ہے۔ زندہ رہو، خوش رہو، تندرست رہو۔ فارغ البال رہو۔ اردو ادب کی نمایاں ترین خدمات کرتے جاؤ۔ مستقبل تمہارا ہے۔ یہ دعا میں دل سے دے رہا ہوں، ضرور راس آئے گی۔ تم نے اپنے پچھلے خط میں لکھا تھا۔ "اپنے ہم عصر کو خراجِ محبت پیش نہیں کرو گے؟" میں فیض بھائی کا ایک بہت پرانا خط تمہیں بھیج رہا ہوں — اپنی ایک بہت پرانی نظم کے ساتھ۔ اب یہ فیصلہ تم پر ہے کہ مجھے ان سے اور ان کے فن سے محبت ہے یا نہیں، تم ہی بتاؤ۔

محسن احسان، پشاور

آپ گو ان دنوں "فیض نمبر" میں مصروف ہوں گے۔ اور شاید دم لینے کے لئے بھی مہلت نہ ہو۔ آپ کی کوششیں لائقِ ستائش ہیں۔ آپ تنہا جس عزم اور جس خلوص سے گذشتہ ۲۰ برس سے 'افکار' کی خدمت اور اردو ادب کے ارتقا کے لئے محنت کر رہے ہیں۔ شاید ہی اس کی کوئی اچھی مثال ہمیں مل سکے۔ جس انہماک سے آپ نے جوش نمبر اور حفیظ نمبر نکالے تھے، اور جتنی کاوش ان نمبروں پر صرف کی تھی۔ شاید کچھ اس سے زیادہ ہی "فیض نمبر" پر کرنا پڑے۔ لیکن توقع ہے کہ یہ نمبر بھی اپنی گذشتہ روایات کو برقرار رکھے گا۔

تابش اسلم، سیالکوٹ

یہ جان کر انتہائی مسرت ہوئی کہ آپ "فیض نمبر" شائع کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے بھی آپ نے "زندہ نوازی" کی جو روایت قائم کی ہے اسے آنے والا مورخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ خدا کرے مجاز نمبر، جوش نمبر اور حفیظ نمبر کی طرح یہ نمبر بھی معیاری، عظیم اور جاذبِ نظر ہو۔

احمد رئیس، اجمیر

ان دنوں آپ "فیض نمبر" کی تیاریوں میں منہمک ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خصوصی نمبر بھی "صرف فیض کے شایانِ شان ہوگا

بلکہ افکار کی گوناگوں حیثیت اور قدر و منزلت میں غیر معمولی اضافے کا موجب بھی ہوگا۔ آپ نے عظیم المرتبت ادبی شخصیات کی جیتے جی قدر افزائی فرما کر اردو ادب میں ایک نئی روایت کا آغاز کیا ہے۔ آنے والی نسلیں آپ کو اس کارنامے کے باعث ہمیشہ بنظر استحسان سے دیکھیں گی۔

انور محمود خالد، لاہور

فیض نمبر کے بارے میں پڑھ کرلے حد خوشی ہوئی۔ ماہنامہ "افکار" کی یہ ہمیشہ سے خصوصیت رہی ہے کہ اس نے رہ عام سے ہٹ کر اپنا راستہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کی ایک زندہ مثال "فیض نمبر" بھی ہے۔ خدا آپ کو اپنے ارادے میں کامیاب کرے۔ اور علم و ادب کی زیادہ سے زیادہ خدمت کا موقع دے۔

بشیر نواز، اورنگ آباد

فیض نمبر، اب نکال رہے ہیں۔ جوش نمبر اور حفیظ نمبر نکال کر واقعی آپ نے زندہ پرستی کی ایک نئی مثال قائم کردی ورنہ یہاں تو نمبر دینے کے لئے پہلے مرنا ضروری تھا۔ شاید اسی لئے یگانہ نے کہا تھا ؎

الٰہی تھی مت زمانہ مردہ پرست کی
میں ایک ہوشیار کہ زندہ ہی گڑ گیا

رام لعل، لکھنؤ

آپ کی کتاب — "میرے خوابوں کی سرزمین — مشرقی پاکستان" میں نے اسی روز پڑھی اور ختم کی جس دن ملی تھی۔ کسی کتاب کو تین چار گھنٹے کے اندر پڑھ جانا اس کتاب کی دلچسپی کا ہی ثبوت ہو سکتا ہے۔ شروع سے آخر تک کہیں بھی کوئی ایسا صفحہ نہیں تھا جہاں اکتاہٹ محسوس ہوتی ہو۔ آپ نے کچھ ایسے ہی انداز سے صحافت اور ادب کو ملایا ہے۔ بلکہ صحافت پر ادبیت ہی طاری و ساری ہے۔ اردو کے اچھے سفرناموں میں اس کا شمار ہوگا۔ مجھے اس بات کی پوری امید ہے۔ میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے اس کتاب کے ذریعے مجھے مشرقی بنگال (مشرقی پاکستان) کی سیر کرائی اور سچ مچ ایسا لگا جیسے میں ہر جگہ خود ہی گھوم رہا ہوں۔

قدیم روایات
اور
جدید وضع کی
آئینہ دار
ڈبلیو-پی-آئی-ڈی سی کی
گھریلو مصنوعات
خریدیئے
ڈبلیو-پی-آئی-ڈی-سی کی گھریلو مصنوعات مثلاً خوبصورت ملبوسات
کھلونے-آرائشی پارچہ جات- تحائف یا دوسری زیب و زینت کی
چیزیں آپ کے گھر کی رونق کو دوبالا کرتی ہیں۔ یہ مصنوعات
اندرون اور بیرون ملک میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔
آپ بھی اپنے گھر کی آرائش کے لئے ان مصنوعات کا
انتخاب کیجئے
مغربی پاکستان
صنعتی ترقیاتی کارپوریشن
مرکز:-
پاکستانی
گھریلو مصنوعات
پریڈی اسٹریٹ، دربکھری روڈ، کراچی- دی مال لاہور- دی مال راولپنڈی- حسن پروانہ روڈ، ملتان
دی مال پشاور- تلک چاڑھی حیدرآباد- جناح ایونیو کوئٹہ
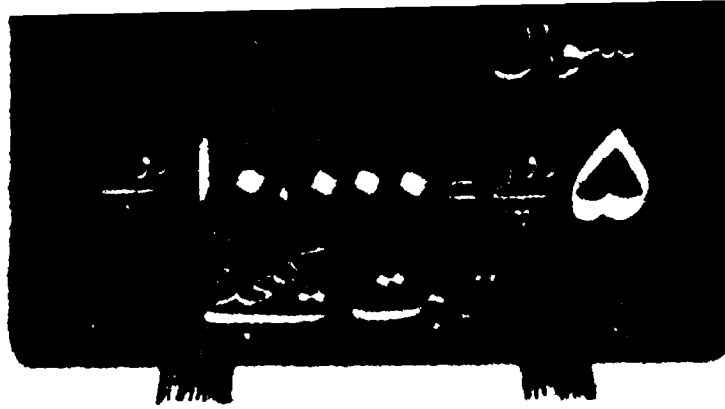
جواب

فرض کیجئے آپ نے ۵ روپے والے انعامی بونڈ خریدے .....

ایک انعامی بونڈ کی قیمت ۵ روپے
ایک انعامی بونڈ پر سب سے بڑا انعام ۱۰ ہزار روپے
ریاضی کی رُو سے ہر انعامی بونڈ پر انعام پانے کا مساوی موقع ہے۔
لہٰذا ہر انعامی بونڈ دس ہزار روپے کی متوقع مالیت رکھتا ہے۔
قرعہ اندازی دسمبر، مارچ، جون اور ستمبر کی ۱۵ تاریخ کو ہوتی ہے۔
ہر بونڈ قرعہ اندازی سے کم از کم ایک مہینہ پہلے خرید لیا جانا چاہئے۔

ہر سہ ماہی پر ہر سلسلہ میں

۵۰ ہزار روپے کے ۲۰۱ انعامات

قوم کے لئے بچایئے • کنبے کے لئے بچایئے
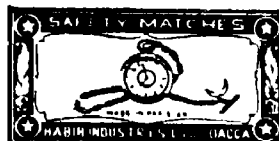
Phone 73992

AFKAR

Regd S No 190

MAKTABA-I-AFKAR

(20th Year of Publication)

18, ACOL ROAD
London N W 6

Unique Literary, Cultural & Family Journal